بے فقیر... سلسلہ

لوحِ فقیر

دل کی گہرائیوں سے نِکلی رُوحانی گفتگو



FREE DVD INSIDE

کچھ صاحبِ کتاب بارے



جناب سرفراز اے شاہ صاحب 12 جون 1944ء کو جالندھر کے ایک نجیب الطرفین سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ہیں اور مختلف سرکاری اداروں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ آپ کچھ عرصہ برمنگھم یونیورسٹی میں Management کے موضوع پر بطور Visiting Faculty لیکچرز بھی دے چکے ہیں۔ مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن میں وسیع تجربہ کے حامل شاہ صاحب اِن دنوں پاکستان کے ایک معروف صنعتی وتجارتی گروپ سے وابستہ ہیں۔ آپ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں 65 سے زائد ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔

آپ دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اِسلامی ورُوحانی تعلیمات میں بھی دیرینہ دلچسپی رکھتے ہیں اس کے علاوہ قدیم اور جدید علوم پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔ پروفیشنل لائف کے ساتھ ساتھ آپ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور اِن کی صحبت سے لاکھوں لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو توکل، اطمینان اور یقین کی دولت سے بے حساب نوازا ہے جسے آپ اپنے دوستوں میں کھلے دل سے بانٹتے رہتے ہیں۔ خوش کلام اتنے کہ دھیمے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں جب گفتگو کرتے ہیں تو گویا وقت کی گردش تھم جاتی ہے۔ اُس ذاتِ اقدس کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کے لہجے میں ایسی محبت، جذبہ اور ایمان ہوتا ہے جو سامعین کے دلوں میں رب تعالیٰ کی محبت، قرب اور دوستی کے حصول کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔



Published by:
Jahangir Books
Buy online: www.jbdpress.com, www.jworldtimes.com


ISBN: 978-969-573-773-6

☆ ...... جب تک انسان نیکی کرتا ہے اور اُسے اپنی اُس نیکی کا ادراک نہیں ہوتا تب تک وہ نیکی رہتی ہے لیکن جیسے ہی انسان کو اُس نیکی کا احساس ہوگیا، وہ تکبر میں چلا گیا۔

☆ ...... رب رب ہے، وہ انسان کو کبھی اُس کے پچھلے گناہ Remind نہیں کروائے گا اور نہ اُن گناہوں کی سزا دے گا جن گناہوں کو وہ معاف کر چکا ہے۔

☆ ...... تصوف کا مقصد کشف و کرامات کا حصول نہیں بلکہ اللہ کے قرب اور دوستی کا حصول ہے۔

☆ ...... جس قدر نفس کی نفی ہوتی ہے اُسی قدر رُوح لطیف ہونے لگتی ہے اور جوں جوں رُوح لطیف ہوتی چلی جاتی ہے توں توں اُس کی پرواز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر ہم رُوحانی طور پر اس عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں۔

☆ ...... انسان بھوکے پیٹ بہت لگن سے عبادت کرتا ہے۔ جب انسان کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہوتی ہیں تو اُس کے دل میں گداز پیدا ہوتا چلا جاتا ہے...... وہ رب تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

☆ ...... فقیر پر لازم ہے کہ وہ دوسرے کی خدمت اس طرح کرے کہ خود خدمت لینے والا یہ سمجھے کہ اُس نے خدمت لے کر فقیر پر احسان کیا ہے۔

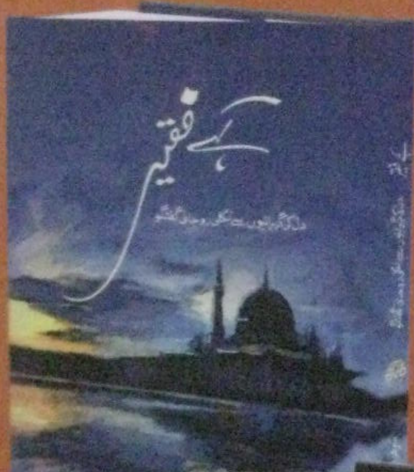
☆ ...... تقدیر مبرم یا معین کل تقدیر کا پانچ سے دس فی صد حصہ ہے۔ نوے سے پچانوے فی صد تو تقدیر معلق ہے جس میں قادرِ مطلق رب نے انسان کو اختیارات عطا کر دیے۔

☆ ...... رب تعالیٰ اپنے بندے کی Unconditional اور Total Submission سے راضی ہو کر بندے پر بے پناہ عنایات فرماتا ہے۔

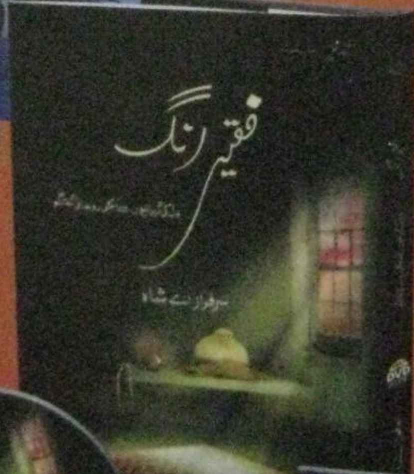
علمِ رُوحانیت سے آگاہی کے لیے

سَرفراز اے شاہ صاحب کی دیگر تصانیف

کہے فقیر ..... سلسلہ













علمِ رُوحانیت سے آگاہی کے لیے
سرفراز اے شاہ صاحب کی دیگر تصانیف

کہے فقیر... سلسلہ

لوحِ فقیر

دل کی گہرائیوں سے نکلی رُوحانی گفتگو

JBD Press

سرفراز اے شاہ

FREE DVD

FREE DVD

FREE DVD

لوحِ فقیر

دل کی گہرائیوں سے نکلی رُوحانی گفتگو



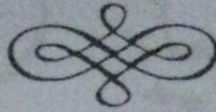
سرفراز اے شاہ

www.jbdpress.com



ناشر: فواز نیاز

قانونی مشیر: چودھری غلام سرور نہنگ، چوہدری ریاض اختر



اشاعت: سوم

قیمت: -/899 روپے DVD کے ساتھ
US $ 18
UK £ 12

For suggestions and complaints please contact
info@jbdpress.com
www.qalander.org

جہانگیر بکس

121-ڈی، گلبرگ II، لاہور۔ فون: 042-35754519

پرنٹرز: زاہد بشیر پرنٹرز، بند روڈ، لاہور

ڈسٹری بیوشن

لاہور: اردو بازار، فون: 042-37220879

لاہور: جہانگیر سنز، جوہر ٹاؤن، فون: 042-35290892-3

لاہور: جہانگیر سنز، گلبرگ، فون: 042-35771000

راولپنڈی: کتاب گھر، اقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، فون: 051-5539609

کراچی: اردو بازار، فون: 021-32765086

حیدرآباد: مکان نمبر 194/8 نزد علی مینشن، لجپت روڈ، فون: 022-2780128

صابر ملک: 212- جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون: 0321-4443533

Life Style

دبئی: ڈسلڈورف بلڈنگ، نمبر 104، البرشا 1 متحدہ عرب امارات
فون: +9714-4475920

انتساب

اُن کے نام

جن کے اصرار

اور

عملی کوششوں سے

کہفِ فقیر سلسلہ کی کتابیں وجود میں آئیں۔

چند حرف

یہ پیش لفظ نہیں، اعتراف ہے اپنی کم مائیگی و بے بضاعتی کا...... اور اُس ذاتِ والا صفات کے کرم، عظمت اور شان کا کہ جو سب سے عظیم ترین ہے، سب کا مالک ہے، سب کا پالن ہار ہے۔

وہ ذات اور اُس کی عظمتیں لامحدود...... میرا علم اور عقل محدود بلکہ ناپید۔ جو دل میں آیا کہہ ڈالا، کچھ اچھے لوگوں نے اِسے کتاب کی شکل دے دی، رب تعالیٰ اُنھیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین

تمام کتابوں کی Editing، غلطیوں کی اِصلاح اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے میں جناب شفقت جاوید صاحب کی محنت اور خدمات کا دل سے معترف ہوں اور شکر گزار بھی۔ اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

کتابوں کے اِس سلسلے کا آغاز ''کہے فقیر'' سے ہوا۔ پھر ''فقیر رنگ''، ''فقیر نگری'' اور اب ''لوحِ فقیر'' آپ کے سامنے ہے۔ لوح فقیر کی ہے اور باتیں اُس کی جس کی سب بادشاہی ہے۔

سرفراز اے شاہ

212 جہانزیب بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فہرست

نشست نمبر 1

تلاشِ حق

نشست نمبر 2

اسرارِ رُوحانیت

نشست نمبر 3

تصورِ توحید

نشست نمبر 4

آپ ﷺ کے ساتھ معاملات میں راز داری اور ادب کی اہمیت

نشست نمبر 5

پُر اسرار بندے

نشست نمبر 6

جذبے کی روشنی

نشست نمبر 7

(i) رب پر بھروسا بڑھانے کا فارمولا

(ii) رب کی دوستی پانے کا اُصول

نشست نمبر 8

دین و دُنیا

نشست نمبر 9

تصوف کا مقصد

نشست نمبر 10

توہمات اور نا تمام خواہشات کے جنات

نشست نمبر 8

دین و دُنیا

نشست نمبر 9

تصوف کا مقصد

نشست نمبر 10

توہمات اور ناتمام خواہشات کے جنات

نشست نمبر 11

اصل شکر

نشست نمبر 12

کامیاب کون؟

نشست نمبر 13

حصول معرفت الٰہی میں قلب کا کردار

نشست نمبر 14

شیطان سے کیسے بچا جائے

نشست نمبر 15

تعلیم سے تربیت اور مرید سے مراد تک

نشست نمبر 16

طرزِ فقیر

نشست نمبر 17

میں ناہیں سب توں

نشست نمبر 18

علم الغیب اور صاحبان علم

نشست نمبر 19

مرشد ضروری کیوں / آداب مرشد

نشست نمبر 20

تقدیر، تدبیر اور جبر

نشست نمبر 21

اسلام اور ہماری ترجیحات

نشست نمبر 22

اسرارِ تصوف

نشست نمبر 23

رُوحانیت اور ہمارے تصورات

نشست نمبر 24

چند علمی نکات

نشست نمبر 25

سید یعقوب علی شاہ حفظہ اللہ تعالیٰ کے معمولات افطار اور طرزِ زندگی

نشست نمبر 27

عقیدہ اور یقین

نشست نمبر 29

علم لدنی کے حصول کا راستہ

نشست نمبر 30

راہِ تصوف کے مصائب

نشست نمبر 29

علم لدنی کے حصول کا راستہ

نشست نمبر 30

راہِ تصوف کے مصائب

نشست نمبر 32

رُوح کی بالیدگی کے لوازمات

نشست نمبر 33

نفلی روزے اور مجاہدہ وقربانی

نشست نمبر 34

علم الغیب اور عالم اسرار

نشست نمبر 35

انٹرویو

(روزنامہ ایکسپریس میں مورخہ 12-5-2010 کو شائع ہوا)

نشست نمبر 37

تصوف کی دُنیا

نشست نمبر 39

عبادت کے باطنی وظاہری اثرات

نشست نمبر 40

نورِ بصیرت

نشست نمبر 1

تلاشِ حق

سوال: بے ایمان معاشرے میں ایمان داری کی روش کیسے اپنائی جائے؟

جواب: آپ دیانت داری سے اپنے پروفیشن میں زندہ رہنا چاہتے ہیں لیکن دیکھتے ہیں کہ یہاں بے ایمانی اور جھوٹ ہی جھوٹ ہے اور یہ کام آپ کے بس کا نہیں لہٰذا آپ کام چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ کل کوئی اور نیک آدمی بھی کام چھوڑ کر بیٹھ جائے گا۔ یوں اُن لوگوں کے لیے جگہ خالی ہوتی چلی جائے گی جو ایمان داری کے برعکس کام کر رہے ہیں۔ اِس کا انجام کیا ہوگا؟

اگر ایک ہزار وکلاء میں سے صرف ایک وکیل دیانت داری سے کام کرتا ہے تو کیا اُسے یہ سوچ کر اپنی روش چھوڑ دینی چاہیے کہ نوسو ننانوے آدمیوں میں ایک ایمان دار آدمی کی آواز کیا کام دکھائے گی؟ پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہے اور آپ کے گھر میں صرف ایک موم بتی ہے جسے آپ یہ سوچ کر باہر گلی میں نہیں رکھتے کہ یہ سارے شہر کی تاریکی تو دُور نہیں کر سکتی۔ یہ درست ہے کہ ایک موم بتی سے شہر بھر کا اندھیرا دُور نہیں ہو سکتا لیکن ذرا سوچیے کہ اس ایک موم بتی سے ایک خاص دائرہ تک تو روشنی ہو جائے گی۔ اگر پچاسی لاکھ آبادی کے شہر میں سے صرف پانچ ہزار لوگ بھی موم بتیاں لے کر باہر نکل آئیں تو شہر کا ایک بڑا حصہ روشن ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی موم بتی جلتے دیکھ کر کوئی دوسرا شخص بھی موم بتی جلا لے۔ لہٰذا یہ سوچ کر اپنی موم بتی کو بجھا نہیں دینا چاہیے کہ میری اکلوتی موم بتی بھلا اندھیری دُنیا میں کیا اُجالا کرے گی۔

سچائی اور دیانت داری کی آواز ہمیشہ بلند ہوتی رہنی چاہیے خواہ ایک آدمی ہی ایسا کرے۔ سچائی کے راستے میں تکلیفیں اور دُکھ تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کے خوف سے سچائی اور دیانت داری کا راستہ چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔

سوال: سنا ہے کہ آپ کے ایک قریبی دوست نے آپ سے دُنیاوی مال و آسائش کی دُعا کے لیے درخواست کی تو آپ نے دُعا کرنے سے انکار کر دیا۔

جواب: دُنیا کی خواہش اور مال و زر کی حقیقت کا اندازہ اس حدیث مبارکہ کے مفہوم سے لگا لیجیے کہ جس کے مطابق دُنیا کو ایک مردہ، گلی سڑی بکری سے بھی زیادہ حقیر قرار دیا گیا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بھیڑ کے مرے بچے پر گزرے تو فرمایا ''تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ یہ اِسے ایک درہم کے عوض ملے؟'' صحابہ نے عرض کیا ''ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں کسی بھی چیز کے عوض ملے۔'' تو فرمایا ''اللہ کی قسم! دُنیا اللہ کو اِس سے زیادہ ذلیل ہے، جیسی یہ تمھارے نزدیک۔'' (صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقاق، حدیث: 7607، صفحہ 210 جلد 8)

اگر ایک شخص سے میرا خصوصی تعلق ہے تو میں اُس کے لیے یہ کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ دُنیا جیسی حقیر چیز کی دُعا کروں۔ یہاں ایک بات ضرور آپ کو بتانا چاہوں گا کہ جب سے میں نے اُنھیں دُعا سے انکار کیا ہے تب سے اُن کی زندگی زیادہ آسان اور پُر آسائش ہو گئی ہے۔

سوال: بعض اوقات دُنیاوی ترغیبات کی وجہ سے دل مچلتا ہے اور بعض اوقات انسان کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے غلط فیصلے کرتا ہے۔

جواب: جسٹس اعجاز جب ڈپٹی اٹارنی جنرل تھے تو ایک روز میرے گھر آئے۔ جیسے ہی Enter ہوئے میں نے چھوٹتے ہی کہا ''آپ انکار کر دیجیے۔'' وہ قدرے پریشان ہو گئے کہ کہیں شاہ صاحب دھوکے میں کسی اور چیز کا تو نہیں کہہ رہے لہٰذا وضاحتاً کہنے لگے ایک آفر کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ''جناب! وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ اس آفر سے انکار کر دیجیے۔'' جسٹس اعجاز صاحب بھی اللہ کے ایسے بندے تھے کہ پھر پلٹ کر وجہ نہ پوچھی اور ہائی کورٹ کا جج بننے کی آفر مسترد کر دی۔ تین چار مہینے بعد جب وہ دوبارہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے کہا ''اب آپ کو جج بننے کی آفر آئے گی، وہ قبول کر لیجیے گا۔'' تب کچھ ہی عرصے بعد اُنھیں گھر سے بلایا گیا اور باقاعدہ Convince کر کے جج بنا دیا گیا۔

یوں میں تو لوگوں کو اس عذاب میں پڑنے سے منع کرتا ہوں کہ جج بننے کا اِتنا بڑا بوجھ کندھوں پر ہو گا کہ آپ ایک ایک چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ کیا آپ کو یہ زندگی اچھی نہیں لگتی کہ آپ کو بہت سی باتوں اور اعمال کے لیے جواب دہ نہ ہونا پڑے؟

البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ اپنی جگہ مت چھوڑیے تاکہ بُرائی کو راستہ نہ ملے۔ جہاں تک دل کی بات ہے تو یہ کسی نہ کسی انداز میں ضد کرتا ہی رہتا ہے اور دھمکاتا بھی رہتا ہے کہ میں بند ہو جاؤں گا، دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔ آپ اُس سے کہیے کہ دھمکی کیوں دیتے ہو، جب چاہے چھوڑ جاؤ۔ کیوں کہ تم ہمارے حکم کے تو پابند نہیں۔ تم تو کسی اور کے حکم کے پابند ہو۔ جب اُس کا اشارہ ہو گا تو دھڑکن بند ہو جائے گی۔ اس لیے جس بات پر اختیار نہیں اُس سے ڈر کس بات کا؟ یہ ڈر اور خوف نکال دینا ہی بہتر ہے۔ ایک سول سرونٹ تھے رفعت شیخ، اپنے کیریئر کے آغاز میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر بھی رہے، بعد ازاں چیف سیکرٹری بلوچستان بھی رہے اور دیگر بہت سی Assignments پر بھی اُنھوں نے کام کیا۔ اُنھیں ایک زمانہ میں ہارٹ پرابلم ہو گئی۔ اُن دنوں میرا آفس فرسٹ فلور پر تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر پھولی سانس کے ساتھ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے اُن سے کہا ''ڈاکٹر نے آپ کو سیڑھیاں چڑھنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے

اس کے باوجود آپ زحمت کرتے ہیں۔ آپ مجھے فون کر دیا کیجیے، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں گا۔'' یوں دو ماہ تک وہ میرے پاس نہیں آئے لیکن پھر ایک روز کیا دیکھتا ہوں'' وہ سیڑھیاں چڑھتے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر نے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کیا ہوا ہے لیکن آپ پھر آ گئے۔'' تب اُنھوں نے بہت خوبصورت بات کہی، بولے'' آج بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں خیال آیا کہ رب تعالیٰ نے تین چیزیں معین کر رکھی ہیں: میری موت کا وقت، موت کا طریقہ اور مقام۔ جب یہ سب کچھ معین ہے اور میرا اِس پر کچھ کنٹرول ہی نہیں ہے تو پھر مجھے خوف زدہ ہو کر گھر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اِس لیے میں نے خود سے کہا کہ چلو شاہ صاحب کے پاس چل کر کافی پیتے ہیں۔''

اِس کے بعد وہ کافی عرصہ میرے پاس آتے رہے۔ بعدازاں جنرل ضیاء کے مارشل لاء دور میں اُن کا کیس Reconsider ہوا اور اُنھیں Reinstate کر کے سپیشل اسائمنٹ پر بطور Ambassador on Special Duty متحدہ عرب امارات بھجوا دیا گیا۔ تین سال UAE رہے پھر پاکستان آ گئے اور یہاں دس بارہ سال زندہ رہنے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ یوں اُنھوں نے بہت اچھی بات سمجھائی کہ جب موت کا وقت، طریقہ اور مقام متعین ہے تو پھر خوف کس بات کا؟

اِس لیے چھوڑیے سب باتیں اور دل کے نخرے مت پالیے۔ اس کی ضدوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دیجیے۔

سوال: تقویٰ کیا ہے؟

جواب: اللہ کے حکم کردہ کاموں کو بجا لانا اور اُس کے منع کردہ کاموں سے بچے رہنا تقویٰ ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت کعب احبارؓ سے پوچھا'' تقویٰ کیا ہے؟'' اُنھوں نے جواب دیا'' کیا تم خاردار راستے سے گزرے ہو؟'' اُنھوں نے جواب دیا'' ہاں۔'' کعبؓ نے پوچھا۔'' کس طرح گزرے؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا'' کپڑوں کے پھٹنے کے خوف سے دامن بچا کر گزرا۔'' کعب احبارؓ نے'' فرمایا پرہیزگاری کا بھی یہی حال ہے۔''

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ جانے۔ حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ آدمی جس کو بھی دیکھے یہی کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے...... یہی تقویٰ ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے جو لوگوں کی ذات کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور کامل متقی وہ ہے کہ جو جس چیز کو اپنے لیے عزیز رکھتا ہے، دوسروں کے لیے اُسے اور زیادہ عزیز جانے۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپ نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ جب وہ شخص وہاں سے رخصت ہو گیا تو ایک شاگرد نے پوچھا'' حضرت! آپ تو لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں لیکن آج آپ کے ماتھے پر بل تھے، اس کی کیا وجہ ہے؟'' حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملتا ہے اور سلام کہتا ہے تو

رب تعالیٰ اُن دونوں میں سو(100) رحمتیں تقسیم کرتا ہے جن میں سے نوے رحمتیں اُس شخص کو ملتی ہیں جو خوش دلی سے سلام کرتا ہے جبکہ دس رحمتیں اُس شخص کو ملتی ہیں جو ماتھے پر تیوریاں ڈال کر سلام کرتا یا جواب دیتا ہے۔ میں نے چاہا کہ نوے رحمتیں اُس شخص کو ملیں اُس لیے ناخوش ہو کر اس کے سلام کا جواب دیا۔"

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے کے مطابق دوسرے شخص کی بھلائی اور نیکی کے لیے کام کرنا، دوسرے کی بہتری کے لیے سلام کرنا اور اُس کی آخرت سنوارنے کے لیے کام کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ انسان اُن کاموں کی انجام دہی میں پیش پیش رہے جن کا اُسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اُن کاموں سے رُک جائے جن سے اللہ تعالیٰ نے اُسے منع فرمایا ہے۔

کچھ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ تقویٰ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کا نام ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا کہ تمھیں زیادتی کا بدلہ لینے کا حق ہے لیکن صرف اُسی قدر جس قدر تمھارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ نے یہ بھی فرما دیا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کو پسند فرمایا ہے۔

کوئی آپ سے قرض لے گیا اور واپس نہ کیا تو آپ اُسے Remind کرا سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو تمھارا مقروض ہے اُسے سہولت دو۔ لیکن اگر رب تعالیٰ کی سنت پر عمل کریں گے تو پھر یہ قرض معاف کر دینا ہی بہتر ہے اور معاف کر دینے کا طریقہ بھی یہ نہ ہو کہ بھئی تمھارے خراب حالات سے متاثر ہو کر میں تمھیں قرض معاف کر رہا ہوں۔ یہ رویہ انسان کے چھوٹے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ اِس کے بجائے یوں کہا جائے کہ بھائی مجھے اللہ تعالیٰ نے مالی کشائش عطا فرمائی ہے، تم اپنی دیگر ضروریات پوری کر لو۔ اِس کے بعد اگر رقم بچ رہے تو قرض واپس کر دینا۔ ورنہ سمجھ لو کہ یہ دو بھائیوں کے درمیان معاملہ تھا۔ تمھارے ذمہ میرا کوئی قرض نہیں۔ یوں یہ رب تعالیٰ کی سنت پر عمل ہو جائے گا۔ رب تعالیٰ کے سارے کام تو احسان کے ہیں اور یہی ایک قدم آگے جانے والی بات ہے جہاں بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دیا جاتا ہے اور احسان کا سلوک کیا جاتا ہے۔

سوال: اصل شکر گزاری کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک اصل شکر گزاری، عملی شکر گزاری ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل عاجز اور بے بس بندہ جانے، دل سے دوسروں کو خود سے بہتر اور اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

اللہ تعالیٰ جب ہمیں رزق عطا فرماتا ہے تو ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ تیرا شکر ہے لیکن ذرا سی مشکل آ جانے پر پیر صاحب کے پاس دُعا کرانے بھاگے جاتے ہیں۔ یہ تو سچی شکر گزاری کا انداز نہیں۔ یہ تو ایک طرح سے رب تعالیٰ کا شکوہ ہے۔

اگر اس کے برعکس ہمارا رویہ یہ ہو کہ میرے پاس جو ذہنی، مالی اور جسمانی صلاحیتیں ہیں، یہ میری نہیں بلکہ میرے رب تعالیٰ کی امانت ہیں اور میں اس میں سے محض اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کر سکتا ہوں، باقی

پر اللہ کے دوسرے بندوں کا حق ہے، جو چاہے آکر لے جائے۔ چونکہ وہ بندہ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے اپنا حق لے کر جا رہا ہے اس لیے میرا اُس پر کوئی احسان نہیں۔ اگر کسی نے اِس پر سچے دل سے عمل کر لیا تو یہ اصل شکر گزاری ہے کیوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے کی گئی محنت کی کمائی میں سے کسی کو کچھ دے ہی نہیں سکتے جب تک آپ کو دلی طور پر یہ یقین نہ آجائے کہ میرے پاس جو کچھ ہے میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ اس میں میرا حصہ صرف اُتنا ہے جتنی میری جائز ضروریات ہیں باقی سب پر رب تعالیٰ کے دوسرے بندوں کا حق ہے۔

اِسی طرح میری ذہنی صلاحیتیں رب تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں...... اور میرے پاس اُس کی امانت ہیں۔ میں انھیں اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کی جائز ضروریات کی تکمیل کے لیے استعمال کروں۔ اس کے بعد اللہ کے بندوں کا مجھ پر حق ہے کہ میں اپنی ذہنی صلاحیتوں سے اُنھیں فائدہ پہنچاؤں، کیوں کہ ان کا حق اور حصہ ہے۔

درحقیقت جو شخص مجھ سے اپنا حصہ لے کر جا رہا ہے ایک طرح سے وہ مجھے میرے فرائض کے بوجھ سے آزاد کر کے میری مدد کر رہا ہے۔

اِسی طرح میری جسمانی قوت میرے اپنے اور خاندان کے کاموں کی انجام دہی میں استعمال ہونی چاہیے۔ اِس کے بعد یہ جسمانی قوت خلقِ خدا کے کاموں کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ یہ اصل شکر گزاری ہے لیکن اِس میں ایک احتیاط لازم ہے اور وہ احتیاط یہ ہے کہ ہم نیکی اور تکبر کے فرق کو جان لیں۔

جب تک انسان نیکی کرتا ہے اور اُسے اپنی اُس نیکی کا ادراک نہیں ہوتا تب تک وہ نیکی رہتی ہے لیکن جیسے ہی انسان کو اُس نیکی کا احساس ہو گیا، وہ تکبر میں چلا گیا۔

اگر ہر وقت یہ احساس رہے کہ میں لوگوں کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن اپنی نالائقی کی وجہ سے نہیں کر سکا، تو یہ عمل اُسے اچھے کاموں میں تکبر سے بچا کر مزید نیکی پر اُکسائے گا۔ عبادت کے معاملے میں تکبر سے بچنے کے لیے وہ سوچے کہ میرا رب لائق عبادت ہے۔ اُس کے میری ذات پر جو اَن گنت احسانات ہیں وہ اعلیٰ درجے کی بندگی کا تقاضا کرتے ہیں جو میں نہیں کر سکا۔ یوں انسان تکبر سے بچ جائے گا۔ لیکن جہاں یہ احساس دل میں پیدا ہوا کہ میں تو پانچ وقت کی نماز بہت باقاعدگی اور پابندی سے ادا کرتا ہوں۔ آج تک کوئی نماز قضا نہیں کی، جہاں تک ممکن ہو میں رب تعالیٰ کو پکارتا رہتا ہوں اور اُس کی تسبیح پڑھتا رہتا ہوں...... یہ احساس انسان کو تکبر میں ڈبو دے گا اور ساری عبادت گنوانے کا سبب بن جائے گا لہٰذا اس احساس کو دُور ہی رہنا چاہیے۔ اس کی جگہ یہ احساسِ ندامت دل میں پلنا چاہیے کہ میں کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ مجھ پر فرض تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لیے کوئی اچھا عمل کر جاتا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ یہ خیال اور احساس انسان کو تکبر سے محفوظ رکھے گا۔

اگر میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں نے نیکی کی اور کہا کہ اللہ تیرا شکر کہ تو نے مجھے نیکی کی توفیق دی تو گویا میں نے تکبر کے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا۔

اس کے برعکس جونہی میرے ذہن میں اپنی کی ہوئی کسی نیکی کا خیال آیا تو میں نے فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھی

اور کہا کہ میں کہاں اِس قابل ہوں کہ کسی کے ساتھ نیکی کرسکوں۔ یہ احساس مہمیز کا کام کرے گا اور مجھے نیکی پر اُکسائے گا تا کہ اِس کے ذریعے میں رب کو راضی کرلوں۔ یوں انسان نیکی کی طرف دوڑتا اور تکبر سے بچا رہتا ہے۔

سوال: قرآن پاک کی سورۂ یٰسٓ میں بیان کردہ ''مومن'' سے کیا مراد ہے؟ کیا سزا و جزا کا تعلق ایمان کے Level یا Degree سے بھی ہے؟

جواب: قرآن پاک میں استعاروں سے کام لیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ خالق ہے اور خالق سے بڑھ کر مخلوق کو کوئی نہیں جانتا۔ جس طرح ایک مصور سے زیادہ اُس کی پینٹنگ (Painting) کی خوبیوں اور خامیوں سے کوئی واقف نہیں ہوتا، اِسی طرح خالقِ کل رب تعالیٰ سے زیادہ ہماری کمزوریوں، نفسیات، جبلت اور فطرت کو کوئی نہیں جانتا۔ اِس لیے اُس نے قرآن پاک کے نزول کے وقت ہدایت کی وہ ترکیب استعمال کی جو انسان کو سب سے زیادہ بھا سکتی تھی اور اِس پر سب سے زیادہ اثر کرسکتی تھی۔

قرآن پاک میں تین Distinct (نمایاں) پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جس میں رب تعالیٰ اپنے آپ کو یوں Describe (بیان) کر رہا ہے کہ میں تمھارا خالق اور رازق ہوں، میں رحمٰن و کریم ہوں۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس میں وہ انسان کو زندگی بسر کرنے کی تعلیم دے رہا ہے۔ اور تیسرا پہلو وہ ہے جس میں اُس نے انسان کو نیکی کی ترغیب بھی دی ہے اور عذاب سے ڈرایا دھمکایا بھی ہے۔ نیکی کی ترغیب کے وقت اور عذاب سے ڈراتے ہوئے اُس نے گزشتہ قوموں اور اُمتوں کی مثالوں سے کام لیا اور پھر اچھے کاموں کے اجر کے طور پر مختلف انعامات کا ذکر بھی کیا۔

ہم چونکہ عجمی ہیں اِس لیے عربی کے باریک استعاروں کو Differentiate نہیں کر پاتے۔ قرآن پاک کی سورۂ یٰسٓ میں لفظ ''مومن'' صاحبِ ایمان کے لیے استعمال ہو۔ ہم عموماً مومن سے مراد مسلمان ہونا لیتے ہیں حالانکہ اِن دونوں کی Degrees میں فرق ہے۔ جس نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا، وہ مسلمان ہو گیا۔ جو اسلام کے بنیادی ارکان پر بھی ایمان لایا...... وہ بھی مسلمان ہے۔ لیکن جب ایک شخص نہ صرف اِن سب پر ایمان لایا بلکہ اِن کی تصدیق بالقلب اِسی انداز میں کی کہ اُس کے دل میں اِن کے بارے میں رتی برابر بھی شبہ نہ رہا، وہ اسلام کے پانچوں ارکان پر عمل کرتا رہا اور بوقتِ ضرورت جہاد بالسیف بھی کیا تو وہ ''مومن'' کہلایا۔

اگر ہم قرآن پاک کا بغور مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کئی مقامات پر کئی لوگوں کے درمیان Differentiate کیا ہے۔ اُس دور میں ایسے لوگ بھی تھے جو علی الاعلان کہتے تھے کہ اللہ ایک ہے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اُسی دور میں ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمانوں میں ہوتے تو خود کو مسلمان قرار دیتے اور کافروں میں ہوتے تو خود کو کافر کہتے۔ قرآن پاک نے اُنھیں منافقین کے نام سے یاد کیا ہے۔ اُسی دور میں حضرت بلال حبشیؓ جیسے لوگ بھی تھے جو بدترین اذیتوں کے باوجود علی الاعلان اپنے ایمان کا اقرار کرتے تھے۔ یوں ایمان کے مختلف Levels ہر دور میں رہے اور اُنہی Levels کے مطابق سزا و جزا بھی مختلف ہے۔

سوال: کیا حالات کے تقاضوں کے تحت اسلامی احکامات اور اُصول و قواعد میں Relaxation ممکن ہے؟

جواب: اسلام قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ایک کامل دین ہے۔ اس کے بنیادی اُصول و قواعد کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ شریعت کی بنیاد کتاب اللہ، حدیث، سنت، اجماع اور قیاس پر قائم ہے۔ اگر ہمیں کسی معاملے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کتاب اللہ اِس معاملہ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ اگر اِس میں واضح احکامات موجود ہیں تو ہم اِس پر عمل کریں گے۔ اگر قرآن پاک میں معاملے سے متعلق احکامات نہ ملیں تو ہم احادیث میں دیکھیں گے۔ اگر حدیث میں بھی متعلقہ معلومات نہیں ملتیں تو ہم آپ ﷺ کی سنت کو دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا عمل کیا تھا۔ اگر آپ ﷺ کی سنت میں بھی ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی تو صحابہ کرامؓ کی حیاتِ مبارکہ کا جائزہ لیا جائے گا اور مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اگر وہاں بھی رہنمائی میسر نہ ہو اور کوئی متعلقہ مثال نہ ملے تو پھر ہم اجماع کی طرف آئیں گے۔ ملک کے جید اور مستند علمائے کرام کتاب و سنت سے Anology لے کر فیصلہ کریں گے کہ یہ کام اگر فلاں طریقے سے کیا جائے تو جائز ہے۔

مثال کے طور پر مسئلہ یہ ہے کہ ہوائی جہاز سے دشمن پر حملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ جواب میں اگر کوئی شخص شرارت کے طور پر یہ دلیل لے آئے کہ چونکہ دشمن کی بے خبری میں اُس کی پشت میں چھرا گھونپنا ناپسندیدہ ہے اِس لیے دشمن کو للکارے بغیر ہوائی جہاز سے حملہ کرنا بھی گویا پشت میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔ اب F16 کا ذکر بھی قرآن، حدیث اور سنت میں نہیں ملے گا لہٰذا ایسی صورت میں اجماع کیا جائے گا۔ غیر متنازع علما غور و فکر کریں گے اور پہلے سے موجود Anologies کو اس مسئلہ پر Apply کر کے دیکھیں گے کہ F16 سے دشمن پر حملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ لہٰذا یہ کہنا کہ موجودہ دور میں اسلام کے احکامات میں Relaxation کر دی جائے کیوں کہ اِن پر عمل کرنا ممکن نہیں، درست نہیں، کیوں کہ اسلام دین کامل ہے اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ایک کامل پیغام ہے۔

سوال: کیا اسلامی قوانین ایک نرم خو اور ایک تندخو انسان کے لیے یکساں ہیں؟

جواب: فرض کریں، آپ کے پاس Ferrari کی ایک سو دس ہارس پاور کی سپورٹس کار ہے اُس کی Rate of Acceleration 32 سیکنڈ ہے زیرو ٹو سکسٹی (0-60) میل فی گھنٹا اور اُس کی ٹاپ سپیڈ (top speed) دو سو میل فی گھنٹا ہے۔ میرے پاس 1948 ماڈل کی Morris ہے جس کی Rate of acceleration زیرو ٹو سکسٹی (0-60) میل فی گھنٹا کے لیے کئی منٹ ہے اور اس کی ٹاپ سپیڈ (Top speed) 70 میل فی گھنٹا ہے۔ اب ان دونوں کے لیے ٹریفک قوانین کا اطلاق یکساں طور پر ہوگا یا مختلف ہوگا؟

یہ بتایئے کہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں Fault جاننے کے لیے قوانین دونوں گاڑیوں پر یکساں Apply ہوں گے یا دونوں گاڑیوں کے لیے مختلف قوانین بنائے جائیں گے؟

کار Antique ہے یا Latest version کی، جب ایکسیڈنٹ ہوگا تو پولیس والا یہی دیکھے گا کہ

گاڑی پیچھے سے Hit کی گئی ہے یا سامنے سے۔ اگر Ferrari نے پیچھے سے ہٹ (Hit) کیا ہے تو جرم Ferrari کا ہے۔ اگر 1948 ماڈل کی Morris نے Hit کیا ہے تو قصور موریس کا ہے۔ اگر دائیں طرف سے آنے والی گاڑی کا راستہ ہم نے کاٹا ہے اور ایکسیڈنٹ ہو گیا تو جرم ہمارا ہے خواہ ہم Ferrari میں تھے یا موریس میں۔ قانون یہ کہتا ہے کہ گاڑی کی سپیڈ سے Distance کو زیادہ کر کے Plus دو سیکنڈ وقت Allow کیا جائے گا۔

آپ گھڑ دوڑ میں دیکھ لیں کہ گھوڑا اڑیل ہو یا سدھایا ہوا، ریس کے دوران دونوں پر یکساں قوانین لاگو ہوں گے۔ اسی طرح اگر ایک شخص تند خو ہے اور دوسرا نرم خو ہے تو اسلامی قوانین دونوں پر یکساں طور پر ہی Apply ہوں گے۔

تند خو کو اللہ کے قریب ہونے کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑے گی اللہ تعالیٰ نے تند خوئی اور سرکشی سے منع کیا ہے۔ اس لیے اُسے اپنے آپ کو نرم خوئی کی طرف لانا ہوگا۔ آپ ﷺ بے حد نرم خو، نرم رو اور نرم گفتار تھے۔ جب تند خو انسان آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے اندر تبدیلی لے آئے گا تو اُس کے لیے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔

سوال: ایک نیک اور ایک تائب انسان میں سے کس کا درجہ زیادہ بلند ہے؟

جواب: فرض کریں کہ آپ ایک یونٹ کو کمانڈ کر رہے ہیں۔ اُس یونٹ میس میں ایک حوالدار ہے جو گزشتہ تیس سال سے میس کے کھاتے میں پلس مائنس (Plus minus) کرتا چلا آرہا ہے، آپ کے یا میرے اکاؤنٹ میں کھانا کھا لیتا ہے، اُس کا بیٹا آتا ہے تو وہ اُسے کھانا کھلا کر میرے بیٹے کے کھاتے میں لکھ دیتا ہے۔ ایک روز وہ میس حوالدار میرے آفس آکر کہتا ہے کہ صاحب میں گزشتہ کافی عرصے سے بے ایمانی کر رہا تھا لیکن اب میرا ضمیر مجھے بہت لعن طعن کر رہا ہے۔ آپ مجھے میری گزشتہ بے ایمانی پر معاف کر دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ بے ایمانی نہیں کروں گا۔ آپ اُس کی سچے دل سے مانگی گئی معافی قبول کر کے اُسے معاف کر دیتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ آپ ہی کی یونٹ میں ایک اور میس حوالدار بھی ہے جو انتہائی نیک اور ایمان دار ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ معافی مانگ لینے کے بعد کیا پہلا میس حوالدار اور یہ نیک حوالدار ایک سے نہیں ہو گئے؟

اسی طرح جب ایک شخص نے کلمہ پڑھ لیا اور سچے دل سے گزشتہ گناہوں سے تائب ہو گیا تو اللہ کے قانون کے مطابق وہ نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہو گیا۔ اگر اسلام قبول کر لینے کے فوراً بعد اُس کی وفات ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور یوں پیش ہوگا کہ گناہوں سے بالکل پاک ہوگا۔ یوں اُس کا درجہ ایک گناہ گار مسلمان کی نسبت بلند ہے۔ لیکن اگر اُسی شخص نے قتل سے بچنے کے لیے مصلحتاً جھوٹ بول کر اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کیا ہوتا اور اُس کے فوراً بعد وہ مر جاتا تو اُسے اُس کے گناہوں کی معافی نہ ملتی کیونکہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے اگر سچے دل سے توبہ کر لی جائے تو پھر انسان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ آپ میس

حوالدار کو ایک بار معاف کر دینے کے بعد پھر کبھی اُسے اُس کی سابقہ غلطی اور کوتاہی یاد نہیں دلائیں گے۔ رب تو پھر رب ہے، وہ انسان کو کبھی اُس کے پچھلے گناہ Remind نہیں کروائے گا اور نہ اُن گناہوں کی سزا اُسے دے گا جن گناہوں کو وہ معاف کر چکا ہے۔

جس طرح تند خو گھوڑے اور سدھائے ہوئے گھوڑے کے لیے گھڑ دوڑ کے قوانین یکساں ہوتے ہیں البتہ Trainer کی ذمہ داری ہے کہ وہ تند خو گھوڑے کو اس طرح Train کرے کہ وہ ریس کے قوانین کے مطابق دوڑے۔ اگر وہ اُن کی خلاف ورزی کرے گا تو Race سے آؤٹ کر دیا جائے گا۔ اگر یہ تند خو گھوڑا زیادہ پاگل ہو گیا تو اُسے گولی مار دی جائے گی۔

اِسی طرح ٹریفک Laws میں جب لائسنس لے کر گاڑی میں سڑک پر نکلتے ہیں تو اب آپ کے پاس خواہ کوئی سی بھی گاڑی ہو، آپ پر ٹریفک قوانین کا یکساں طور پر اطلاق ہوگا۔ اگر آپ Illtrained ہوں اور کوئی ایکسیڈنٹ کر بیٹھیں تو عدالت میں جا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جناب میں Illtrained ہوں اِس لیے مجھ سے یہ حادثہ ہو گیا۔ ایسا کہنے کی صورت میں سزا دوگنا ہو جائے گی کہ آپ نے ناتجربہ کار ڈرائیور ہوتے ہوئے سڑک پر آ کر دوسروں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا۔ پہلے آپ کو اپنے آپ کو پختہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ کے ساتھ ساتھ اُس شخص کی بھی شامت آ جائے گی جس نے آپ کو Properly test کیے بغیر لائسنس جاری کیا ہے یوں Illtrained ڈرائیور ہونے کی وجہ سے اگر آپ ایکسیڈنٹ کر بیٹھتے ہیں تو سزا کم نہیں ہوگی بلکہ بڑھ جائے گی۔

اسلام کے قوانین میں کوئی لچک نہیں۔ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی خامیوں کو دُور کرنے کی Effort کرے۔ فرض کریں کہ ایک سرجن کی کوئی خامی ایسی ہے کہ اگر وہ آپریشن کرے تو اس خامی کی وجہ سے Hazards (خطرات) بڑھ جاتے ہیں۔ آپ اُس کی خامی کی وجہ سے اُسے آپریشن کی اجازت نہیں دیتے کہ آپریشن کے دوران تمھارا ہاتھ بہکنے کی وجہ سے Mortality rate بڑھ جاتا ہے۔ وہ شخص اپنی اس خامی کا نہ صرف ادراک کرتا ہے بلکہ اِس پر قابو پانے کی بھی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ ایک روز وہ اپنی خامی پر قابو پا لیتا ہے اور بہترین سرجن کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ تب آپ اُس کی ہر جگہ تعریف کرتے ہیں کہ کس طرح اُس شخص نے اپنی خامی کو سخت محنت کے بعد دُور کر لیا۔ آپ اُس کی تحسین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

I take my hat off for this man. Now, he makes an excellent surgery.

اب سرجری کے قوانین میں تو اُس شخص کی خامی کی وجہ سے کوئی Relaxation پیدا نہیں ہوئی بلکہ اُسے خود کو بہترین سرجن کے مطلوبہ معیار تک لانے کے لیے خود کو تبدیل کرنا پڑا ہے اور جب وہ محنت کر کے اپنے آپ کو بہترین سرجن کے مقام پر لے آیا تو ہر جگہ اُس کی تعریف ہونے لگی۔

اس لیے اللہ کے نزدیک اُس شخص کا درجہ کہ جو ساری عمر گناہ کرنے کے بعد سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے، اُس شخص سے زیادہ ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیک انسان نے تو کبھی گناہ کا ذائقہ

چکھا ہی نہیں کیونکہ اُس کو Distract کرنے والی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ اِس کے مقابلے میں یہ شخص ایک لمبے عرصے تک گناہ کی لذت کا عادی رہا۔ پھر اُس نے خود پر جبر کیا، اپنے نفس کو مارا...... اور گناہ کی لذت کو ترک کر کے نیکی کی تلخی کو اپنایا۔ اِس لیے اُس کا درجہ زیادہ بلند ہے۔

سوال: کیا صحیح راستہ کی تلاش انسان کی اپنی ذمہ داری ہے یا یہ اُس کے والدین کا فرض ہے؟ کوتاہی کی صورت میں ذمہ دار کون ہے؟

جواب: ایک نابالغ انسان کی تربیت والدین کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اُسے سیدھا راستہ نہیں دکھاتے تو وہ اس کے لیے جواب دہ ہیں۔ لیکن بالغ ہونے کے بعد حق اور سچ کی تلاش انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی کوتاہیوں کا ذمہ دار خود ہوگا۔

رب تعالیٰ نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ کوئی قوم ایسی نہیں کہ جس کی طرف رب تعالیٰ کا پیغام نہ آیا ہو۔ آپ ﷺ نبی آخرالزماں ہیں اور آپ ﷺ کا لایا ہوا پیغام ایک مکمل اور دائمی پیغام ہے۔ آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد علما کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِس پیغام کو آگے پھیلائیں۔

- عاقل و بالغ ہونے سے پہلے تک اگر کسی انسان کو راہِ حق سے متعلق معلومات فراہم نہیں کی گئیں تو اس کے لیے اس کے والدین جواب دہ ہیں۔
- عاقل و بالغ ہونے کے بعد خود انسان پر فرض ہے کہ وہ حق کی تلاش کرے اور علم سیکھے۔ اِس میں کوتاہی کی صورت میں وہ رب تعالیٰ کے حضور خود جواب دہ ہوگا۔
- علما سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم لوگوں نے اپنی ہمت کے مطابق یہ پیغام پھیلایا یا نہیں؟ کیونکہ یہ ذمہ داری تمھارے سپرد کی گئی تھی۔

لہٰذا ہمیں آگے بڑھ کر خود حق کی تلاش کرنا ہے۔ دین کی باتیں کتابوں اور علما سے سیکھیں۔ جن باتوں کی سمجھ نہ آئے، وہ اہلِ علم سے پوچھیں۔ اگر وہ بتانے سے انکار کریں گے تو جرم دار ہوں گے۔

سوال: اگر انسان کوشش کے باوجود نیکی نہ کر سکے تو کیا پھر بھی اُسے اُس کا اجر ملتا ہے؟

جواب: رب تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ کسی شخص نے نیکی کتنی کی بلکہ وہ یہ دیکھے گا کہ اُس کی نیت کیا تھی اور نیت تھی تو اُس نے اُس کے لیے Effort کتنی کی۔ اللہ تعالیٰ اُسے اُس کی صدق دل سے کی جانے والی نیکی کی Effort پر اجر دے گا، یہ ضروری نہیں کہ اُس کی نیکی کا نتیجہ بھی نکلا ہو۔ اگر ایک شخص نے نیکی کی نیت کی پھر تن دہی سے کوشش بھی کی لیکن اُس کے باوجود نیکی نہ کر پایا تب بھی رب تعالیٰ اُسے اُس کا اجر عطا فرما دے گا۔

اسرارِ رُوحانیت

سوال: کیا موت کسی مسلمان کے لیے باعث مسرت بھی ہو سکتی ہے؟

جواب: انتقال کسی بھی مسلمان کے لیے بہت خوشی کی بات ہوتی ہے کیونکہ یہ دوست (رب تعالیٰ) سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ جتنے بھی نیک لوگ ہیں اُن پر موت کا خوف کبھی طاری نہیں ہوتا کیونکہ دوست سے ملاقات کی خواہش اُنھیں خوش کر دیتی ہے۔

سوال: نفس کی کتنی اِقسام ہیں؟

جواب: نفس کی تین اقسام ہیں:

- ایسا نفس جو پوری طرح دُنیا کی طرف راغب ہے اور انسان کو خواہشات کا غلام بناتا ہے۔ وہ نفس امارہ کہلاتا ہے۔
- جب انسان گناہوں اور اللہ کے منع کردہ کاموں سے رُکنے کی کوشش کرتا ہے اور نفس کی خواہش کے خلاف جا کر نیک کام کرنے کی سعی کرتا ہے تو یہ نفس لوامہ ہے۔
- جب انسان گناہ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پیروی کرتا ہے، اپنی خواہشات، ارادوں اور آرزوؤں کو پوری طرح رب کے حوالے کر دیتا ہے تو یہ نفس مطمئنہ کہلاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان راضی بہ رضا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والی رحمت ہو یا زحمت، دونوں پر شکر گزار رہتا ہے کیونکہ اُس کا ایمان ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ بہت مہربان اور رحیم و کریم ہے۔ جو مشکل آئی ہے ایک تو میرے گناہوں کو دھودے گی اور دوسرے اس میں یقیناً کوئی رحمت چھپی ہے، کیونکہ میرا رب سختی نہیں کرتا۔

سوال: وظائف کے لیے اجازت کیوں ضروری ہے؟

جواب: ہر رُوح کی اپنی انفرادی ماہیت ہے، اسی طرح ہر جسم کی اپنی ایک کیمسٹری ہے۔ ہر رُوح کا اپنا ایک رنگ، مخصوص خوشبو اور Controlling word ہوتا ہے جیسے رب تعالیٰ نے ''کن'' کہا اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ جو وظائف رُوح سے Compatible ہیں۔ اُنھیں پڑھنے سے فائدہ ہوتا ہے اور جو وظائف رُوح

سے Compatible (موافق) نہ ہوں ان کے پڑھنے سے نقصان ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح کچھ وظائف نیوٹرل ہوتے ہیں جن کے پڑھنے سے فائدہ ہوتا ہے نہ نقصان۔ اب یہ سوال کہ وظائف کے لیے اجازت کیوں ضروری ہے؟

دیکھیے! وظیفہ کسی کی ملکیت یا میراث تو ہے نہیں کہ اِس کے پڑھنے کے لیے آپ کو اجازت چاہیے ہوگی لیکن اجازت اِس لیے ضروری ہے کہ اہلِ علم چونکہ آپ کی باڈی کیمسٹری اور رُوح کی ماہیت سے واقف ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ وظیفہ آپ کی رُوح سے Compatible ہے یا نہیں اس لیے وہ Accordingly آپ کو گائیڈ کر دے گا۔ وظیفہ کی اجازت کی یہ دینی، مذہبی اور رُوحانی توجیح ہے۔ اِس کی سائنسی توجیح یہ ہے کہ ڈاکٹر جب کسی آدمی کے بلڈ پریشر کے مرض کی تشخیص کرنا چاہتا ہے تو مریض کو ایک آلہ دے کر ہدایت کرتا ہے کہ ہر گھنٹے بعد بلڈ پریشر چیک کر کے چارٹ میں درج کرتے جائیں۔ جب آپ اس چارٹ کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ دن کے کسی حصے میں بلڈ پریشر High، کسی حصے میں نارمل اور کسی میں Low تھا۔ درحقیقت بلڈ پریشر کا تعلق Lunar system (قمری نظام) کے ساتھ ہے۔ خواتین کے Reproduction cycle کا تعلق بھی قمری نظام کے ساتھ ہوتا ہے۔

دن کے کچھ اوقات میں انسان کا بلڈ پریشر High ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دماغ کو Maximum آکسیجن مل رہی ہوتی ہے اور دماغ کو جتنی زیادہ آکسیجن ملے گی، اُسی قدر زیادہ وہ Receptive ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم میں سب سے زیادہ حساس حصہ تالو ہے۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ جو لوگ سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دھواں Inhale نہیں کرتے بلکہ کچھ دیر منہ میں رکھنے کے بعد Exhale کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اِس طرح وہ سگریٹ نوشی کی عادت میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ بھی کچھ عرصہ بعد عادی سگریٹ نوش ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ دھواں Inhale نہیں کرتے لیکن سگریٹ میں موجود نکوٹین کے بہت خفیف سے اثرات تالو کے ذریعے دماغ تک پہنچتے ہیں اور دماغ اِس کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ تالو کے Sensitive (حساس) ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اگر آپ کبھی تجربہ کریں کہ جب کوئی شخص کوئی بھی لفظ ادا کرتا ہے تو ہر لفظ کی ادائیگی پر زبان مختلف انداز میں تالو کے ساتھ Touch کرتی ہے۔ جس سے وہاں Vibration پیدا ہوتی ہے جو دماغ تک جاتی ہے۔

جس طرح زمین کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ زمین کے بیچوں بیچ ایک خط کھنچا ہے جسے خطِ استوا کہتے ہیں اسی طرح Tropics کی لائنیں ہیں اور Longitude اور Latitude کی لائنیں آپ گلوب پر دیکھتے ہیں۔ یہ لائنیں اگرچہ سچ مچ زمین پر کھنچی ہوئی نہیں لیکن پھر بھی ہم ان لائنوں کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ ہمارا Navigation system انہی لائنوں کی بنیاد پر Direction لیتا ہے۔ اسی طرح رُوحانیت میں انسانی دماغ چار حصوں میں تقسیم ہے۔ یہ دماغ چھوٹے چھوٹے Modules پر مشتمل ہے۔ اگر آپ انسانی دماغ کی

تصویر دیکھیں تو اِس میں آپ کو چھوٹی چھوٹی Irregular shape کی لائنیں نظر آتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوتی ہیں۔ رُوحانیت میں ہم انھیں Modules کہتے ہیں۔ ہر Module کے اندر Hundreds of thousands brain cells موجود ہیں۔ ہر cell کا اپنا ایک Individual function ہے۔ پھر اِس Cell کا ایک اور فنکشن ہے...... جو in conjunction with other cells in that module ہے۔ اِس Cell کا Collective function اس Modules کا Individual function بن جاتا ہے۔ اب اِس module کا individual function in conjunction with other modules دماغ کے اُس حصے کا Individual فنکشن بن جائے گا۔ پھر اس دماغ کے ایک حصے کا Individual function علیحدہ اپنی جگہ ہے اور In conjunction with other parts وہ پورے brain کا فنکشن بن جاتا ہے...... ہر cell اور Module کا انسانی زندگی میں علیحدہ علیحدہ کردار ہے مثلاً ہم Brain کے سامنے کا حصہ دیکھیں تو یہ ہمارا short-term memory area (مختصر المعیاد یادداشت) ہے، دماغ کا پچھلا حصہ Long-term memory area (طویل المعیاد یادداشت) پر مشتمل ہوتا ہے۔ دماغ کا عین درمیانی حصہ ایک طرح سے CPU ہے...... جہاں تمام احکامات کی Processing ہوتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب آپ کوئی وظیفہ پڑھتے ہیں تو اس میں ہدایت کی جاتی ہے کہ دل میں نہیں پڑھنا بلکہ زبان کو حرکت دینا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وظیفہ پڑھتے ہوئے جب زبان ایک مخصوص Movement کے ساتھ تالو کے ساتھ Touch کرتی ہے تو وہاں Vibration (لہر) پیدا ہوتی ہے مثلاً میں لفظ ''اللہ'' ادا کرتا ہوں تو زبان کی Tip تالو سے Touch کرتی ہے جس سے بڑی low Frequency کی Vibrations پیدا ہوں گی۔ کیونکہ تالو کے بہت Forward area میں جا کر زبان کی محض Tip (نوک) Touch کر رہی ہے اس لیے لفظ ''اللہ'' کو soothing کہا جاتا ہے۔

جب آپ کوئی لفظ بار بار بولیں گے تو دماغ میں Vibrations پیدا ہوں گی جو دماغ کے کسی خاص Cell یا Module کو جھنجھوڑتی ہیں اور وہ خاص حصہ Activate (متحرک) ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص صاحب علم کے پاس جا کر مالی تنگی کا شکوہ کرتا ہے۔ صاحب علم اُسے ایک لفظ ''یا غنی'' یا ''الغنی'' پڑھنے کو کہتا ہے۔ (یہ لفظ میں محض مثال کے طور پر بتا رہا ہوں ورنہ اِس کا مالی تنگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔) جب وہ شخص ''الغنی'' پڑھنا شروع کرتا ہے تو زبان کے دائیں سائیڈ کا درمیانی حصہ تالو سے جا کر Touch کرتا ہے۔ جس سے Vibration پیدا ہوتی ہے اور یہ Vibration دماغ کے اس حصے کو زیادہ Activate کر دیتی ہے جو کاروبار کے سلسلے میں سوچ بچار کرتا ہے۔ یوں Forward thinking and planning بڑھ جائے گی۔ جس کے نتیجے میں وہ صحیح فیصلے کرے گا۔ یوں اُس کا کاروبار چمکے گا اور اسے مالی خوش حالی نصیب ہو جائے گی۔ اب ساری محنت تو اُس نے خود کی لیکن وہ سارا کریڈٹ فقیر یا صاحب علم کو دے گا کہ اُس نے کیا کمال

وظیفہ مجھے دیا ہے کہ اِدھر میں نے پڑھا، اُدھر میرے معاملات ٹھیک ہو گئے۔

جب آپ فقیر کے پاس جائیں گے تو وہ Unintentionally آپ کی رُوح کی ماہیت اور کنڈیشن کو دیکھتے ہوئے اُس سے Compatible (موافق) لفظ آپ کو بتائے گا اور ایک ایسے وقت میں وہ لفظ آپ کو پڑھنے کو کہے گا جب آپ کا ذہن سب سے زیادہ Receptive ہوتا ہے۔ وظیفے کی دو باتوں کا تعلق رُوحانیت سے نہیں بلکہ نفسیات سے ہے...... ایک تو یہ کہ وظیفہ چلتے پھرتے نہیں پڑھنا۔ دوسرے ایک جگہ بیٹھ کر پڑھنا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ مانوس ماحول (Familiar Atmosphere) میں زیادہ Relax رہتا ہے۔ اس لیے تاکید کی جاتی ہے کہ وظیفہ ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر پڑھیں تاکہ آپ اعصابی تناؤ کا شکار نہ ہوں۔

سوال: کیا مرد فراخی کا اظہار سونے اور ریشم کے استعمال کے ذریعے کر سکتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو مالی عنایات کی ہیں اُن کا اظہار آپ کے ظاہری حلیے سے ہونا چاہیے۔ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے کھلا رزق عطا فرمایا ہے لیکن اس کے باوجود وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں رہے اور ہر وقت کنجوسی کے چکر میں رہے تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ فراخی کا اظہار آپ کے ظاہر سے ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مرد حضرات سونا اور ریشم استعمال کرنے لگیں کیونکہ اسلام میں اِس کی ممانعت ہے۔

سوال: کیا نماز کا کوئی نفسیاتی فائدہ بھی ہے؟

جواب: نفسیاتی مریض ہونے کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اسلام نے مختلف طریقے سے اسے Prevent کیا ہے تاکہ انسان کسی بھی Stage پر نفسیاتی مریض نہ بننے پائے۔ نماز کیا ہے؟ پانچ نمازیں فرض کرنے کے ساتھ ساتھ تہجد، اشراق اور نوافل کی فضیلت بیان کر دی گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ فرض نمازیں پانچ کی بجائے دس ہوتیں یا صرف ایک ہوتی۔ دراصل پانچ نمازوں کی فرضیت کے پیچھے سائنسی وجہ ہے۔ اگر آپ غور کریں تو نمازوں کی رکعات کی ترتیب اور تعداد آپ کو حیرت انگیز محسوس ہو گی۔ فجر کے وقت جب انسان Fresh (تازہ دم) ہوتا ہے، اُس وقت رکعات کی تعداد سب سے مختصر ہے، دو فرض دو سنت۔ ظہر کی نماز مقابلتاً طویل ہے۔ عصر کی نماز قدرے مختصر ہے۔ مغرب کی نماز عصر کی نسبت طویل ہے اور رات کو جب انسان دن بھر کا تھکا ہوا ہوتا ہے، اُس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے جس کی رکعتیں سب سے زیادہ ہیں۔ آخر ایسا کیوں؟

وجہ یہ ہے کہ جب انسان صبح بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنا ناتا رب سے جوڑتا ہے۔ اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ایک سپریم پاور میری مددگار ہے جو مجھے Look after کرتی ہے۔ جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو دُنیاوی مصروفیات اور حرص و لالچ سے تعلق توڑ کر رب تعالیٰ کے ساتھ ناتا جوڑ لیتا ہے۔ جب وہ رب تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے تو اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کوئی All-time powerful ہے جو میرا نگہبان اور مددگار ہے۔ یہ احساس بذاتِ خود انسان کے اندر ایک حوصلہ، جذبہ اور Sense of security پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

اِس Sense of security کی انسان کو عمر کے ہر حصے میں ضرورت رہتی ہے۔ انسان نماز کی ادائیگی

کے بعد بہت فریش حالت میں اُمورِ دنیا کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتا ہے اور کافی دیر تک بغیر تھکے اپنی مصروفیات سرانجام دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ ظہر کی نماز کا وقت آن پہنچتا ہے، جب وہ قدرے تھکن کا شکار ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا وہ ایک بار پھر دُنیاوی اُمور سے تعلق توڑ کر اللہ کے ساتھ ناتا جوڑ لیتا ہے۔ اللہ کو سب سے بزرگ، طاقت ور اور قادرِ مطلق جان کر اُس کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ نماز کے بعد جب دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اُسے ایک بار پھر سکیورٹی کا احساس ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو میری مدد کرے گا، مجھے سپورٹ کرے گا، میرے مسائل حل کر دے گا۔ یوں اُس کی بیٹری ایک بار پھر چارج ہو جائے گی اور وہ ایک بار پھر کاروباری اُمور سرانجام دینے کے قابل ہو جائے گا۔

جونہی انسانی ذہن دوبارہ سے تھکنے لگتا ہے اور دُنیاوی پریشانیاں اُسے گھیرنے لگتی ہیں تو نمازِ عصر کا وقت ہو جاتا ہے۔ انسان ایک بار پھر اللہ کے ساتھ ناتا جوڑ لیتا ہے اور نیا حوصلہ اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ اس بار اُس کی Endurance قدرے کم دورانیہ کے لیے Extend ہوتی ہے۔ اِس کے بعد وہ کاروبار ختم کرتا ہے۔ He calls it a day اور مغرب کی نماز ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے تمام مسائل بیان کرتا اور نیا حوصلہ حاصل کرتا ہے، فریش مائنڈ کے ساتھ فیملی کو ٹائم دیتا ہے۔ اِس کے بعد عشاء کی طویل ترین نماز پڑھتا ہے۔ اِس نماز کے طویل ترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب دن بھر کا تھکا ہارا انسان زیادہ دیر تک رب تعالیٰ کے حضور حاضری دے گا اور دُنیا سے ناتا توڑے رکھے گا تو زیادہ دیر تک اس احساس کے زیرِ اثر رہے گا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ میرا کوئی ہے...... جو میرا مددگار ہے، مجھے Look after کرتا ہے، وہ ضرور میرے مسائل کو حل کر دے گا۔ یہ احساس انسان کو تازہ دم اور ہلکا پھلکا کر دے گا اور یوں وہ اچھی گہری نیند سو سکے گا۔

اسلام نے نفسیاتی امراض کو کم کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نفسیاتی امراض سے بچانے کے لیے ہم پر نماز فرض نہیں کی بلکہ اِس کا اصل مقصد تو ہمیں بُرائیوں سے بچانا ہے لیکن یہ نماز کا ضمنی فائدہ ہے کہ اِس کی ادائیگی سے انسان نفسیاتی مسائل کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ صاحبانِ امر کو جب خاص اختیارات تفویض کرتا ہے۔ تو کیا یہ (نعوذ باللہ) کسی لحاظ سے شراکت کے زمرے میں تو نہیں آتا؟

جواب: فرض کریں آپ ریلوے میں سینئر پوزیشن پر ہیں۔ ریلوے کے ہیڈ چیئرمین ہیں، جو آپ کے کام سے اور آپ سے بہت خوش ہیں کیونکہ آپ ہمیشہ اُن کے احکامات کو Beyond the call of duty پورا کرتے ہیں۔ چیئرمین خوش ہو کر تحریری طور پر ایک آرڈر پاس کرتے ہیں کہ اقبال صاحب کی جو بھی Requirements ہوں، وہ فوری طور پر پوری کی جائیں۔ اب آپ فورمین کا مطالبہ کرتے ہیں یا کوئی بھی خواہش کرتے ہیں تو پانچ منٹ میں وہ خواہش پوری کر دی جاتی ہے۔ لیکن کیا اِس کا یہ مطلب ہے کہ آپ ریلوے کے چیئرمین ہو گئے! یہ تو آپ پر چیئرمین کی عنایت ہے۔

رب تعالیٰ...... جو کُن فیکون کا مالک ہے اگر وہ کسی شخص کے کام سے خوش ہو کر یہ حکم جاری کر دے کہ میرا

یہ بندہ جو کچھ مانگے، اُسے دے دیا جائے۔ تو کیا وہ شخص (معاذ اللہ) کن فیکون کا مالک ہو جائے گا؟ یقیناً نہیں...... بندہ مخلوق ہی رہے گا، ماتحت ہی رہے گا۔ صرف یہ ہے کہ اُس کی Unconditional (غیر مشروط) اور Total submission (مکمل اطاعت) کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اُس پر بے پناہ عنایات کی ہیں۔

سوال: کیا مسائل کے حل کے لیے تعویذ گنڈا کرایا جا سکتا ہے یا محض دُعا پر تکیہ کرنا زیادہ درست ہے؟

جواب: یہ اس لیے ہے کہ ہم رب تعالیٰ کے احکامات کو سمجھتے ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم نے اسلام قبول کر کے عقیدہ تو تبدیل کر لیا لیکن ہندوانہ رسم و رواج سے جان نہ چھڑا سکے۔

جب ہندو مذہب متعارف ہوا تھا تو اُس میں بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ کچھ خوبیاں آج بھی موجود ہیں۔ (مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ دشمن کی خوبیوں کو سراہنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتا۔) ہندو آج بھی پبلک ویلفیئر کا کام بہت کرتا ہے۔ اگر آپ بھارت جائیں، تو چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹس کے باہر لوگوں کی لمبی قطاریں دکھائی دیں گی جنھیں کھانا کھلایا جا رہا ہوتا ہے۔ جانوروں کو پانی پلانے کے لیے بھی مختلف مقامات پر انتظام کیا گیا ہوتا ہے۔

جب چھ سات ہزار سال قبل ہندو مذہب متعارف ہوا تو دورِ جہالت اور سائنسی ایجادات نہ ہونے کے باعث انسان نے جس چیز کو بھی طاقت ور اور مفید سمجھا، اُسے دیوتا مان لیا اور جس سے خوف زدہ ہوا، اُسے ڈر کے مارے سجدہ کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ سب اُس کے مذہب کا حصہ بنتا چلا گیا۔ ہندو مت اِس وقت سب سے پرانا Known مذہب ہے لیکن اب یہ مذہب نہیں بلکہ محض رُسومات کا مجموعہ رہ گیا ہے۔ چونکہ اس خطے میں بہت سے لوگ ہندو سے مسلمان ہوئے، اُنھوں نے عقیدہ تو بدلا لیکن اُن ہندوانہ رُسومات کو کسی حد تک Carry کر گئے۔ یہ عامل حضرات اور پیر صاحبان اُنہی رُسومات کا شاخسانہ ہیں۔ بجائے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور آپ ﷺ کی تعلیمات دیکھنے کے ہم مختلف معاملات کے لیے عامل اور پیر حضرات کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص بیمار ہو تو بجائے آپ ﷺ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے علاج کروانے کے، ہم فوراً کسی عامل یا تعویذ گنڈا کرنے والے کے پاس جاتے ہیں اور اِس Process میں ہم اپنے عزیز کا ستیاناس کرا لیتے ہیں۔ اگر کسی کو ہسٹیریا کا دورہ پڑا تو عامل حضرات کہہ دیں گے کہ اِس پر جنات کا سایہ ہے۔ یوں طرح طرح کی اذیتیں اُس مریض کو دینے لگتے ہیں جس سے بسا اوقات اُس کی Death بھی ہو جاتی ہے...... حالانکہ بیماری کی صورت میں سیدھا سا طریقہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے فرمان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہم کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ اس کے بعد مرض سے چھٹکارے کے لیے خود بھی دُعا کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں سے بھی شفایابی کی دُعا کے لیے درخواست کریں...... تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

سوال: کیا جنات کا وجود نہیں ہے؟

جواب: جنات کے وجود سے تو انکار نہیں۔ لیکن یہ باتیں درست نہیں کہ فلاں درخت پر سایہ ہے، آندھی میں

جنات ہیں وغیرہ۔ یہ باتیں ہم نے ہندو معاشرہ سے Carry forward کی ہیں۔ اگر آپ تجزیہ کریں کہ ہندو معاشرہ میں اِن توہمات نے کیسے جنم لیا تو اس کی ایک توجیہہ موجود ہے مثلاً درخت رات کے وقت آکسیجن جذب اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص رات کو درخت کے نیچے سوئے گا تو گویا وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ٹینٹ میں سو رہا ہے۔ بزرگوں نے جب یہ دیکھا کہ رات بھر درخت کے نیچے سونے سے انسان بیمار ہو جاتا ہے تو اُس کو منع کرنے کے لیے کہہ دیا کہ اِس درخت پر تو جن رہتے ہیں اور اس کے نیچے سونے سے انسان پر جنوں کا سایہ ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح آندھی میں جنات کے وہم نے یوں جنم لیا کہ پرانے زمانے میں آبادی اور رُکاوٹیں کم ہونے کی وجہ سے آندھی کی رفتار کھلی جگہ پر بہت تیز ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ مختلف چیزوں، لوہے کے ٹکڑوں، ٹین کی چھتوں، بھاری ٹہنیوں کو اپنے ساتھ اُڑا لے جاتی جس سے لوگوں کو چوٹ لگ جاتی۔ تب بزرگوں نے کہا کہ جب تیز آندھی آئے تو آپ کسی محفوظ جگہ پر چلے جائیں۔ یوں اِس کو یہ رنگ دے دیا گیا کہ آندھی میں جنات آتے ہیں جو سب کچھ اُڑا لے جاتے ہیں۔

سوال: کیا یہ سوچ درست ہے کہ کسی نے جادو کر کے میرا رزق باندھ دیا ہے؟

جواب: یہ سوچنا کہ کسی نے جادو کر کے میرا رزق باندھ دیا ہے یا کسی نے جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے میرے گھر کے افراد موت کے منہ میں پہنچ گئے ہیں، میرے ایمان کے مطابق یہ شرک ہے کیونکہ بحیثیت مسلمان میرا ایمان ہے کہ میرا مالک میرا رب سب سے طاقت ور ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ میں رازق ہوں۔ میں نہ چاہوں تو کوئی کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب رب تعالیٰ نے Clear cut یہ بات کہہ دی تو اِس کے بعد اگر میں یہ کہتا ہوں کہ کوئی شخص جادو کر کے میرا رزق بند کر دے گا تو معاذ اللہ (اللہ تعالیٰ مجھے اِن الفاظ کے لیے معاف فرمائے) میں دل میں سوچ رہا ہوں کہ جادو رب سے (معاذ اللہ) زیادہ طاقت ور ہے!!!

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ رب تعالیٰ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ دُنیا کا ہر علم رب تعالیٰ کے ماتحت ہے۔ اگر میرا رب نہ چاہے تو کوئی کسی کو فائدہ دے سکتا ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اِسی طرح جب میرا رب رازق ہے تو کسی کی کیا مجال کہ کسی قسم کا علم استعمال کر کے میرا رزق روک دے...... کیونکہ میرا رازق...... میرا رب تو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔

سوال: کیا جنات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں؟

جواب: جنات عام طور پر انسانی بستیوں سے دُور رہتے ہیں لیکن اگر کوئی مکان لمبے عرصے سے ویران پڑا ہے تو کسی حد تک ممکن ہے کہ وہاں کوئی جن ڈیرا لگا لے اور کوئی بہت نیک اور اعلیٰ رُوحانی بالیدگی رکھنے والا انسان اُن جنات کو دیکھ بھی لے۔

لیکن یاد رکھیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا۔ جنات، انسان سے افضل نہیں لہٰذا اُن سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ آپ انھیں ڈرائیے۔

سوال: (i) کیا رُوح کو discuss کرنا مناسب ہے؟

(ii) کیا رُوحانی واردات ومشاہدات کو سرِ عام بیان کرنا درست ہے؟

(iii) کیا حقوق العباد، حقوق اللہ سے بھی زیادہ اہم ہیں؟

جواب: (i) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تقدیر اور رُوح پر بحث کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رُوح کا معاملہ ایسا ہے کہ اِس پر بہت سے لوگوں نے قلم اُٹھایا، تحقیق کی لیکن کوئی اس کی حقیقت کو نہ پہنچ سکا...... کیونکہ یہ امرِ ربی ہے۔ اس لیے کوئی اِس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''حقیقتِ رُوحِ انسانی'' میں کسی حد تک رُوح کو ڈسکس کیا ہے۔

(ii) ایک بات یاد رکھیے کہ رُوحانی مشاہدات اور وارداتیں عام طور پر بیان نہیں کی جاتیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بے پایاں علم اور بہت بلند رُوحانی مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنی جنرل نشست میں اسلام کے عام اُصول بیان فرمایا کرتے جب کہ رُوحانیت سے متعلق کچھ نازک نکات کو بیان کرنا مقصود ہوتا تو اپنے ستائیس عدد خاص شاگردوں کو ایک کمرے میں لے جاتے۔ اپنے دستِ مبارک سے دروازہ بند کرتے اور پھر اُس کے کواڑ ہلا کر چیک کرتے کہ یہ پوری طرح بند ہوا ہے یا نہیں۔ اِس کے بعد بہت مدھم آواز میں رُوحانی مشاہدات وواردات کا اس تلقین کے ساتھ تذکرہ کرتے کہ بند حجرے میں کی جانے والی گفتگو کا ذکر کہیں باہر نہیں کیا جائے گا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ وہ ولی اللہ ہیں جن کے بارے میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جیسی نابغۂ روزگار ہستی نے فرمایا تھا کہ اُن کا مقام اولیائے کرام میں وہی ہے جو فرشتوں میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ہے۔ اُن جیسے بلند پایہ ولی اللہ کی کتابیں پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ اُن میں نہ تو کشف و کرامات کا ذکر ملتا ہے اور نہ اُن اوراد ووظائف کی تفصیل جو وہ پڑھا کرتے تھے...... نہ ہی کہیں اُن کی رُوحانی سیر اور وارداتوں کا بیان ہے۔ اُن کتابوں میں صرف اور صرف رب تعالیٰ کے احکامات اور شریعت کے مختلف مسائل کا بیان ہے۔ جگہ جگہ خلقِ خدا کی خدمت کی تلقین ہے۔

اِسی طرح حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''کشف المحجوب'' دیکھ لیجیے...... صفحہ اوّل سے صفحہ آخر تک آپ کو کہیں یہ ذکر نہیں ملے گا کہ اُنھوں نے اپنے کسی وظیفے یا رُوحانی سیر کا تذکرہ کیا ہو۔

آپ کسی بھی مستند ولی اللہ کی کتاب لے لیں...... اُس میں آپ کو کہیں یہ ذکر نہیں ملے گا کہ میں نے فلاں وظیفہ پڑھا تو فلاں واقعہ پیش آیا اور نہ یہ بتایا گیا ہو گا کہ رزق کی کمی یا بیماری کی صورت میں فلاں وظیفہ پڑھ لو تو رزق بڑھ جائے گا یا بیماری دُور ہو جائے گی۔ اُن کتابوں میں رب تعالیٰ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کی تاکید ہے۔

میرے نزدیک اگر آپ رُوحانی واردات کا ذکر پبلک میں کر دیں گے تو فائدہ کم اور گمراہی زیادہ ہو گی۔ کیونکہ پھر لوگ کرامات اور ماورائے عقل چیزوں کے حصول کے پیچھے بھاگیں گے اور جب وہ چیزیں اُنھیں

حاصل نہیں ہو پائیں گی تو وہ مایوس ہو کر اچھا عمل بھی ترک کر دیں گے۔

ایک Law of nature (قانونِ فطرت) اور دوسرا Design of nature ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم اوراد و وظائف کے ذریعے Law of nature کو Defeat (شکست) دینا چاہتے ہیں؟ مختلف رسالوں، کتابوں میں مختلف وظائف بیان کیے گئے ہوتے ہیں کہ فلاں مسئلہ کے حل کے لیے فلاں وظیفہ پڑھیں۔ یہاں میرے ایک سوال کا جواب دیجیے کہ کیا وجہ ہے کہ اتنے وظائف دستیاب اور معلوم ہونے کے باوجود ہمارے حالات اتنے دگرگوں ہیں؟

یہ وظائف معلوم ہونے کے بعد تو پاکستان کی سولہ کروڑ عوام میں سے کسی کو بیمار، کسی کو غریب اور کسی کو مصیبت و پریشانی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی آدمی دشمنوں سے زیر نہیں ہونا چاہیے......!!!

یاد رکھیے کہ رب تعالیٰ اپنے قانون اور قاعدے کو کبھی نہیں توڑتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ جو بوئیں اور گندم کاٹیں یا کیکر کا درخت لگائیں اور سیب کا پھل پائیں...... ہم جو کچھ کریں گے اُس کا صلہ ہمیں ویسا ہی ملے گا۔

ہاں! رب تعالیٰ رحیم و کریم ہے...... حقوق اللہ کے سلسلے کی کوتاہیاں وہ ضرور معاف فرما دے گا کیونکہ وہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند بھی فرماتا ہے لیکن حقوق العباد کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ وہ شہید جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اُنھیں مردہ مت کہو کیونکہ وہ زندہ ہیں، کھاتے پیتے ہیں لیکن تمھیں اِس کا شعور نہیں...... شہید کا مقام اِتنا بلند ہے کہ اُسے بغیر حساب کتاب جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے لیکن اگر کسی شہید کے ذمہ زندگی میں قرض واجب الادا تھا تو اُس قرض کی ادائیگی تک جنت میں اُس کا داخلہ روک دیا جاتا ہے۔ اِسی سے اندازہ لگائیے کہ حقوق العباد کی کس قدر اہمیت ہے۔ رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے حقوق اللہ (سوائے شرک کے) تو معاف کر دے گا لیکن وہ اپنا قانون نہیں توڑتا، اِس لیے حقوق العباد کی ادائیگی بہت ضروری ہے۔

سوال: اوراد و وظائف کو دُنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب: بدقسمتی سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر کام وظیفہ پڑھنے سے ہو جائے۔ یہ درحقیقت بے عملی اور سست الوجودی کی ایک صورت ہے۔ قرآن پاک اس لیے نہیں اِتارا گیا تھا کہ اس میں سے وظیفے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم اپنی دُنیاوی ضروریات پوری کر لیں۔

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہو گا کہ صاحب! میں نماز بھی پڑھتا ہوں، قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتا ہوں، پھر بھی میرے اُوپر مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں یہ دراصل اسلام کے بارے میں ہمارے تصورات Clear نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

رب تعالیٰ کی عبادت تو اس لیے کی جانی چاہیے کہ وہ رب ہے...... لائق عبادت ہے۔ اس عبادت کے صلے میں ہمیں کیا عطا ہوتا ہے، یہ کلیتہً ہمارے رب کا فیصلہ ہے۔ وہ چونکہ ہمارا آقا و مالک ہے، وہ جو چاہے فیصلہ کرے...... وہ جو کچھ بھی ہمیں عطا کرے گا...... وہ یقیناً ہمارے لیے بہترین ہو گا۔

صاحبانِ علم یا اولیاء اللہ کوئی بھی وظیفہ رزق یا عزت میں اضافے یا رُوحانی ترقی کے لیے نہیں پڑھتے

کیونکہ اُن کے نزدیک رُوحانی ترقی بہت کم تر درجے کا انعام ہے۔ وہ تو رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ذکرِ الٰہی کرتے ہیں۔

فرض کریں آپ لاہور سے اسلام آباد جاتے ہیں۔ سفر کے آغاز میں آپ کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ میں راستے میں گوجرانوالہ رکوں گا اور فلاں فلاں مقام دیکھوں گا بلکہ آپ کا مقصد تو اپنی منزل پر (اسلام آباد) پہنچنا ہوتا ہے۔ دورانِ سفر گوجرانوالہ ٹرین رُکتی ہے اور آپ کو وہاں کا باربی کیو کھانے کو مل جاتا ہے۔ پھر وزیر آباد کے اسٹیشن پر جب ریل گاڑی ٹھہرتی ہے تو آپ کو وہاں کے چھری چاقو خریدنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آپ یوں سفر کا اضافی فائدہ اُٹھاتے ہیں کیونکہ آپ کا اصل مقصد تو اِن چیزوں کی خریداری نہیں بلکہ اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔

اِسی طرح فقیر کا اصل مقصد اور اصل منزل تو رب تعالیٰ تک پہنچنا ہوتا ہے...... اُس کا مطمحِ نظر رب کو منانا اور پانا ہوتا ہے، اُس کو راضی کرنا ہوتا ہے۔

اگر رُوحانیت کی اِس راہ میں اُسے کشف و کرامات مل جائیں تو وہ اُنھیں اہمیت نہیں دے گا لیکن اُن کے لیے وہ رب تعالیٰ کا شکر گزار ضرور ہوگا۔ اگر رب تعالیٰ اُسے اپنے قریب لے آتا ہے، اپنی دوستی عطا کر دیتا ہے اور اِس دوستی کے انعام کے طور پر اُسے اپنے کارخانہ قدرت کی کسی حد تک سیر کی اجازت دے دیتا ہے تو یہ کلیتہً رب تعالیٰ کی رحمت ہے، کوئی باعثِ فخر بات نہیں اور جو چیز باعثِ فخر نہ ہو اُس کا ذکر کیا کرنا۔

کوئی بھی فقیر یا درویش اپنی کتاب میں بے عملی کی تلقین نہیں کرے گا۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہے گا کہ اگر آپ بے روزگار ہیں تو کوشش مت کیجیے بلکہ فلاں وظیفہ پڑھ لیں، آپ کو رزق مل جائے گا۔ اگر آپ بیمار ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے طبیب کے پاس مت جائیں بلکہ فلاں وظیفہ پڑھ کر صحت مند ہو جائیں۔ فقیر کبھی ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اُس کے نزدیک یہ جرم ہے کہ جو ذکرِ الٰہی عبادت کا حصہ ہے، اُسے عبادت کے بجائے دُنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الجمعۃ میں نمازِ جمعہ کے بعد زمین پر پھیل کر رزق کی تلاش کی تلقین کی گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اوراد و وظائف اِس نیت سے کیے جائیں کہ اِن کے ذریعے ہمیں رب مل جائے۔ اور دُنیاوی مقصد کے حصول کے لیے عملی تگ و دو کی جائے۔

تصورِ توحید

سوال: مفلسی کا توڑ مختصراً بیان فرمادیجیے۔

جواب: حضرت انسؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''قریب ہے کہ محتاجی کفر ہو جائے۔'' (شعب الایمان) حضرت علیؓ نے اپنے بہت خوبصورت قول میں اِس مفلسی کا توڑ بھی بتا دیا ''میں نے اپنی ضروریات کو اِتنا کم کرلیا کہ امیر ہو گیا۔''

اگر دُنیا میرے نزدیک Value رکھتی ہے تو میں مفلسی تک پہنچ جاؤں گا لیکن اگر میں نے حضرت علیؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے رب تعالیٰ اور آخرت کو اہم جانا تو پھر میں اپنی ضروریات کم کر کے امیر ہو جاؤں گا۔

سوال: تصورِ توحید کیا ہے؟

جواب: ''توحید کا Concept دو طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے......ایک تو وہ تصور ہے جس سے عرفِ عام میں ہم سب واقف ہیں کہ رب ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، نہ اُس کو کسی نے جنم دیا، نہ اُس نے کسی کو جنم دیا۔ رب تعالیٰ کی کوئی ماہیت، کوئی جسم نہیں جسے Touch کر کے اُسے Describe کیا جا سکے۔ وہ سوتا نہیں ہے، اُسے اُونگھ نہیں آتی، وہ کسی کا محتاج نہیں، ساری کائنات اُس کی محتاج ہے...... یہ توحید کا عام تصور ہے۔ توحید کی ایڈوانس فارم (Advance form) یہ ہے کہ جہاں انسان دل سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرا پالن ہار، میرا والی و وارث رب تعالیٰ ہے، اگر میں اپنی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے کی طرف دیکھوں گا تو میں گویا شرک کر رہا ہوں گا۔ غیر اللہ سے توقعات وابستہ کرنا اور اپنی ضروریات کی تکمیل کی خواہش رکھنا شرک ہی کی ایک صورت ہے۔

جب کوئی شخص مشکل میں گھر جاتا ہے، بیمار ہو جاتا ہے، مالی تنگی کا شکار ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں، ماں باپ اور دوست احباب سے رُجوع کرتا ہے۔ اپنے تئیں اُن مشکلات سے باہر آنے کی کوشش کرتا اور ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ جب اُس کی ہر تدبیر ناکام ہو جاتی ہے تو پھر پریشانی کا مارا شخص دُعاؤں کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ جب یہ دُعائیں بھی رنگ نہیں لاتیں تو وہ مایوسی میں گھر جاتا ہے ایسے میں وہ مجبوراً رب کی طرف رُجوع کرتا ہے اور جب وہ رب کی طرف رُجوع کرتا ہے تو یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں وہ

مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اُن سے وابستہ اُس کی تمام توقعات ختم ہو گئی ہوتی ہیں۔ تب وہ اپنی تمام اُمیدوں اور توقعات کا محور رب تعالیٰ کو بنالیتا ہے۔ وہ اُسے مالکِ کل اور حاجت روا جاننے لگتا ہے۔ یوں وہ پریکٹیکل طریقے سے توحید پر عمل کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں اُسے مخلوق سے مایوسی ہو چکی، دُعائیں رنگ نہیں لائیں، کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں اور ان تمام Factors کی وجہ سے وہ دل شکستہ ہو گیا۔ اس دل شکستگی کی وجہ سے اُس کے دل میں دُکھ پیدا ہو گیا اب یہ دُکھ جتنا گہرا ہو گا دل میں گداز اُتنا ہی زیادہ ہو گا اور دل میں گداز جتنا زیادہ ہو گا اللہ تعالیٰ اُتنی ہی گہرائی سے اس دل میں آ کر قیام کرے گا۔

جب رب تعالیٰ کی طرف رُجوع بڑھ جائے گا تو وہ اپنے بندے کو اپنے قریب کرلے گا۔ جب وہ اُسے قریب کرے گا تو اُسے انعام عطا کرے گا...... اور وہ انعام یہ ہے کہ رب تعالیٰ اُسے علم عطا کر دے گا۔ جب علم عطا ہو گا تو کارخانہ قدرت کے پوشیدہ راز اور بھید اُس پر عیاں ہونے لگیں گے اور جس ڈگری کا علم اُسے عطا ہو گا، اُسی قدر زیادہ بھید اُس پر افشا ہونے لگیں گے۔ اُسے کشف و کرامات اور تصرفات حاصل ہو جائیں گے۔

رب تعالیٰ کی قربت اور توحید کا عملی تصور اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان دل شکستہ نہ ہو۔ انسان دل شکستہ اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ چاروں طرف سے نااُمیدی کا شکار ہو جائے۔

جب اُسے کشف و کرامات اور تصرفات حاصل ہو جاتے ہیں۔ تو وہ ولی اللہ کہلاتا ہے۔ ولایت کی کئی شاخیں ہیں، سالک ہے، مجذوب ہے، پھر قلندرانہ رنگ ہے۔ یہ تمام شاخیں ایک ہی منزل ''رب تعالیٰ'' سے جا ملتی ہیں۔

رب تک پہنچنے کے دو طریقے ہیں...... ایک طریقت کا راستہ ہے اور دوسرا شریعت کا راستہ...... امامِ طریقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور یہ راستہ آسان ہے۔ اس میں انسان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دہلیز کو پکڑ لیتا ہے، اُن کی پیروی شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ حضرت علیؓ کی دہلیز سے آپ ﷺ کی دہلیز تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ جب انسان آپ ﷺ کی دہلیز کو تھام لیتا ہے تو پھر وہاں سے اُسے رب تعالیٰ کی دہلیز تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

دوسرا راستہ شریعت کا ہے جو بہت کٹھن ہے کیونکہ شریعت پر عمل کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں انسان کا پاؤں ضرور پھسلتا ہے۔ امامِ شریعت آپ ﷺ خود ہیں۔ انسان شریعت پر عمل کرتا ہے اور آپ ﷺ کی دہلیز تک جا پہنچتا ہے پھر وہاں سے وہ رب تعالیٰ کی دہلیز پر پہنچا دیا جاتا ہے۔

طریقت میں ایک سالک ہے اور دوسرا مجذوب جب کہ تیسرا راستہ حضرت علیؓ کی اپنی سنت ہے اور وہ راستہ قلندرانہ ہے۔ قلندر وہ ہے جو اپنی تمام خواہشات، اغراض، معاملات، آرزوئیں سب ایک گٹھڑی میں باندھ کر رب تعالیٰ کے دروازے پر رکھ آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا سب کچھ تیرے حوالے۔ قلندر کو نہ دُنیاوی مال و آسائش کی پروا ہے نہ روپے پیسے کی آرزو۔ اُسے دُکھ، تکلیف، گرمی، سردی کسی چیز کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ

ہر حال میں راضی بہ رضا رہتا ہے کہ میرا رب مجھے جس حال میں رکھے، میں اُس میں راضی ہوں۔

ایک قلندر روزی کمانے کی فکر تو کرتا ہے لیکن اُس کے لیے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ اُس کا ایمان ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں جو رزق لکھا ہے، وہ مجھے مل کر رہے گا۔ میرا کام فکر اور تدبیر کرنا، کوشش کرنا، ہاتھ پاؤں مارنا اور اتمام حجت کرنا ہے۔ پریشان ہونا میرا کام نہیں ہے۔ میری فکر کرنے والا میرا رب ہے، اُس کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی۔

رب تعالیٰ ہمیشہ زندہ و قائم رہنے والا ہے اِس لیے انسان پریشان نہیں ہوتا البتہ فکر ضرور کرتا ہے۔ مثلاً اگر چھت ٹپک رہی ہے تو اُس کی مرمت کی فکر ضرور کرے گا لیکن پریشان نہیں ہو گا۔ اگر بیٹے کا کسی Particular سکول میں داخلہ نہیں ہو پا رہا تو اُس کے داخلے کے لیے دوڑ دھوپ ضرور کرے گا لیکن پریشان نہیں ہو گا کیونکہ اُس کے دل میں یہ یقین ہے کہ میرا رب موجود ہے وہ مجھے ضرور Look after کرے گا اور میرے لیے بہترین اسباب پیدا کرے گا۔ اِسی بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ سے اچھے گمان رکھو، میں اچھا ہی کروں گا۔ یہی ایک احساس انسان کو اُس قلندرانہ رویے کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ حالات و واقعات سے پریشان ہونا چھوڑ دیتا ہے اور بے فکر ہو جاتا ہے۔

جب انسان اُس مقام پر آ گیا جہاں اُس نے ہر معاملے کو Positive sense میں لینا شروع کر دیا کہ یہ بیماری آئی ہے تو میرے رب کی طرف سے ہے، اِس کا علاج کرانا میری ذمہ داری ہے اور مجھے اپنے رب سے قوی اُمید ہے کہ وہ مجھے شفا دے گا۔ اِسی طرح اگر وہ فاقوں میں گھر جاتا ہے تو یہ سوچ کر پریشان نہیں ہوتا کہ میرا کیا بنے گا کیونکہ اُس کے دل میں یقین واثق ہے کہ مجھے جو کچھ عطا ہو رہا ہے، یہ میری بہتری کے لیے ہے۔ یوں وہ ہنسی خوشی ہر طرح کے حالات سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ یہی قلندرانہ رنگ ہے۔

مفلسی انسان کو اُس وقت کفر تک لے جائے گی جب انسان اِس قلندرانہ رویے کو ترک کر دے گا۔ جب اُس کی سوچ کا محور اور جستجو کا مقصد دُنیا کا حصول ہو جائے گا تو مفلسی اُسے یقیناً کفر تک لے جائے گی لیکن اگر وہ آخرت کی زندگی کو اہم جانے تو پھر مفلسی کی وجہ سے کفر تک جانے سے بچ جائے گا۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں ہم نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور روزے رکھ کر بھی جنگیں لڑی ہیں۔ ہم نے فاقے بھی کاٹے ہیں، کفار کی اذیتیں بھی برداشت کی ہیں لیکن ہم میں سے کوئی آدمی کفر تک نہیں گیا کیونکہ تب ہمارا مقصد حصولِ دُنیا نہیں بلکہ رب تعالیٰ کو راضی کرنا تھا اِس لیے ہم سب کچھ ہنسی خوشی سہہ گئے اور پھر جب ہم پر اُس کے انعامات کی بارش ہوئی تو ہم نے ایرانی اور رومی تہذیبوں کو شکست دے دی۔ دُنیا کی دو سپر پاورز ہمارے ہاتھوں ٹوٹ گئیں۔ دُنیا کے تقریباً تین چوتھائی حصے پر ہم نے حکومت بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ رحمت بھی کی کہ ہماری علمی کتابیں سپین کی لائبریریوں سے اہلِ یورپ نے حاصل کر کے اُن سے استفادہ کیا۔ مزید ریسرچ کی اور اُس کا پھل پایا۔ آج ہم دُنیا میں جو سہولتیں Enjoy کر رہے ہیں وہ سب اہلِ یورپ کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

لیکن اس تحقیق کو بنیاد مسلمانوں نے فراہم کی تھی کیونکہ اُس وقت تک ہمارا مقصد حصول دُنیا نہیں بلکہ حصولِ آخرت ہوا کرتا تھا، جس کے انعام کے طور پر ہم پر کرم کیا گیا اور ہم نے دُنیا کو Lead کرنا شروع کر دیا...... ہمارے ہی تحقیقی کام (Research work) نے دوسری قوموں کو آگے بڑھنے کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔

جب ہم اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں...... اور یہ رحمتیں محض آخرت میں انعامات تک محدود نہیں رہتیں بلکہ یہ دُنیا بھی ہمارے لیے بہت آسان اور پُر آسائش ہو جاتی ہے۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ فرض کریں آپ گھر میں ایک ملازم رکھتے ہیں جس کو ابتدا میں آپ کی Main entrance کی Landing تک آنے کی اجازت ہے لیکن کچھ عرصہ بعد اُس کی فرماں برداری اور وفاداری سے خوش ہو کر آپ اُسے ڈرائنگ روم میں آنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ اُسے لاؤنج تک بلا لیتے ہیں حتیٰ کہ ایک روز اُس کے کام اور وفاداری سے خوش ہو کر اُسے اپنے بیڈ روم تک آنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ آپ اپنی Cupboard کی چابیاں اُس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تب وہ وقت بھی آتا ہے کہ بیرونِ ملک جاتے ہوئے آپ اُسے ہدایت کرتے ہیں کہ میرے پیچھے گھر کا خیال رکھنا۔ یوں آپ اُس پر اعلیٰ درجے کے اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو باہر سے کہیں اُس ملازم کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ اُس نے آپ کے گھر کی کوئی بات باہر کر دی ہے تو آپ کا اُس پر سارا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ اُس کی وفاداری اور اچھا کام اپنی جگہ قائم رہے گا لیکن اُس نے آپ کا اعتماد کھو دیا ہے۔

رب تعالیٰ نے اپنے کارخانۂ قدرت کی بہت سی چیزیں عام آدمی کی نظر سے پوشیدہ رکھی ہیں لیکن اگر کسی شخص کی اطاعت، فرماں برداری، ادب آداب، اخلاص اور اعمال سے خوش ہو کر رب نے اُسے اپنے کارخانہ قدرت میں ایک حد تک جھانکنے کی اجازت دے دی اور اُس شخص نے وہ بھید اپنے تک محدود رکھنے کی بجائے دوسروں پر عیاں کر دیا تو وہ اپنا اعتماد کھو دیتا ہے۔

آپ ﷺ بہت سے لوگوں کے خواب میں تشریف لاتے اور اُنھیں اعزاز بخشتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کی زیارت کر لیں۔ اگر عالم الرویا میں آپ ﷺ کے ساتھ کسی کی گفتگو ہوتی ہے تو میری دانست میں وہ اُس وقت تک رازداری کے حکم میں آئے گی جب تک وہ گفتگو بیان کرنے کا حکم نہ فرما دیا جائے۔ اگر کسی نے اُس حکم کی پیروی کرتے ہوئے خواب کی تفصیلات بیان کیں تو وہ رازداری کے ایکٹ سے مبرا ہو گیا بصورتِ دیگر یہ ایکٹ اُس پر لاگو رہے گا۔

آپ ﷺ کی زیارت اور اُس سے متعلق گفتگو کو، میرے نزدیک، عیاں نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُسے اپنے اندر رکھنا چاہیے۔ اسی طرح حروف مقطعات کے مفہوم و مطالب کو بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

ایک بار کسی شخص نے سوال کیا کہ شب معراج آپ ﷺ مجسم حالت میں تشریف لے گئے تھے یا

رُوحانی حالت میں۔ میں نے گزارش کی تھی کہ میں اِس کا جواب بہت قطعیت کے ساتھ دے دیتا ہوں لیکن اِس کا اثر آپ ﷺ کی لائی گئی تعلیمات پر نہیں پڑتا۔ بہتر ہے کہ پہلے ہم اُن تعلیمات پر عمل کر لیں پھر اس کے بعد اِن سوالوں میں اُلجھیں۔ اِسی طرح اگر ہم قرآن پاک کے معنی سمجھ لیں گے تو پھر حروفِ مقطعات کا مفہوم جاننے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی...... کیونکہ جب ہم نے قرآن پاک کے معانی و مطالب کو سمجھ کر اُس پر عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ ہم پر حروفِ مقطعات کے معنی، اُس کی برکات و اثرات خود ہی عیاں کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کا قرب انسان کو صاحبِ امر کر دیتا ہے...... اس مقام پر انسان کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کیونکہ رب تعالیٰ خود اُس شخص کو علم دینے لگتا ہے۔

سوال: شریعت پر عمل کرنے کے لیے تصوف یا طریقت کو کیوں Devise کیا گیا؟

جواب: قرآن پاک تو شریعت اور احکامِ الٰہی کو بیان کرتا ہے۔ اِس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کے والدین آپ کو حکم دیتے ہیں کہ چھت پر جا کر فلاں کام کر آؤ تو چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں آپ کو خود ڈھونڈنی ہیں اگر سیڑھیاں موجود نہیں تو پھر آپ نے دیکھنا ہے کہ چھت پر پہنچنے کا آسان اور محفوظ راستہ کون سا ہے کیونکہ بہرحال آپ کو حکم بجا لانا ہے۔

شریعت پر عمل بڑا مشکل ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ اسلام آپ کو حکم دیتا ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے دیکھ لیں کہ پڑوسی بھوکا تو نہیں۔ اِسی طرح حکم ہے کہ اپنے مقروض مسلمان بھائی کو قرض سے نجات دلا دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ حکم دیتا ہے کہ آپ نے اگر کسی کو قرض دیا ہے اور وہ قرض لوٹانے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو آپ اُسے قرض معاف کر دیں یا پھر سہولت دے دیں۔ یہ آپ ﷺ کی حدیث بھی ہے۔

اصل میں اسلام نام ہی ایثار و قربانی کا ہے لیکن اپنی فطرت کے باعث انسان اس عمل پر آسانی سے راغب نہیں ہو گا کہ وہ اپنی محنت کی کمائی کسی دوسرے شخص پر کھلے دل سے خرچ کر دے یا خود بھوکا رہ کر دوسرے کو کھانا کھلا دے لیکن یہ رویہ اور عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ آپ اِس کی طریقت سے ٹریننگ لیتے ہیں اور یہ سیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایثار و قربانی کے اِن رویوں اور اعمال کو اپنی زندگی میں کیسے داخل کیا جا سکتا ہے...... اور اللہ کے ان احکامات کی پیروی کو اپنی عادت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ تصوف کا مقصد کبھی بھی کشف و کرامات کا حصول نہیں رہا۔ تصوف تو دراصل ایک School of thought تھا جس نے آپ کے لیے ایک جم خانہ قائم کیا۔ جس طرح جم میں جا کر آپ اپنی باڈی کو ویٹ لفٹنگ کے مقابلے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ وہاں موجود کوچز (Coaches) آپ کو سکھاتے ہیں کہ آپ کی باڈی کی مخصوص ساخت کے پیشِ نظر کون سی ایکسر سائز کر کے آپ کے مسلز Develop ہو سکتے ہیں اور آپ کس طرح ویٹ لفٹنگ کے قابل ہو جائیں گے۔ بعینہٖ تصوف نے ایک ایسا جمنیزیم قائم کیا تھا جہاں انسان کی رفتہ رفتہ غیر محسوس انداز میں ٹریننگ ہوتی تھی حتیٰ کہ وہ دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ اپنے آرام و ضروریات قربان کر کے دوسروں کو آرام پہنچانے اور خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلانے کی

عادت اُس میں Develop کی جاتی۔ مختصراً وہاں اُسے ایثار و قربانی کی ٹریننگ دی جاتی جس کے بعد اُس کے لیے شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جاتا۔

شریعت کے پانچوں ستون دیکھ لیجیے...... اُن سے ایثار و قربانی کا درس ملتا ہے۔ آپ نماز پڑھتے ہیں تو اپنے وقت، خواہشات اور آرام کی قربانی دیتے ہیں۔ ٹی وی پر آپ کا پسندیدہ پروگرام آرہا ہے لیکن آپ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ مجھے پروگرام نہیں دیکھنا، نماز پڑھنی ہے۔

اِسی طرح آپ دوستوں اور عزیز رشتہ داروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ اذان ہوتی ہے اور آپ اُن خوش گپیوں کو چھوڑ کر رب کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں آپ کی دکان پر کوئی Customer آتا ہے، آپ کاروبار کر کے منافع کما سکتے ہیں لیکن سوچتے ہیں کہ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے...... آپ منافع ترک کر دیتے ہیں اور نماز ادا کرنے لگتے ہیں۔

یوں اپنی خواہشات کو کنٹرول کر کے آپ دراصل قربانی کر رہے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح آپ نے بڑی محنت سے پیسہ کمایا اور اُس میں سے کم از کم ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ دے دی۔ بعینہٖ آپ حج کا ارادہ کرتے ہیں اور اُس کی ادائیگی کے لیے اپنے روپے پیسے اور آرام کی قربانی دیتے ہیں۔

اہلِ طریقت نے یہ Training اِس لیے Devise کی تھی کیونکہ اس کے ذریعے انسان Gradually بڑے غیر محسوس انداز میں شریعت پر عمل کرنے لگتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ طریقت، شریعت پر عمل کرنے کا ایک زینہ تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے طریقت کے مثبت پہلوؤں کو ختم کر کے اس کو کشف و کرامات اور دُعائیں کروانے تک محدود کر دیا۔ اور اہلِ طریقت کا ایک ہی مصرف سمجھ لیا کہ ان کے پاس جا کر دُعا کرا آئیں اور دُعائیں بھی ایسی کہ اُس پرائز بانڈ کا نمبر بتا دیں جس کا انعام نکلتا ہے۔

اہلِ طریقت کا یہ استعمال تو بالکل ایسا ہے کہ آپ کے پاس سونے کی اشرفیوں کا ایک ڈھیر ہو لیکن اُس میں سے آپ کوئلے چن چن کر گھر لے جائیں۔

اہلِ علم کو دُعائیں کرانے کے لیے استعمال مت کریں بلکہ اُن سے علم لیجیے۔ اگر آپ کو ایک مہربان اور نیک ڈاکٹر مل جائے اور آپ آئے روز اپنے بیمار عزیز رشتہ داروں کو اُس کے پاس لے جائیں اور دوائی لے کر گھر چلے آئیں۔ کیا یہ زیادہ بہتر نہیں کہ اگر وہ ڈاکٹر آپ کو ڈاکٹری سکھانے پر آمادہ ہے تو دوائی لینے کے بجائے اُس سے ڈاکٹری ہی سیکھ لی جائے۔ لہٰذا اہلِ علم اور اہلِ طریقت کے پاس جا کر یہ سیکھیے کہ رب کو کیسے راضی کیا جائے۔

آپ ﷺ کے ساتھ معاملات میں رازداری اور ادب کی اہمیت

آپ ﷺ کے ساتھ معاملات میں رازداری اور خاموشی کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ اِس میں جو چیزیں انسان feel کرتا ہے، مشاہدہ یا تجربہ کرتا ہے اگر وہ واردات، مشاہدہ یا تجربہ سب کے لیے ہو تو پھر سب کو کھلے عام نظر آئے۔ لیکن اِس میں جو Experience (تجربہ) کسی ایک شخص کو ہوتا ہے وہ بہت Rarely کسی اور کو ہوگا۔ ہر رُوح کی کیفیت اور کیمسٹری، بالیدگی کا لیول اور اُس کی عبادات اور رویے مل کر یہ Decide کرتے ہیں کہ وہ کیا Experience کرے گا۔ یہ فیکٹرز اُس Particular آدمی کے لیے Peculiar (مخصوص) ہوتے ہیں۔

انسان خواہ نصیحت کے رنگ میں ہی سہی، یہ مشاہدہ یا تجربہ کسی کے سامنے بیان کر دے تو پھر آئندہ کے لیے یہ سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک مقامِ جنون اور دوسرا مقامِ ادب ہے۔ رب تعالیٰ کے حضور حاضری کے وقت انسان جتنا جنونی ہو جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔ اِس جنون میں انسان رب سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے لیکن آپ ﷺ کے حوالے سے انسان جتنا مؤدب ہوگا اُسی قدر کرم نوازی کا مستحق ٹھہرے گا۔ آپ ﷺ کو تو اُس بات کی پروا نہیں کہ کون میرے لیے کتنا Respectful ہو رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے لیے انسان کے مؤدب ہونے کو بہت Value دیتا ہے۔

ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم مدینہ شریف میں اپنے ہوٹل سے نکل کر مسجدِ نبوی ﷺ کی طرف روانہ ہوں تو خاموش رہیں اور درود پاک پڑھتے رہیں۔ اِسی طرح جب آپ مسجد نبوی ﷺ سے ہوٹل کے لیے روانہ ہوں تب بھی خاموش رہیں اور دل میں درود پاک پڑھتے رہیں اور ہوٹل پہنچ کر ساتھیوں سے گفتگو کر لیں۔

مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھ کر کسی کو اشارہ تک کیا جائے، حاضری کے سلسلے میں ادب بہت ضروری ہے۔

اب آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ جب آپ میرے ساتھ مختلف مزارات پر جاتے ہیں تب میں آپ لوگوں کا واقف کیوں نہیں بنتا۔ وہاں میں نہ آپ لوگوں کو دیکھتا ہوں نہ کسی سے گفتگو کرتا ہوں کیونکہ یہ اولیاء اللہ بہت

بڑے لوگ ہیں۔ اُن کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ میں جب وہاں پہنچوں تو اُن کے مزار سے قدرے فاصلے پر گاڑی روکوں اور وہاں سے پیدل چل کر اُن کی خدمت میں حاضری دوں۔ حاضری کے لیے جاتے اور پھر وہاں سے واپس آتے ہوئے راستے میں ساتھیوں سے گفتگو نہ کروں بلکہ احتراماً خاموش رہوں۔

آج آپ پر یہ بات بھی کھل جائے گی کہ قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوتے وقت میں گاڑی اتنی دُور کیوں کھڑی کرتا ہوں۔ اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ قبرستان کے جس حصے میں وہ دفن ہیں اُس کی حدود وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں میں گاڑی پارک کرتا ہوں۔ چونکہ وہ میرے مرشد ہیں اس لیے میں Out of respect کبھی اُن کے ٹھکانے پر گاڑی لے کر نہیں جاؤں گا۔

سوال: اللہ سے مانگتے ہوئے اپنی خطائیں اور گناہ یاد آنے لگتے ہیں ایسے میں انسان کیا کرے؟

جواب: آپ یہ بتایئے کہ جب آپ کالج جاتے ہوئے اپنے والد صاحب سے دس روپے کی فرمائش کرتے تھے تو کیا کیفیت ہوتی تھی؟ ایک تو یہ کہ اُس مطالبے کے وقت اپنے قصور اور خطائیں یاد آتی ہیں کہ میں نے فلاں فلاں وقت یہ غلط کام کیا تھا جو والد صاحب کے نوٹس میں ہے اِس لیے اندر ہی اندر ڈر لگتا ہے کہ کہیں ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے۔ یوں ایک طرف والد صاحب کے Powerful اور Position of authority میں رہنے کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک مہربان والد ہیں۔ اِس لیے دس نہیں تو پانچ روپے تو وہ ضرور دے دیں گے...... کیا یہ کیفیت خوف اور اُمید کی نہیں ہے......!!!

جب والد صاحب کے ساتھ ہمارا یہ رویہ ہے تو وہ تو پھر رب ہے، وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی بظاہر ان دونوں صفات کے معنی یکساں ہیں لیکن اسماء الحسنٰی میں انھیں دو علیحدہ اسماء کے طور پر بیان کیا گیا ہے...... جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں ناموں کے مفہوم میں Fine difference موجود ہے۔

رحمٰن وہ ہے جو بغیر کسی کے مانگے، بغیر کسی کے اعمال دیکھے، کھلے ہاتھوں عطا کرتا ہے۔ عطا کرتے ہوئے وہ یہ تک نہیں دیکھتا کہ سامنے منکر ہے یا مشرک، فرماں بردار ہے یا غیر فرماں بردار جب کہ "رحیم" وہ ہے جو اپنے فرماں بردار بندوں کو عطا کرتا ہے۔ بندہ اُس سے نہ مانگے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ رحمٰن ہونے کی صفت کے ناتے رب تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ دینا ہے وہ تو ہمیں ملنا ہی ملنا ہے لیکن اُس کے رحیم ہونے کے ناتے جو کچھ ہمیں مل سکتا ہے وہ نہ مانگ کر ہم محروم کیوں رہیں؟ نہ مانگ کر اُسے ناراض کیوں کریں۔ اس لیے دل کھول کر رب تعالیٰ سے مانگا کریں...... لیکن سچ تو یہ ہے کہ مانگنے کے لیے بھی ظرف چاہیے۔

شہنشاہ اکبر بالکل ان پڑھ آدمی تھا کیونکہ جب وہ عمر کوٹ میں پیدا ہوا تو ہمایوں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جلاوطنی کاٹنے کے بعد جب وہ واپس ہندوستان آیا تب اُس نے جلال الدین اکبر کی تربیت پر بیرم خان کو مامور کیا۔ بیرم خان نے تعلیم کے علاوہ دیگر تمام فنون میں اُسے اس حد تک طاقت ور کر دیا کہ آگے چل کر وہ اکبر اعظم کہلایا۔ جب شہنشاہ اکبر تخت پر بیٹھا تو کم عمری کی وجہ سے اُمورِ سلطنت سنبھالنا اُس کے لیے ممکن نہ تھا لہٰذا شروع میں بیرم خان نے حکومت چلائی جس کی وجہ سے

درباریوں نے jealousy کی وجہ سے بیرم خان کے خلاف اکبرِاعظم کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ کم علمی اور کم عمری کے باعث وہ اِن کی باتوں میں آ گیا اور حکومت کے خرچ پر بیرم خان کو حج پر روانہ کر دیا اور پھر منصوبے کے تحت گجرات کاٹھیاواڑ کے مقام پر رات کے وقت حملہ کر کے اُسے قتل کرا دیا۔

اِس قتل کے بعد اکبرِاعظم کو اپنے کیے کا رنج ہوا اور تلافی کے طور پر اُس نے بیرم خان کے کم سن بیٹے عبدالرحیم کی محل میں بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ یہ بچہ آگے چل کر خانِ خاناں کے نام سے مشہور ہوا۔

ایک بار عبدالرحیم خانِ خاناں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ رات کو کسی جنگل میں پڑاؤ ڈالا تو شب کے سناٹے میں دفعتاً ایک بہت خوبصورت صدا گونجی۔ کوئی فارسی رُباعی پڑھ رہا تھا جس کا ایک مصرعہ یوں تھا:

منم کہ ہر جا رسید خیمہ زد او بارگاہ ساخت

یعنی بادشاہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے، اُس کا خیمہ لگتا ہے اور دربار سج جاتا ہے۔ خانِ خاناں نے سپاہیوں سے کہا کہ صدا لگانے والے اُس آدمی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ وہ دراصل ایک فقیر تھا۔ جب وہ پیش ہوا تو خانِ خاناں نے اشرفیوں کی ایک تھیلی اُسے دے کر رُخصت کر دیا۔ اگلی رات جنگل کے سناٹے میں پھر وہی صدا گونجی اور خانِ خاناں نے خوش ہو کر دوبارہ اس فقیر کو اشرفیوں کی ایک تھیلی سے نوازا۔ تیسری شب بھی ایسا ہی ہوا۔ چوتھی رات فقیر کی آواز سنائی نہ دی۔ سپاہی اُس کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آئے تو خانِ خاناں نے کہا:

''یہ فقیر تو بڑا ہی کم ظرف نکلا۔ اشرفیوں کی تین تھیلیوں پر ہی ٹل گیا۔ حالانکہ میں نے ہر پڑاؤ کے حساب سے ایک تھیلی اس کے لیے مختص کر رکھی تھی۔''

ربِ تعالیٰ سے جب مانگیں تو اُس فقیر کی طرح مت کریں کہ اشرفیوں کی تین تھیلیاں لے کر ہی ٹل جائیں۔ ربِ تعالیٰ سے بے حساب مانگیں لیکن وہ چیز مانگیں جس سے وہ کراہت نہ کھاتا ہو۔

ایک بار آپ ﷺ مدینہ شریف میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں قبرستان میں ایک مردہ گلی سڑی بکری کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ سے دریافت کیا کہ ''تم میں سے کون یہ بکری خریدنا چاہے گا؟''

صحابہؓ نے فرمایا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! یہ بکری جو اس قدر گل سڑ چکی ہے کہ اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں، اس کو بھلا کون لینا چاہے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''سمجھ لو کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا کی حیثیت ایسی ہی ہے جو تمھارے نزدیک اس گلی سڑی بکری کے ایک بال کی۔''

افسوس! ہم اللہ تعالیٰ سے وہ چیز مانگنا چاہتے ہیں جس کو اس قدر حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے وہ کیوں نہیں مانگتے جو اُس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہم اللہ سے اُس کا رحم، اُس کی رحمتیں، اُس کا فضل و کرم مانگ سکتے ہیں، اُس کی بخشش، اُس کا قرب اور اُس کی دوستی مانگ سکتے ہیں اور اس سے دو ہاتھ آگے جانا چاہیں تو ربِ تعالیٰ سے اُس کے شایانِ شان کچھ مانگیے اور اُس کے شایانِ شان تو بس خود اُس کی اپنی ذات ہے تو آپ اُس سے اُس کی ذات کیوں نہیں مانگ لیتے کہ یا اللہ تعالیٰ! تو اپنا آپ ہمیں عطا فرما دے۔

سوال: اللہ کی صفت "کریم" کو بیان کر دیجیے۔

جواب: لندن میں ایک نوجوان نے مجھ سے سوال پوچھا کہ ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ منصف ہے اور دوسری طرف اُسے رحیم و کریم بھی کہتے ہیں کہ وہ روزِ قیامت ہمیں بخش دے گا۔ دونوں میں سچ کیا ہے؟

یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا کہ جب بروزِ قیامت انسان کے اعمال کی بنیاد پر انصاف ہوگا تو اُس میں ظلم اور رحم کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ بروزِ قیامت جب رب تعالیٰ اپنی کرسی پر بیٹھے گا تو وہ منصف ہوگا اور انسان کے نامۂ اعمال کی بنیاد پر بغیر رتی برابر زیادتی یا رُو رعایت کے سزا و جزا سنا دے گا۔ جب وہ فیصلہ کر چکے گا تب اُس کی شانِ کریمی جوش میں آئے گی اور وہ لوگوں کی سزائیں معاف کر دے گا۔ Consideration بہت سی بنیادوں پر ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ ہم اُس کے حبیب ﷺ کی اُمت ہیں یا پھر کسی نے صرف رب کے نام کی لاج رکھ کر اپنا تن من دھن سب قربان کر دیا۔ اِسی طرح مختلف Considerations کی وجہ سے وہ معاف فرما دے گا۔ یوں رب تعالیٰ منصف اور کریم ہونے کی صفات خوبصورتی سے نبھاتا ہے۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر بتاتا چلوں کہ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ کرم اللہ وجہہ کے الفاظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دل میں ہر وقت "یا کریم" کا ورد فرماتے تھے۔ اُن کی انگوٹھی پر بھی "یا کریم" کا لفظ کندہ تھا اس لیے اُنھیں کرم اللہ وجہہ کہا جاتا ہے۔

امام ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ نے الفتاوی الحدیثہ اور الصواعق المحرقہ میں فرمایا ہے:

خلاصہ: آپ کو کرم اللہ وجہہ الکریم (اللہ عزوجل آپ کو کسی اور کے سامنے سر جھکانے کی ذلت سے محفوظ رکھے) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے کبھی غیر خدا کو سجدہ نہیں کیا، اور یہ فضیلت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہے۔ مگر چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بچپن آپ ﷺ کے ہاں گزرا اور آپ کا بت پرستی سے محفوظ ہونا بہت مشہور ہے، اِس لیے یہ کلمہ زیادہ تر آپ کے لیے بولا جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے لکھا:

حضرت مولیٰ نے حضور مولی الکل سید الرسل ﷺ کے کنارِ اقدس میں پرورش پائی، حضور ﷺ کی گود میں ہوش سنبھالا، آنکھ کھلتے ہی محمد رسول ﷺ کا جمالِ جہاں آرا دیکھا، حضور ﷺ ہی کی باتیں سنیں، عادتیں سیکھیں۔ تو جب سے اِس جنابِ عرفان مآب کو ہوش آیا قطعاً یقیناً رب عزوجل کو ایک ہی جانا، ایک ہی مانا۔ ہرگز ہرگز بتوں کی نجاست سے اُس کا دامنِ پاک کبھی آلودہ نہ ہوا۔ اسی لیے لقب کریم "کرم اللہ تعالیٰ وجہہ" ملا۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 28، صفحہ 436، رضا فاؤنڈیشن)۔

رب تعالیٰ بے حد مہربان ہے۔ یہ اُس کی شانِ ربوبیت ہے کہ وہ کسی چیز کو دیکھتا ہی نہیں، وہ اُن کی دُعائیں سب سے پہلے سنتا اور اُنھیں دنیاوی مال و آسائش عطا فرماتا ہے جو اُسے سرے سے مانتے ہی نہیں۔

بھولے سے ہم اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ شاید دُنیاوی مال و آسائش ہی سب کچھ ہے حالانکہ رب تعالیٰ کے نزدیک تو یہ حقیر چیز ہے۔ رب تعالیٰ کے ساتھ انسان جتنا پیار میں پاگل ہو جائے گا، اُسی قدر وہ رب کے

نزدیک ہو جائے گا کیونکہ جنون میں کوئی ادب آداب، پروٹوکولز یا Rules and regulations نہیں ہوتے۔ آپ جانتے ہیں کہ پینل کوڈ پاگل آدمی پر Applicable نہیں ہے۔ اگر وہ کسی کو قتل کر دے تو دفعہ 302 کے تحت پھانسی کی سزا دینے کے بجائے اُسے پاگل خانے بھجوا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شریعت کی حدود اور حکم ہر ایک پر نافذ ہوتا ہے لیکن ایک پاگل شخص شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اُس کو درے نہیں مارے جاسکتے بلکہ اُس کا علاج کیا جاتا ہے۔

رب تعالیٰ کی بارگاہ میں جنون کی Value زیادہ ہے۔ جو اُس کی محبت میں جتنا پاگل ہوا وہ اُتنا ہی اُس کے قریب ہو گیا۔ لیکن آپ ﷺ کی بارگاہ میں ادب آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہاں مکمل ہوش وحواس اور پوری شائستگی کے ساتھ بہت مؤدب ہو کر حاضری دینی چاہیے کیونکہ وہاں فرشتے بھی مؤدب ہیں۔

رب تعالیٰ تک پہنچنے کے دو راستے ہیں شریعت اور طریقت۔ طریقت کے راستے میں ہم پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دہلیز تھامتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں آپ ﷺ کی دہلیز تک پہنچا دیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کی دہلیز پکڑنے والے کو رب تعالیٰ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

شریعت کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ اسلام ایثار و قربانی کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایثار و قربانی وقت، خواہشات اور آرام و آسائش کی ہو سکتی ہے۔ اس ایثار و قربانی کی راہ پر چل کر ہی انسان شریعت پر عمل پیرا ہو سکتا ہے جو بہت دشوار راستہ ہے۔ اس کو آسان کرنے کے لیے طریقت کا راستہ اختیار کیا گیا۔ طریقت کی راہ میں انسان کسی شخص کو اپنا اُستاد مان لیتا ہے اور اُس کی زیرِ نگرانی اپنی تربیت کرنے لگتا ہے۔ یوں رفتہ رفتہ اچھی عادات سیکھتا اور بُری عادات کو ترک کرتا چلا جاتا ہے۔ جہاں ذرا اُس کا پاؤں پھسلنے لگتا ہے، اُستاد اُسے ایک جھٹکا دیتا ہے کہ غلطی کر رہے ہو، سنبھل جاؤ۔ اُستاد قدم قدم پر اُس کی نگرانی کرتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے وہ شریعت پر عمل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یوں رب تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے۔

پُراسرار بندے

سوال: آپ کی اپنے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب سے ملاقات کیسے ہوئی؟

جواب: ایک روز ایک فوجی افسر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اللہ والے لوگوں کے پاس بہت جاتے ہیں مجھے بھی ایک بہت کمال کا آدمی ملا ہے...... میں نے کہا ''مجھے بھی ملوا دیں اُن سے۔'' وہ بولے ''اُن سے اجازت لیے بغیر ملاقات ممکن نہیں۔'' تین چار روز بعد اجازت لینے کے بعد جب ہم اُن صاحب کے پاس پہنچے تو وہ قبلہ سید یعقوب علی شاہ صاحب تھے۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا جو اُن کا ڈرائنگ روم، لاؤنج، بیڈروم، سٹور اور کچن بھی تھا، اُس میں وہ رہائش پذیر تھے۔ اُن کے بارے میں مجھے ڈرایا گیا تھا کہ وہ بہت جلالی آدمی ہیں، کسی کو فالتو بات نہیں کرنے دیتے لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مجھے بہت محبت سے ملے اور بغیر یہ پوچھے کہ میں کس مقصد کے تحت وہاں آیا ہوں، چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ آپ ہر روز وضو کرتے ہوئے یہ لفظ پڑھ لیا کریں اور احتیاط یہ کریں کہ اِس کے بعد دُعا نہ مانگیں۔

اب ہم انگریزی تعلیم کے مارے ہوئے اور صبح وشام چالیس بیالیس لمبے لمبے وظائف پڑھنے کے عادی تھے...... دل میں سوچا کہ بھلا اِس ایک لفظ کو پڑھنے سے کیا ہوگا۔ اُسی سوال میں اُلجھا اُلجھا جب وہاں سے اُٹھنے لگا تو انھوں نے کہا، ''بیٹھ جایئے آپ۔ آپ جو بھی وظائف پڑھتے ہیں، سب چھوڑ دیجیے۔'' چونکہ مجھے طویل عرصہ سے اُن وظائف کو پڑھنے کی عادت تھی اِس لیے چھوڑنے کو دل نہ مانتا تھا لہٰذا میں نے اُن سے سوال کیا ''اُن سب کو چھوڑ کر کیا پڑھوں؟''

کہنے لگے ''یہی جو لفظ میں نے بتایا ہے۔'' میں نے کہا میں عموماً دن میں ایک بار ہی صبح کے وقت وضو کرتا ہوں...... اس کے بعد بہت ضرورت پڑے تو شام کو وضو کر لیتا ہوں یوں Virtually چوبیس گھنٹوں میں ایک وضو کرتا ہوں۔ اُس وضو کے دوران زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ بار یہ لفظ پڑھ لوں گا...... تو کیا یہ کافی ہے؟''

کہنے لگے ''ہاں! یہ بھی بہت ہے۔''

تین روز تک تو میں نے صبر کیا اور بغیر دُعا مانگے وضو کے دوران وہ لفظ پڑھتا رہا۔ لیکن چوتھے روز میں نے سوچا کہ دُعا مانگ کر تو دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ جب اُس کے بعد نماز پڑھی اور پھر دُعا کے لیے

ہاتھ اُٹھائے تو ہاتھوں کے اندر ایک فلم چلتی دکھائی دی۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔ اُس کا کچھ حصہ مقبرہ جہانگیر اور کچھ حصہ شالامار باغ سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے سوچا کہ بچپن میں چونکہ میں نے یہ مقامات دیکھ رکھے ہیں اس لیے ذہن میں کچھ ایسا خیال آ رہا ہے۔ لیکن جب تھوڑا سا غور کیا تو پتا چل گیا کہ یہ کون سی جگہ ہے بڑی خوشی ہوئی کہ صاحب جیتے جی وہاں پہنچ گئے اور سیر بھی کر لی۔

بڑے شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور اُن سے یہ واردات بیان کی۔ اُنھوں نے تعجب سے تفصیلات دریافت کیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا سب بتا دیا۔ جب اُنھوں نے دو تین بار مجھے تفصیلات (Details) دہرانے کا کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ Verify کر رہے ہیں کہ کہیں میں عقل سے گھڑ کر تو یہ سب نہیں بتا رہا اور کیا میں نے کوئی ایسا منظر سچ مچ دیکھا ہے۔ میرے ایک ہی جواب پر وہ مراقبہ میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد چہرہ اوپر اٹھا کر بولے ''اتنی جلدی ایسا ہوا تو نہیں کرتا'' یہ کہنے کے بعد دوبارہ مراقبہ میں ڈوب گئے۔ پھر سر اُٹھا کر بولے ''کیا تم نے دُعا مانگی تھی؟'' میں نے کہا ''جی! تین روز تک تو میں نے صبر کیا، چوتھے روز سوچا کہ دُعا مانگ کر تو دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے؟'' میرا یہ جواب سن کر بڑے شاہ صاحب بگڑ گئے اور بولے ''بھاگ جاؤ یہاں سے! اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

یوں لفظوں کے ڈنڈے کھا کر میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے چلا آیا کہ یہ بھی عجیب شخص ہے۔ اُنھی دنوں میرا ایک ذاتی کام کچھ اٹکا ہوا تھا اور میں اکثر عشاء کی نماز کے بعد ایک مخصوص دُعا مانگا کرتا تھا۔ ایک روز عشاء کی نماز اور وظائف سے فارغ ہونے کے بعد جانماز پر بیٹھا تھا کہ بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے بڑے شاہ صاحب کی شکل دکھا کر کہنے لگے ''اُن سے دُعا کروالو، کام بن جائے گا۔'' میں نے دل میں سوچا کہ یہ بندہ تو پاگل ہے۔ اِن سے میں کیا دُعا کراؤں گا۔ (اللہ مجھے معاف فرمائے، اُن دنوں میں بس ایسا ہی تھا۔)

دو تین دن بعد عشاء کی نماز کے بعد جب میں دُعا مانگ رہا تھا تو بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے اور کہنے لگے ''ان سے دُعا کروالو تمھارا کام ہو جائے گا۔'' میں پھر ٹال گیا۔ تیسری بار وہ پھر تشریف لائے اور بڑی تاکید سے کہا ''اُن سے دُعا کرا لو تمھارا کام فوراً ہو جائے گا۔''

اِس پر میں نے مجبوراً بڑے شاہ صاحب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اگلے دن میں آفس سے اُٹھا اور اُن کے پاس جا پہنچا۔ پوچھنے لگے ''یہاں کیسے آئے؟'' میں نے کہا حضور! اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔'' بولے ''کر لیا سلام؟'' میں نے کہا ''جی۔'' کہنے لگے۔ ''بس جاؤ پھر۔'' تب میں نے دل میں سوچا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ پاگل ہے یہ آدمی، سو اُٹھ کر چلا آیا۔ لیکن اندر چونکہ بے چینی تھی اس لیے اگلے روز پھر اُن کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے پوچھا ''ہاں! آج کیسے آئے؟''

میں نے جواب دیا ''اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا، آپ سے ایک کپ چائے پی جائے۔'' بڑی محبت سے بولے ''ہاں، ضرور پیو۔'' مجھے بٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دی۔ جب میں نے چائے پی لی تو کہنے

لگے "اب جاؤ۔" میں نے سوچا عجیب آدمی ہے یہ۔ میں پھر اُٹھ کر چلا آیا۔ اگلے روز دوبارہ اُن کے پاس جا پہنچا۔ کہنے لگے "آج کیسے آئے ہو؟" میں نے سوچا، آج تو میں اِن کے ہاتھوں نہیں پھنسوں گا۔ وہ خود ہی بولے "کیا کوئی کام ہے؟" میں نے کہا "جی! لیکن میں عرض کردوں کہ میں خود سے آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات ہوئی تھی تو اُنھوں نے تاکید کی تھی کہ آپ سے دُعا کراؤں گا تو میرا کام ہوجائے گا۔"

میری بات سن کر اُن کی آنکھیں اُبل کر باہر کو آ گئیں اور کہنے لگے "وہ کون ہوتا ہے راز کھولنے والا! اُسے تو میں آج رات سیدھا کروں گا" تھوڑی دیر بعد وہ Cool down ہوگئے اور مجھے تاکید کی کہ فلاں دن ٹھیک اتنے بجے میرے پاس آجانا۔ جب میں اُس مقررہ دن اُن کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے کلائی سے گھڑی اُتار کر سامنے رکھ لی اور باتیں کرنے لگے۔ جونہی وہ خاص وقت ہوا تو اُنھوں نے مجھے ایک لفظ پڑھنے کو بتایا۔ میں نے کہا "یہ ایک لفظ پڑھنے سے کیا مجھے کشف و کرامات حاصل ہوجائیں گی، سیر ہوجائے گی؟" کہنے لگے "ہوجائے گی۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اُن کا ایک ہی فقرہ تھا "ہاں!" "ہوجائے گا!" میں نے دل میں سوچا کہ آخر اِس ایک لفظ میں ایسی کیا بات ہے کہ جس سے سب کچھ ہوجائے گا۔ میں نے پوچھا" حضور! یہ لفظ کتنی بار روزانہ پڑھنا ہے؟" اُنھوں نے جو تعداد بتائی اُسے سن کر میں غش کھا کر گرنے والا ہوگیا (تعداد آپ کو نہیں بتا سکتا)۔ اُس کا پہلا دور سو مہینے کا تھا۔ اِس کے بعد وہ پڑھائی Reduce ہوکر ایک چوتھائی رہ گئی۔ میں نے کہا "اِس کو پڑھنے میں روزانہ کتنا ٹائم لگے گا؟" کہنے لگے "تمھارا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ مجھے پندرہ منٹ لگتے ہیں۔" میں نے حیرت سے دریافت کیا "اتنی ہزار بار آپ صرف پندرہ منٹ میں پڑھ لیتے ہیں؟" بولے "ہاں۔" میں نے سوچا چلو! مجھے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگ جائیں گے۔

میں نے عنایت اللہ والوں سے ٹک ٹک والی تسبیح لی۔ اگلے روز لنچ کے وقفے میں زندگی میں پہلی بار آفس سے گھر چلا آیا تاکہ نماز ظہر اور یہ وظیفہ پڑھ سکوں۔ نماز کے بعد جب وہ لفظ پڑھنا شروع کیا تو تعداد مکمل کرتے کرتے مغرب ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ لو بھئی! اِس لفظ کی پہلی برکت تو یہی نظر آتی ہے کہ اب نوکری ہاتھ سے گئی کیونکہ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھوں گا تبھی اِتنی لمبی تسبیح پڑھ سکوں گا۔ خیر، میں نے تسبیح نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور آہستہ آہستہ دورانیہ گھٹتے گھٹتے 45 (پینتالیس) منٹ رہ گیا۔ رفتار تیز ہونے کی وجہ سے جاپانی Counter کے گیئر چودہ پندرہ دن میں جب کہ تائیوانی Counter کے گیئر ایک ہی دن میں گھس جاتے ہیں۔ اِس لفظ کو پڑھنے کے ٹھیک ڈھائی سال بعد کشف جاری ہوگیا پھر کچھ اور چیزیں بھی عطا ہوئیں۔

ایک روز قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے جو گزشتہ چودہ پندرہ سال سے اُن کے پاس آرہے تھے۔ اُن کے سامنے انھوں نے اعلان کردیا کہ میں نے آج سے اپنی جیب سرفراز کو دے دی۔ پھر ایک روز بیٹھے بیٹھے معتقدین سے کہنے لگے کہ "سرفراز میرا بیٹا ہے۔" اس کے کچھ عرصہ بعد ایک روز یوں گویا ہوئے "میرے مرشد کے ایک ہی خلیفہ تھے اور میرا بھی ایک ہی خلیفہ ہے سرفراز ....." یوں مجھے خلافت عطا ہوگئی۔

سوال: رب کی عبادت کا خوبصورت طریقہ کون سا ہے؟

جواب: آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں، ایک شخص دروازہ کھولتا ہے اور کہتا ہے..... السلام علیکم، آپ ٹھیک ہیں؟ میرے لائق کوئی خدمت؟

وہ روز اسی طرح کرتا ہے حتیٰ کہ ایک روز آپ اُس سے پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بھائی! کیا کوئی کام ہے مجھ سے؟ وہ کہتا ہے، جناب! میں تو آپ کی محبت میں آپ کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ وہ اپنا معمول جاری رکھے ہوئے ہے۔ کسی روز آپ دوبارہ اُس سے دریافت کرتے ہیں کہ بھائی! کوئی کام ہے تو بتاؤ۔ اس بار بھی اُس کا جواب یہی ہوتا ہے کہ حضور! میں تو آپ کی زیارت کے لیے آتا ہوں۔ تب اُس کی اُس محبت کی وجہ سے آپ اپنے گھر والوں کو تاکید کرتے ہیں کہ اِس کا خیال رکھا کرو، اِس کی کوئی ضرورت ہو تو اِس کا دھیان کرنا۔

اِس کے برعکس ایک آدمی آپ کے پاس آتا ہے، دروازہ کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔ اِس کے فوراً بعد فرمائش کرتا ہے کہ ذرا دس روپے تو دیجیے گا۔ اگلے روز وہ سلام کرنے کے بعد بیس روپے مانگتا ہے اور اِس عادت کو معمول بنا لیتا ہے۔ ایک دن آئے گا کہ آپ اُس کے اِس رویے سے چڑ جائیں گے کہ اِس نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے۔

اگر رب تعالیٰ کو اِس لیے یاد کریں کہ آپ اُس سے پیار کرتے ہیں اور اُس کی عبادت اِس لیے کریں کہ وہ رب ہے اور لائق عبادت ہے تو پھر رب تعالیٰ آپ کی ضروریات کا از خود خیال کرے گا۔ لیکن اگر آپ یہ سوچ کر نماز پڑھتے یا کوئی وظیفہ کرتے ہیں کہ اِس سے آپ کی کوئی حاجت پوری ہو جائے گی، تو اِس طرح آپ کا کام تو ہو جائے گا لیکن پھر رب آپ کو نہیں ملے گا کیونکہ آپ نے تو رب تعالیٰ کے ساتھ Contract کیا تھا کہ میں تیری عبادت کروں گا تو میرا فلاں کام کر دینا۔

آپ رب تعالیٰ کی عبادت اِس نیت سے نہ کیجیے کہ اُس سے آپ کی فلاں مشکل حل ہو جائے بلکہ اُسے رب اور لائق عبادت سمجھ کر اُس کی عبادت کریں تب وہ آپ کو پوری طرح Look after کرے گا۔

بڑے شاہ صاحب نے مجھے وضو کے دوران جو لفظ پڑھنے کو بتایا تھا وہ دراصل اسم اعظم تھا۔ ایک روز انھوں نے مجھے بتایا ''میاں! تمھاری شکل تو مجھے بہت عرصہ پہلے دکھا کر بتا دیا گیا تھا کہ تمھارا حصہ میرے پاس ہے اور میں اُس وقت سے تمھارے انتظار میں تھا اس لیے تمھیں چھوٹتے ہی وہ لفظ دے دیا تھا لیکن تم نے وہ ضائع کر دیا۔'' میں نے کہا ''سرکار مجھے اِسم اعظم سے کیا لینا دینا۔ میں نے کون سا اُس کی مدد سے کوئی دُنیاوی کام لینے تھے۔'' اللہ نے اچھا ہی کیا کہ مجھے اُس سے بچا لیا۔ میں خود بھی اکثر لوگوں کو تسبیحات پڑھنے کے بعد دُعا کرنے سے منع کر دیتا ہوں تا کہ تسبیح مزدوری کی شکل اختیار نہ کرنے پائے بلکہ عبادت ہی رہے۔

انسان کے پاس دُعا کے لیے Option ہے، وہ چاہے تو اِس سے دُنیا جیسی حقیر چیز مانگ لے اور چاہے تو وہ مانگ لے جس کا رب تعالیٰ نے وعدہ نہیں کیا..... رب تعالیٰ سے اُس کا فضل، اُس کا کرم، اُس کا رحم، اُس کی رحمتیں اور سب سے بڑھ کر اُس کی ذات مانگ لے۔

سوال: آپ سید یعقوب علی شاہ صاحب کے پاس کس نیت سے گئے تھے؟

جواب: میں دُنیاوی کام کروانے کے لیے اِسمِ اعظم جاننے میں Interested نہیں تھا البتہ علم کی جستجو مجھے بہرحال تھی۔ اِسی لیے تو میں اہلِ علم ونظر کی تلاش میں رہتا تھا۔

رب تعالیٰ نے انسان کی Destiny (قسمت) Set کی ہے۔ یہ قضا وقدر کا معاملہ کہلاتا ہے۔ دوسری چیز وہ ہے جو انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ رب تعالیٰ کو تو پتا ہے کہ انسان اس قضا وقدر یا اپنی محنت کے نتیجہ میں کس سمت کو جائے گا اس لیے جہاں سے اُسے علم ملنا ہوتا ہے وہاں صاحب علم کو اُس کی شکل پہلے سے دکھا دی جاتی ہے۔ جونہی وہ شخص وہاں پہنچتا ہے، صاحب علم کو پتا چل جاتا ہے کہ اُس کی Training کس انداز سے کرنی ہے۔

سوال: کیا سید یعقوب علی شاہ صاحب نے آپ کو کوئی خاص علم عطا فرمایا تھا؟

جواب: میری وائف کے فرسٹ کزن ڈاکٹر زاہد کے دوست حکیم رحمت الٰہی صاحب (جو حکیم سعید کے فرسٹ کزن ہیں) ایک روز میرے پاس آئے اور بڑے شاہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ حکیم رحمت الٰہی بھلے آدمی تھے، اللہ تعالیٰ نے اُنھیں یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ زبان کی مٹھاس کی وجہ سے ہر ایک کے دل میں گھر کر جاتے تھے۔ بڑے شاہ صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد وہ اکثر و بیشتر دن بھر اُن کے پاس بیٹھے رہتے۔ ایک دو بار جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ بڑے شاہ صاحب اُنھیں کوئی Calculations سمجھا رہے تھے۔ حکیم رحمت الٰہی نے جب اُن Calculations کا جواب بڑے شاہ صاحب کو بتایا تو اُنھوں نے اس کی Correction کی۔ تب میرے ذہن میں ایک بہت ہی گھٹیا خیال آیا کہ بڑے شاہ صاحب نے مجھے بیٹا بھی بنایا ہوا ہے، جیب بھی عطا کی ہے، خلیفہ بھی بنایا ہے، مجھے تو ایک لفظ بتا کر ٹرخا دیا جب کہ حکیم صاحب کو یہ سارا حساب کتاب سکھا رہے ہیں...... دو تین بار اُن دونوں کو اس حساب کتاب میں اُلجھے دیکھ کر مجھے یہی خیال آیا لیکن میں احتراماً کچھ بولتا نہیں تھا۔ جب تیسری بار یہ سوچ میرے ذہن میں آئی تو بڑے شاہ صاحب نے اُسے Read کر لیا۔ جب حکیم رحمت الٰہی صاحب وہاں سے رُخصت ہو گئے تو شاہ صاحب مجھے کہنے لگے "دیکھو میاں! ہم فقیر ہیں، ہمارے پاس جو آدمی جس نیت سے آتا ہے، ہم اُسے وہی علم دیتے ہیں۔ تمھاری

جب کہ جو علم تمھارے پاس ہے، اُس کی وجہ سے تم آسمان کی طرف نگاہ اُٹھاؤ گے تو دیکھ کر بتا دیا کرو گے کہ کہاں پر کیا چیز ہے؟'' اُن کی یہ بات سن کر میں نے ہنس کر کہا ''حضور! اب تو یہ علم پھر ایک وقت میں دو آدمیوں کے پاس ہو گیا ایک آپ، دوسرے میرے پاس۔'' میری اس بات پر اُن کا لہجہ فوراً سخت ہو گیا...... کہنے لگے'' یہ تمھاری غلط فہمی ہے، تم اس علم کے عروج پر اُس وقت پہنچو گے، جب مجھے دفن کر کے 72 قدم چلنے کے بعد دُعا کرو گے۔'' بعد ازاں واقعی ایسا ہی ہوا۔ جب بڑے شاہ صاحب کا وصال ہوا، وہ اگست کا مہینا تھا، بہت تیز بارش برس رہی تھی۔ اُن کو سپردِ خاک کرنے کے بعد 72 قدم چل کر جب میں نے دُعا پڑھی تو ایک دم مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا وزن بے تحاشا بڑھ گیا ہے۔ بعد میں مختلف حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ علم کے عروج کے حوالے سے کی جانے والی اُن کی بات واقعی صحیح تھی۔

سوال: سنا ہے آپ کو تین خلافتیں عطا ہوئیں؟

جواب: جیسا کہ بڑے شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ تمھاری ہمت ہے کہ جتنی محنت کرتے جاؤ گے، اُتنا آگے بڑھتے جاؤ گے۔ شاید مجھے یہ Advantage حاصل ہے کہ چہرے ہی سے یتیم دکھائی دیتا ہوں۔ جتنے بھی اولیائے کرام ہیں شاید میری اس یتیمی پر ترس کھا کر مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ بڑے شاہ صاحب کی زندگی ہی میں مجھے داتا صاحب سے لو لگ گئی تھی۔ میں روزانہ دفتر سے گھر آتا، لباس تبدیل کرتا اور مغرب کے بعد داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتا۔ وہاں فاتحہ خوانی کرتا، قرآن پاک پڑھتا، سلام عرض کر کے اجازت طلب کرتا اور واپس چلا آتا۔ وہ مہربانی فرماتے تو ملاقات ہو جاتی یا ہم اُن کی محفل دیکھ لیتے۔ اُن کی محافل میں بڑی بڑی ہستیوں کو دیکھ کر میری آنکھیں داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مقام جان کر کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔

ایک روز میں گجرات میں ایک کانفرنس Chair کر رہا تھا۔ اچانک کشف جاری ہو گیا اور داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہو گئی۔ فرمانے لگے ''فوراً میرے پاس پہنچو۔'' میں نے کانفرنس ادھوری چھوڑی اور اپنے نمبر 2 کو اُسے Chair کرنے کی ہدایات دے کر لاہور پہنچا۔ لباس تبدیل کر کے جب ضلع کچہری کے پاس آیا تو وہاں حضرت امام حسینؓ کے چہلم کی وجہ سے کرفیو لگا ہوا تھا۔ آنسو گیس کی Smell (بو) ہر طرف پھیلی تھی۔ میں SSP آفس کی طرف Divert ہو گیا لیکن اُدھر کا راستہ بھی بلاک تھا۔ میں نے اپنی

یہیں سے میری حاضری قبول کر لیجیے۔ جب میں نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو کشف جاری ہو گیا اور داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ فاتحہ ختم کرنے کے بعد Left side پر چار چھ قدم چلنا۔ وہاں ایک Fence لگی ہے جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ اُس میں سے گزرو گے تو فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔

جب میں حسب ہدایت Fence سے گزرنے لگا تو وہاں موجود حوالدار نے مجھے بازو سے پکڑ کر پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کہا'' داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس۔'' بولا'' جلدی سے چلے جائیں، کوئی دیکھنے نہ پائے۔'' جیسے ہی وہاں سے گزرا تو داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حضور جا کھڑا ہوا۔ داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ مجھے محفل میں لے گئے جس میں بہت بلند پایہ اولیاء اللہ بیٹھے تھے۔ داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک طشت منگوایا جس میں ایک دستار رکھی تھی۔ اُنھوں نے اپنے دستِ مبارک سے وہ دستار میرے سر پر رکھ دی اور فرمایا کہ آج سے تمھیں خلافت مل گئی۔ اگلے سال جب میں وہاں حاضر ہوا تو اُنھوں نے یہ خلافت Announce کرنے کی اجازت دے دی۔ یوں سلسلہ اویسیہ جنیدیہ کی خلافت مجھے عطا ہو گئی۔ اس خلافت کے ملنے کے بعد مجھے کچھ پڑھائیاں عطا ہوئیں۔ اُن میں ایک لفظ ایسا بھی تھا جو سلسلہ قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں پڑھا جاتا ہے لیکن مجھے اُسی لفظ کو پڑھنے کا مختلف انداز بتایا گیا تھا۔ سمجھ نہ آتی تھی کہ یہ انداز کس سلسلہ میں ہے۔ پھر میں محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر خود پوشیدگی کی Urge بہت شدت سے پیدا ہو گئی اور میں شدت سے اِس بات کا مخالف ہو گیا تھا کہ کسی بھی صورت انسان کی عبادات اور اچھے اعمال کسی پر ظاہر ہوں۔

اُنھی دنوں میں ریفریشر کورس سے گزارا گیا۔ تین سال تک مجھے لندن رہنا پڑا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ لفظ جس کی مجھے سمجھ نہیں آتی تھی اُس کا تعلق سلسلہ جنیدیہ سے ہے۔ اُنھی دنوں مجھے یہ پتا چلا کہ سلسلہ جنیدیہ میں یہ احتیاط ہے کہ ہر نیک عمل کو بہت شدت سے چھپایا جائے۔ کسی کو یہ تک نہ خبر ہونے پائے کہ اس شخص نے کبھی اللہ کا نام بھی پکارا ہو گا۔

سلسلہ چشتیہ صابریہ اور جنیدیہ کے علاوہ مجھے تیسری خلافت حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ صاحب سے عطا ہوئی۔ لیکن تین خلافتوں کے باوجود میں اپنے آپ کو صابری کہتا ہوں (اگر کبھی کہنا پڑ جائے۔) کیونکہ اِن تمام

تک بھی Miss نہیں ہوئی۔'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے خاموشی سے اُن کی بات سنی پھر پوچھا'' یہ جو آپ کی انگلی میں انگوٹھی ہے، یہ آپ نے کب سے پہن رکھی ہے؟'' وہ بولے'' جب میں دس گیارہ سال کا تھا تب ایک دوست نے یہ بطور تحفہ دی تھی۔'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' اِس انگوٹھی کو کٹوا کر اُتار لیجیے اور پچھلی تمام نمازوں کی قضا ادا کر لیجیے کیوں کہ انگوٹھی تنگ ہونے کی وجہ سے وضو کے دوران اُنگلی کا یہ حصہ خشک رہتا ہے۔ یوں وضو نہیں ہوتا اور وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

یہ فرق ہے ایک عالم اور ایک فقیر کے نقطۂ نظر میں۔ جب آپ کسی فقیر سے بات کریں گے تو وہ انتہائی دقیق نکات بھی عام فہم زبان اور روزمرہ مثالوں کی مدد سے یوں Explain کرے گا...... آپ کے لیے اُن کو سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا'' دُنیا کا سب سے بڑا فن آسان اور مختصر خط لکھنا ہے۔''

جتنا زیادہ علم رکھنے والا انسان ہوگا اُتنی ہی زیادہ آسان زبان میں وہ گفتگو کرے گا۔ کتاب اللہ بھی یہی کہتی ہے، جوں جوں انسان کا ذہنی اور علمی لیول اُوپر جاتا جائے گا، وہ قرآن کے معانی آسانی سے سمجھنے لگے گا۔ قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے عذاب سے ڈرایا ہے اور مختلف مثالوں کے ذریعے وعید سنائی ہے۔ اُس نے سابقہ اُمتوں پر نازل ہونے والے عذاب کے قصے بیان کیے ہیں۔ رب تعالیٰ نے براہِ راست کہیں نصیحت نہیں کی۔ اُس نے جتنی بھی مثالیں بیان کیں اُن کا تعلق اِسی دُنیاوی زندگی سے ہے۔ اِس لیے فقیر بھی جب گفتگو کرتا ہے تو دُنیاوی زندگی سے مثالیں پیش کرتا ہے اور سہل گفتگو کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک عالم جس قدر زیادہ علم کا مالک ہوگا اُس کی گفتگو اُسی قدر سادہ اور آسان فہم ہوگی جو فوراً دماغ میں اُترتی چلی جائے گی۔

سوال: داتا صاحب کی کتاب کشف المحجوب آسان فہم نہیں لگتی؟

جواب: اگر آپ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی کتاب پڑھیں تو آپ کو اُس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آئے گا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر اولیاءِ کرام کی نسبت زیادہ اساتذہ کرام سے اِکتسابِ فیض و علم کیا۔ آپ کے پاس بہت وسیع اور اعلیٰ پائے کا علم تھا اِس لیے حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مانند آپ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی تمام شاگرد عالم اور اولیاء اللہ تھے۔

چونکہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی گئی تمام کتابیں اعلیٰ پائے کے علما کے لیے تھیں اس لیے

سٹوڈنٹ اُسے آسانی سے سمجھ لے گا۔ اِتنی آسان کتاب سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کم ازکم انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن لیول کے Student ہوں۔ لہٰذا Fault (قصور) MSc لیول کی کیمسٹری کی کتاب کا نہیں بلکہ اُس بچے کا ہے جو پرائمری لیول پر اعلیٰ درجے کی کتاب پڑھنا چاہتا ہے۔

کشف المحجوب واقعتاً بہت آسان کتاب ہے، اِتنی آسان کہ بعض اوقات اِس کی سادگی کھلنے لگتی ہے کہ داتا صاحب نے اِس سے آگے بھی کچھ بیان کیا ہوتا۔

یاد رہے کہ علم کو ہمیشہ زینہ بہ زینہ (Step by step) سیکھنا چاہیے۔ آج اگر میں سدرۃ المنتہیٰ پر گفتگو شروع کردوں تو میری آسان گفتگو آپ کو مشکل لگے گی کیونکہ میرا Starting point ہی مقامِ حیرت ہوگا۔ چونکہ درمیانی Gap (وقفہ) Fill up نہیں ہوا لہٰذا بات ناقابلِ فہم ہو جائے گی...... لیکن جب لاہوت، ہاہوت، جاہوت، وغیرہ سے ہوتے ہوئے مقامِ حیرت سے مقام لاہوت تک قدم بہ قدم تذکرہ ہوگا تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

سوال: ہماری آرزو ہے کہ آپ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہوسکیں؟

جواب: شجاع صاحب! اللہ سے دُعا فرمائیں کہ وہ میرے معاملات ایسے کردے کہ میں چوبیس گھنٹے آپ کی خدمت کرسکوں۔ فی الحال تو وہ مجھے دوڑائے پھرتا تھا۔ جب جی چاہتا ہے وہ مجھے UK لا بٹھاتا ہے اور جب دل چاہتا ہے کراچی لا بٹھاتا ہے۔ الحمد للہ! مجھے اِس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ وہ مجھے بہت سہولتیں دیتا ہے...... ایک لمحے کے لیے بھی کبھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ اس سے میری فیملی لائف یا میرے بچے ڈسٹرب ہو رہے ہیں یا مجھے دوڑ لگانا پڑ رہی ہے۔ الحمد للہ! اللہ کی عنایت سے مجھے یہ گراں نہیں گزرتا کیوں کہ یہ میرے دوست کی عطا کردہ چیزیں ہیں اور دوست کی عطا کردہ ہر چیز ہنسی خوشی قابلِ قبول ہوتی ہے۔

میں کراچی سے جمعہ کو Late evening لاہور پہنچتا ہوں۔ چونکہ فجر کی نماز کے بعد سوتا ہوں اس لیے صبح ساڑھے آٹھ، نو بجے بیدار ہوتا ہوں۔ تب عزیز رشتہ دار ملاقات کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے میرا ظہر کی نماز کا ٹائم شروع ہو جاتا ہے۔ اِس کا دورانیہ ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔ اِس سے فراغت کے بعد دُعا کا سیشن شروع ہو جاتا ہے۔ شام کو دُعا سے فارغ ہونے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ فیملی کا بھی مجھ پر حق ہے لہٰذا

چاہیے۔ جب یہ وقت میں نہیں نکال پاتا تو یہ چیز مجھے تنگ کرتی ہے۔ زندگی میں Time management بہت ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے چوبیس گھنٹوں کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پہلا حصہ اُمورِ مملکت اور ملاقاتیوں کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرا حصہ آپ ﷺ نے اپنی فیملی لائف اور تیسرا حصہ عبادات اور آرام کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ آپ ﷺ کا کوئی فعل ایسا نہیں ہے جو اُمت کے لیے مثال اور اُس پر عمل باعث برکت نہ ہو۔

اگر ہم بھی ٹائم مینجمنٹ سیکھ لیں تو ہماری زندگی سہل ہو جائے گی۔ لیکن میرے Plans میرے دوست احباب کی وجہ سے Defeat ہو جاتے ہیں۔ دوست احباب مجھ پر جو پریشر Build up کرتے ہیں اُس کی وجہ سے مجھے اپنی Activities (سرگرمیاں) Overlap کرنا پڑتی ہیں۔ میں جو واٹر ٹائیٹ کمپارٹمنٹ میں رہ کر ہر کام کو اُس کے مخصوص وقت میں کرنا چاہتا ہوں، دوست احباب کی وجہ سے نہیں کر پاتا۔ اس لیے میرے ساتھ اُوپر جا کر جو بیتتی ہے، میں وہ سوچ کر ہی لرزتا رہتا ہوں۔

دیکھیے! فرض کی پوچھ گچھ سب سے پہلے، پھر واجب اور اُس کے بعد نفل کی ہوگی۔ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ فرض نماز کو قضا کر دیں لیکن سنتوں اور نوافل پر بہت زور دیتے رہیں۔ اِسی طرح آپ کی فیملی آپ کی ذمہ داری ہے۔ رب تعالیٰ کے ہاں اِس بارے میں پرسش ہوگی کہ آپ نے اپنے اہلِ خانہ کے حقوق پورے کیے یا نہیں؟ خدمتِ خلق نفلی عبادت ہے لیکن اس نفلی عبادت کی وجہ سے اگر ہم نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو پھر اللہ کے حضور اُس کا جواب دینا ہوگا۔

1976-77ء میں میرے ایک باس ایئر فورس سے ٹرانسفر ہو کر ہمارے آفس آئے ہوئے تھے۔ اُنہی دنوں ہمارے ایک Colleague زندگی میں پہلی بار فارن Tour پر گئے۔ جب وہ واپس آئے تو ایک میٹنگ کے دوران باس نے Courtesy میں پوچھا کہ کیسا رہا آپ کا فارن ٹور؟ تب جواب میں وہ ایک ہی بات کو Emphasize کر رہے تھے کہ باقی سب کچھ تو ٹھیک لگا لیکن حلال گوشت نہیں ملتا تھا، روز مچھلی کھانا پڑتی تھی۔ ہمارے باس بنیادی طور پر فائٹر پائلٹ ہونے کی وجہ سے قدرے Aggressive تھے، دوسرا Straightforward (صاف گو) بھی تھے۔ جب ہمارے اُن Colleague نے دوسری تیسری مرتبہ بھی یہی جملہ دہرایا تو باس کہنے لگے ''دقت تو ہم سب کو غیر مسلم ملک میں آتی ہے کہ ہمیں وہاں حلال گوشت نہیں ملتا

میں یتیم کا مال ہڑپ کر گیا ہوں تو اُس کا گناہ اور سزا بہت ہے۔ اگر میں نے اپنے پڑوسی کو تنگ کیا، ماں باپ کی نافرمانی کی، بیوی اور اولاد کے حقوق ادا نہیں کر سکا، امانت میں خیانت کر ڈالی، ذاتی مفاد کے لیے سچ کو چھپا گیا جس سے آپ کو نقصان پہنچا...... ان سب کی کڑی سزا مجھے ملے گی۔ اب ایک طرف تو میں یہ سارے کام کر رہا ہوں دوسری طرف یہ کوشش کرتا ہوں کہ 27 رجب کا روزہ مجھ سے Miss نہ ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہم پہلے اُن معاملات پر توجہ دیں جن کے بارے میں روزِ قیامت پرسش ہوگی، اُس کے بعد نفلی عبادات کی طرف آئیں۔

سوال: کیا آخری ایامِ عمر میں قضا نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں؟

جواب: فرض کریں کہ آپ پچپن (55) سال کی عمر میں گزشتہ چالیس پینتالیس سال کی قضا نمازیں ادا کرنا چاہتے ہیں تو ایک طریقہ یہ ہے کہ صدقِ دل سے ہر نماز کے بعد دُعا کریں کہ یا اللہ تعالیٰ! میں نے نمازیں قضا کر کے اپنے اُوپر ظلم کیا۔ یہ بہت شدت کی کوتاہی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ اب میں خلوص دل سے تمام قضا نمازیں ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے اپنی عمر کا بھروسا نہیں ہے۔ قضا نمازوں کو ادا کرنے سے پہلے تیری طرف لوٹ آؤں، تو تو مجھے معاف فرما دینا۔

نشست نمبر 6

جذبے کی روشنی

سوال: (i) کیا نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے؟

(ii) کیا مرحوم کے درجات کی بلندی کی دُعا کی جاسکتی ہے؟

جواب: (i) تکبیرِ اولیٰ سے پہلے ہم نیت کرتے ہیں۔ یہ نیت ہم زبان سے کریں یا نہ کریں، نماز ہو جائے گی کیونکہ نماز کی ادائیگی سے پہلے ہم ارادہ کرتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز پڑھوں گا۔ اب میں جانماز پر قبلہ رُو کھڑے ہو کر نیت کے الفاظ زبان سے نہ بھی دہراؤں اور نماز ادا کرلوں تب بھی میری ظہر کی نماز ہو جائے گی البتہ نیت کے الفاظ زبان سے ادا کرلینا افضل ہے۔

اسی طرح گھر سے نکلتے ہوئے چونکہ آپ کی نیت قائداعظم کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کی تھی اس لیے مزار پر کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کے بعد آپ ایصالِ ثواب کے الفاظ نہ بھی دہرائیں تب بھی اِس کا ثواب قائداعظم کی روح کو پہنچ جائے گا۔

(ii) مرحوم کے درجات کی بلندی کی دُعا کرنا اچھی بات ہے لیکن مرنے والا اپنی زندگی میں حقوق العباد کی ادائیگی میں کیسا تھا، درجات اِس کے ساتھ منسلک ہیں۔ دُعا بہرحال کرتے رہنا چاہیے۔

سوال: اگر کوئی شخص اذیت اور تکلیف دے تو کیا اُس کے لیے بد دُعا کی جاسکتی ہے؟

جواب: رب تعالیٰ کے نزدیک بد دعا کوئی قابلِ ستائش عمل نہیں۔ رب تعالیٰ تو زبان کے بجائے دل سے اُٹھنے

ایک محفل میں آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور چند دیگر صحابہ کرامؓ تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آیا اور بلاوجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے نقط باتیں سنانے لگا۔ وہ بڑے تحمل سے سب چپ چاپ سنتے رہے اور آپ ﷺ مسکراتے رہے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ضبط جواب دے گیا اور اُنھوں نے اُس شخص کی کسی بات کا جواب دے دیا جس پر آپ ﷺ چپکے سے اُٹھے اور وہاں سے رُخصت ہوگئے۔

دوسرے دن صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا ''یا رسول اللہ ﷺ! کل وہ شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ناجائز بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خاموش تھے اور آپ ﷺ مسکرا رہے تھے لیکن جیسے ہی اُنھوں نے پلٹ کر اُس شخص کی بات کا جواب دیا آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے آئے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا ''جب تک حضرت ابوبکر صدیقؓ اُس شخص کی ناروا باتوں کو خاموشی سے سن رہے تھے تب تک اللہ تعالیٰ نے وہاں ایک فرشتہ مامور کیا ہوا تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جگہ اُس شخص کی باتوں کا جواب دے رہا تھا جس پر میں مسکرا رہا تھا لیکن جیسے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب دینا شروع کیا اللہ تعالیٰ نے وہ فرشتہ Withdraw کر لیا جس پر میں وہاں سے چلا آیا۔''

انسان بددُعا اُس وقت دیتا ہے جب وہ بدلہ تو لینا چاہتا ہے لیکن اِس قابل نہیں ہوتا۔ تب وہ کمزور کا حربہ استعمال کرتا ہے اور بددُعا دیتا ہے لیکن بہترین رویہ تو یہ ہے کہ کسی طرف سے جتنی بھی زیادتی ہو جائے، آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک سچی مسکراہٹ سے اُس کا جواب دے دیا جائے۔ ایسے آدمی سے ڈریے کیونکہ اُس کا بدلہ قدرت خود لیتی ہے Sooner or later۔ ایسے شخص کو میں نے کبھی Spare ہوتے نہیں دیکھا۔

قدرت کے ذریعے جب ایسی چیز آتی ہے تو The person pays through his nose۔ یاد رکھیے! مومن موم کی طرح نرم اور فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے۔ صاحبِ ایمان اپنوں کے لیے موم کی طرح نرم ہے۔ کوئی مسلمان اگر اُسے ذاتی نقصان یا تکلیف پہنچاتا ہے تو وہ اُسے معاف کر دیتا ہے۔ جو لوگ اللہ کے قریب ہیں وہ دوسروں کو اُن کے قصور کرنے سے پہلے ہی معاف کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن یہی مومن جب جنگ میں کافر کے رُوبرو ہوتا ہے تو چٹان کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ وہاں وہ لچک نہیں دکھاتا۔ دشمن جب

زیادتی کو روکنے کے لیے اپنے پڑوسی کی سپورٹ میں کھڑا ہو جاؤں۔

آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا اُن میں سے بڑی اکثریت اُن لوگوں کی تھی جن کا شمار معاشرے کے پسے ہوئے افراد میں ہوتا تھا۔ اسلام قبول کرنے پر اُن کے آقاؤں نے اُن پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ تب رب تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا کہ جب ظلم حد سے گزرنے لگے گا تو میں تمھاری مدد کو آؤں گا۔ قرآن پاک چونکہ رہتی دُنیا تک کے لیے پیغام ہے اس لیے یہ فارمولا آنے والے تمام وقتوں کے انسانوں کے لیے ہے۔

سوال: کیا غیر مسلم دشمنوں کے ساتھ ہر حال میں سختی روا رکھی جائے گی؟

جواب: غیر مسلم دشمنوں کے ساتھ سختی اُسی وقت ہے جب وہ آپ کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیں۔ لیکن اگر وہ اطاعت قبول کرلیں، جزیہ دے دیں اور بطور اقلیت ہمارے ملک میں رہنے لگیں تو پھر ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اُن کے عقیدے کے خلاف کچھ بول کر اُن کا دل نہ دکھائیں۔ اُن کے جھوٹے معبودوں کو بُرا نہ کہیں تاکہ وہ ہمارے سچے رب کو بُرا نہ کہیں۔ ہم اُن کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں۔ اُنھیں مذہبی آزادی دیں لیکن تبلیغ کی اجازت نہ دیں۔

سوال: (i) کیا خودکش حملے جائز ہیں؟

(ii) ٹونی بلیئر کی طرح کچھ لوگ بہت سے سکینڈلز کے باوجود کامیاب اور پسندیدہ ٹھہرتے ہیں ایسا کیوں؟

جواب: (i) اسلام میں خودکشی کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ اِس کے برعکس اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور شہید ہونا پسندیدہ ہے۔ آپ صرف اُسی کے ساتھ لڑیں گے جو آپ کے خلاف ہتھیار اُٹھاتا ہے۔ Civilians (شہریوں) کے خلاف مسلح حملہ کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ یہی حملے امریکی، اسرائیلی یا کسی اور فوج پر اُس وقت کریں جب وہ آپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تو یہ جوابی کارروائی پسندیدہ عمل ہے۔

ایک پروفیسر صاحب سڑک کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں کولہو دیکھا کہ بیل بغیر کسی آدمی کی نگرانی کے اپنے دائرے میں گھوم رہا ہے اور کولہو چلتا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے کولہو کے ساتھ موجود گھر کے دروازے پر دستک دی۔ صاحب خانہ باہر آئے تو پروفیسر صاحب نے پوچھا ''اگر یہ بیل چلنا بند کردے تو آپ کو گھر بیٹھے

قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو بہت سیدھے سادے اُصول بیان کیے ہیں۔ اُس نے بطور وکیل نکتے بیان نہیں کیے کہ Implied sense میں تو سب اِس جدوجہد میں سپورٹ کر رہے ہیں۔

(ii) عوام نے ٹونی بلیئر کو بہت سی وجوہات کی بنا پر منتخب (Elect) کیا۔ عراق پالیسی، سوشل ریفارمز، سوشل ویلفیئر، Leniency in policies اور Tolerance (تحمل) وغیرہ۔

ہم ٹونی بلیئر کے کسی ایک سکینڈل ہی کو کیوں دیکھتے ہیں۔ دیانت داری اور حق گوئی کا تقاضا ہے کہ ہم مندرجہ بالا تمام فیکٹرز کی وجہ سے اُسے کریڈٹ دیں۔ عراق فیکٹر جو ہے اس سلسلے میں شدید مظاہرے برطانیہ ہی میں ہوئے، بلند آواز بھی وہیں سے اُٹھی۔ ٹونی بلیئر کے Elect ہونے میں اِس Factor کا Major role (اہم کردار) نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِس بات سے سختی سے منع کیا ہے کہ خواتین، بچوں اور بوڑھوں پر دورانِ جنگ ہتھیار اُٹھائے جائیں۔

سوال: کچھ لوگ اللہ کے نام پر بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: اللہ کے ناموں پر جو نام رکھے جاتے ہیں اُن سے پہلے "عبد" لگانا ضروری ہے۔ مثلاً کچھ لوگوں کا نام عبدالرحمٰن ہوتا ہے لیکن لوگ اُنھیں "رحمٰن" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ گناہ ہے کیونکہ رحمٰن تو پوری کائنات میں ایک ہی ہے۔

سوال: کیا نماز کی ادائیگی میں آداب اور عاجزی کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا یا جنون و دیوانگی کو؟

جواب: اللہ کے ساتھ کسی پروٹوکول کی ضرورت نہیں۔ وہاں تو جتنی دیوانگی اور جنون سے آپ حاضر ہوں گے اُتنا ہی پسندیدہ ہے۔ البتہ نماز کی ادائیگی کے وقت اُس کے فرائض اور آداب کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھیں جیسے وضو، غسل، نیت، تکبیر، قیام، رکوع و سجود کو بہترین طریقے سے کریں۔ اِسی طرح آداب میں یہ بھی ہے کہ سر کو ڈھانپ لیں۔ حاضری کے مکمل احساس کے ساتھ رب تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہوں۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ اللہ کی محبت کا جنون جتنا زیادہ ہو جائے اور اس جنون میں جب اُسے پکارا جائے تو یہ عمل شرفِ قبولیت پاتا ہے۔

سوال: (i) کیا مزارات پر جا کر دُعا کی جا سکتی ہے؟

اپنے رحیم وکریم ہونے اور اپنے انبیائے کرام کے صدقے مجھ پر رحم فرما اور میری حاجت پوری فرما دے۔ اس طرح دُعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(ii) جہاں تک یہ بات ہے کہ فاتحہ خوانی تو گھر میں بھی ہو سکتی ہے، یہ بالکل درست ہے لیکن مزارات پر فاتحہ خوانی کی دلیل یہ ہے کہ فرض کریں آپ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جاتے ہیں۔ وہاں چوبیس گھنٹے قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی ہوتی ہے...... اللہ کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں جاری ہوتا ہے۔ جہاں اللہ کا ذکر ہو وہاں رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جب کسی ایسی جگہ پر جا کر ہم فاتحہ خوانی کرتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی جگہ بارش ہو رہی ہو اور آپ وہاں چلے جائیں تو بارش کی بوندیں آپ کو بھی بھگو دیں گی۔ اس لیے اگر آپ کسی ایسی جگہ پر جا کر دُعا کرتے ہیں جہاں پہلے سے ذکرِ الٰہی کی وجہ سے رحمت کی بارش ہو رہی ہے تو آپ بھی اُس ابرِ کرم میں بھیگ جائیں گے اور وہاں آپ کی دُعا کی قبولیت کے Chances (مواقع) بڑھ جائیں گے۔ مزار پر فاتحہ خوانی کی صورت میں یہ Extra benefit آپ کو مل جاتا ہے لیکن اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ گھر بیٹھ کر فاتحہ خوانی یا ایصالِ ثواب نہیں کر سکتے۔ آپ گھر میں رہ کر بھی اور چلتے پھرتے بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔

سوال: کیا کسی رُوح کو ایصالِ ثواب کرنے والے کے اپنے نامۂ اعمال میں بھی نیکیوں کا اضافہ ہوتا ہے؟

جواب: زندہ ہو یا مرحوم...... ہر انسان کو اپنے نامۂ اعمال کو بہتر کرنے کے لیے نیکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندہ انسان تو اِس سلسلے میں خود بھی کوشش کر سکتا ہے لیکن جو شخص اس دُنیا سے انتقال کر گیا وہ اپنے نامۂ اعمال میں Addition (اضافہ) یا Alteration (تبدیلی) نہیں کر سکتا۔

جب کوئی زندہ انسان کسی مرحوم شخص کے ایصالِ ثواب کی نیت سے کوئی نیک کام کرتا ہے تو رب تعالیٰ یہ مہربانی فرماتا ہے کہ زندہ اور مرحوم دونوں اشخاص کو اُس نیک عمل کا برابر ثواب عطا کرتا ہے۔ جب کسی رُوح کے نامۂ اعمال میں ایسے کسی نیک عمل کا اضافہ کیا جاتا ہے تو وہ رُوح خوشی اور احساسِ تشکر سے مغلوب ہو کر رب تعالیٰ کے حضور دُعا کرتی ہے کہ یا باری تعالیٰ! جس شخص نے میرے نامۂ اعمال میں ثواب کا اضافہ کیا ہے تو اُس پر مہربانی فرما اور اُس کی دُعا قبول فرمالے۔

اگر وہ رُوح اللہ کے کسی مقبول اور نیک آدمی کی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی دُعا کے نتیجے میں فاتحہ خوانی یا ایصالِ ثواب کرنے والے شخص کی حاجت روائی ہو جائے۔

اس کے کئی تجربات بھی ہوئے لیکن چونکہ رُوحانی مشاہدات واردات اور تجربات آدمی کی اپنی Consumption کے لیے ہوتے ہیں اس لیے ان کو Public نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماں کی رُوح جس انداز میں اولاد کے لیے تڑپتی ہے وہ Unprecedented ہے۔

سوال: (i) دیکھا گیا ہے کہ سعودی لوگ ظاہری طور پر بہت کم صدقہ وخیرات کرتے ہیں۔

(ii) کیا صدقات وخیرات میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے؟

جواب: (i) میرا تجربہ یہ ہے کہ سعودی بہت کھلے دل سے صدقہ وخیرات کرتے ہیں اور خوب صورتی یہ ہے کہ وہ اُسے ظاہر کرنے سے اجتناب بھی کرتے ہیں۔ ماہِ رمضان میں یہ صدقہ وخیرات عروج پر ہوتا ہے کیونکہ یہ سنت بھی ہے۔

(ii) اسلام تمام عبادات ومعاملات میں اعتدال پر زور دیتا ہے۔ صدقات وخیرات میں بھی اعتدال کی یوں ضرورت ہے کہ فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ ایک زمانے میں میرا خیال تھا کہ شاید کفالت کے سلسلے میں سب سے پہلے والدین کا نمبر آتا ہے لیکن بعد میں میری Correction ہوگئی کہ سب سے پہلے بیوی بچوں اور اُس کے بعد ماں باپ اور بہن بھائیوں کی ضروریات پوری ہونی چاہییں۔ اس کے بعد صدقہ وخیرات کی باری آئے گی۔

سوال: زکوٰۃ کی ادائیگی کن صورتوں میں لازم ہے؟

جواب: زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی Ifs & buts نہیں ہیں، کوئی Exceptions نہیں ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا سیدھا سادا فارمولا رب تعالیٰ نے دیا ہے کہ اگر کسی شخص کا گھر کا گزارہ نہیں ہوتا...... وہ اپنے اخراجات پورے نہیں کر پاتا...... یوٹیلٹی بلز اور بچوں کی فیسیں ادا نہیں کر پاتا...... اِس کے باوجود اگر اُس کے پاس سونے کے دو چار کڑے (کنگن) ہیں اُس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اُس کی Saving ہے۔ ورنہ اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ Consume ہو جاتے۔ اگر کوئی شخص مقروض ہو گیا ہے تو قرض کی رقم زیور کی رقم سے قیمت کر دیں۔ اِس کے بعد بھی اگر اِتنا زیور بچ جاتا ہے جو نصاب کے زمرے میں آتا ہے تو اُس پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

Interaction رہا۔ ہمارا Belief اور مذہب تو تبدیل ہو گیا لیکن ہمارا رہن سہن ہندو معاشرے کی رُسوم کا پابند رہا...... اِس لیے ہندو معاشرے کی بہت سی قباحتیں ابھی بھی ہمارے ہاں چلی آ رہی ہیں۔ ہندو مذہب میں دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانی جان کی قربانی دی جاتی ہے۔ اُن کے عقائد کے مطابق اگر منگل کے روز کسی ملک میں خون بہایا جائے تو اُس سے بلائیں دُور رہتی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنا یوم آزادی 14 اگست کے بجائے 15 اگست کر لیا...... حالانکہ بھارت اور پاکستان دونوں ایک ہی دن آزاد ہوئے تھے...... کیونکہ پنڈتوں نے بتایا تھا کہ جوتش کے حساب سے اگر 15 اگست کو آزادی Declare کی جائے تو بہت مبارک رہے گی۔

ہم ہندو مذہب سے بہت سی رسومات اور چیزیں Carry کیے ہوئے ہیں۔ ہندو رُسوم جو ہمارے یہاں در آئیں رفتہ رفتہ اُنھوں نے عقائد کی شکل اختیار کر لی ورنہ صدقہ و خیرات کسی بھی صورت میں کیے جائیں، پسندیدہ ہیں۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیں...... کسی قیدی کو رہا یا غلام کو آزاد کروا دیں...... کسی کا قرض ادا کر دیں۔ اگر آپ کے ارد گرد کوئی ایسا شخص ہے جو Financially less fortunate ہے تو بکرا یا مرغ صدقہ کرنے کی بجائے اُتنی رقم اُس شخص کو مدد کی نیت سے دے دیں۔ ان شاءاللہ یہ صدقہ بکرے کی نسبت زیادہ قبول ہوگا کیونکہ آپ نے ایک مستحق شخص کو ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچا لیا ہے۔

سوال: صدقے سے کام ہو جانے کی سائنسی توجیح کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''احسن تقویم'' اور بہترین شکل میں تخلیق کیا۔ انسانی جسم ایک سائنسی عجوبہ ہے۔ ایک بہت ماہر ڈاکٹر بھی کھلے لفظوں میں تسلیم کرتا ہے کہ مکینیکل سائنس کی اِس قدر ترقی کے باوجود سائنس Human anatomy کو 30-40 فی صد سے زیادہ نہیں سمجھ سکی۔ انسانی جسم میں اور کیا کچھ چھپا ہے، یہ تو آہستہ آہستہ Discover ہوتا جائے گا لیکن انسانی جسم میں ایک بہت عجیب و غریب چیز دماغ ہے۔ اس میں کیا کیا قوتیں پوشیدہ ہیں اِس کا مکمل طور پر ابھی تک کسی کو پتا مل نہیں سکا، اگر Concentration (یکسوئی) کے حصول کے لیے انسانی ذہن کو قابو کر کے Train کر لیا جائے تو اِس ذہنی قوت سے چلتی بس کو روکا جا سکتا ہے۔

اگر ہم ذہنی طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے بکرے کا جو صدقہ دیا ہے اس سے ہمارا کام سیدھا ہو جائے گا تو یہ ذہنی قوت ہمارے کام آتی ہے اور ہمارے کام سیدھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی صد...

سے صدقہ مانگنے نہ بھی آئے تب بھی آپ خود اردگرد نظر دوڑائیں اور چپکے سے ضرورت مند کی مدد اس انداز میں کریں کہ اُس نے یہ خدمت لے کر آپ پر احسان کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "فقیر پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی خدمت اِس طرح کرے کہ خود خدمت لینے والا یہ سمجھے کہ میں نے اِس سے خدمت کروا کر اِس پر احسان کیا ہے۔"

سوال: کیا صدقہ وزکوٰۃ دیتے وقت اُن کے بارے میں بتانا ضروری ہے؟

جواب: صدقہ وزکوٰۃ دیتے وقت بتا دینا اِس لیے بہتر ہے تا کہ وہ مستحقین تک پہنچ جائے۔ مثلاً سیّد کے لیے زکوٰۃ اور دیگر واجبی صدقات لینا منع ہے۔ اُن کی خدمت میں فقط نفلی صدقات اور تحائف پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن بتاتے ہوئے انداز میں اتنی عاجزی ہو کہ صدقہ وخیرات یا زکوٰۃ لینے والے کو کسی طور پر بھی یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اُس پر احسان کیا جارہا ہے۔

سوال: کیا گھریلو ملازم کو تنخواہ کے علاوہ صدقہ وخیرات بھی دیا جاسکتا ہے؟

جواب: اگر گھریلو ملازم کے حالات ایسے ہیں کہ تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل ہے تو اُسے صدقہ وخیرات بھی دیا جاسکتا ہے۔ اُن کی کسی نہ کسی انداز میں خدمت کرتے رہیے (مگر زکوٰۃ اور واجبی صدقہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو)۔

سوال: زکوٰۃ کا بہترین مصرف کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے زکوٰۃ کے تمام مصارف بہترین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے پیرامیٹرز (Parameters) میں رہتے ہوئے زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے لیکن میرے خیال میں اِن تمام بہترین مصارف میں زکوٰۃ کا ایک اچھا استعمال یہ بھی ہے کہ وہ طالب علم جن میں قابلیت اور Will to learn موجود ہے لیکن مالی حالات کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ پارہے ایسے طالب علموں کو زکوٰۃ کے پیسوں سے تعلیم دلادی جائے یہ زکوٰۃ کا بہترین استعمال ہے۔ کیونکہ اس سے آنے والی کئی نسلوں کا مستقبل سنور جائے گا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اکٹھی کر کے ایسے لوگوں کو کاروبار کرادیا جائے جو وسائل کی کمی کی وجہ سے روزی کمانے سے محروم ہیں...... میرے نزدیک تو یہ زکوٰۃ کا بہترین مصرف ہے۔

سوال: زیرِ تعلیم بچوں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا کیسا ہے؟

ایسے کی جائے کہ انھیں مانگے تانگے کی روٹی اور کپڑوں پر زندہ نہ رہنا پڑے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان مدارس میں دی جانے والی تعلیم بہت Limited vision کی ہے حالانکہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے افراد کی ضرورت ہے۔

میں نے 1996ء میں ایک ٹی وی پروگرام میں عرض کیا تھا کہ اس وقت پاکستان میں بیس لاکھ Financially affluent (مالی طور پر خوش حال) خاندان موجود ہیں۔ اگر ہر خاندان کسی غریب بچے کی تعلیم کا مکمل ذمہ یہ سوچ کر لے لے کہ ہمارے چار نہیں پانچ بچے ہیں۔ پھر اُس بچے کی بہترین تعلیم و تربیت کی جائے حتیٰ کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اُسے بیرون ملک بھجوا دیا جائے جہاں وہ Applied sciences میں تعلیم حاصل کرے۔ بیس سال بعد ہم بیس لاکھ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پیدا کر رہے ہوں گے۔ یوں کچھ ہی عرصے بعد مغربی دُنیا آپ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی اور صرف پچیس سال بعد پاکستان کا مستقبل انتہائی تابناک ہو جائے گا۔

سوال: معاشرہ کیسے سدھر سکتا ہے؟

جواب: ایک بار کچھ دانش ور گفتگو کر رہے تھے کہ رشوت اس لیے زیادہ ہے کہ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے انسان یوٹیلٹی بلز تک ادا نہیں کر سکتا۔ سٹریٹ کرائمز اس لیے زیادہ ہیں کیونکہ لوگوں کے پاس دو وقت کی روٹی کے پیسے نہیں ہوتے۔ میں چند منٹ اُن کی گفتگو سنتا رہا پھر اُن دانش وروں سے سوال کیا ''کیا آج غربت اسلام کے ابتدائی سالوں کی نسبت زیادہ ہے؟ اُس وقت تو آپ ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھ کر جنگیں لڑی تھیں، کیا آج تک ہم نے کبھی پیٹ پر پتھر باندھے؟''

اُن دانش وروں نے تسلیم کیا کہ تب غربت آج کی نسبت چار پانچ گنا زیادہ تھی لیکن سٹریٹ کرائمز اور دیگر اخلاقی و معاشرتی بُرائیاں موجود نہیں تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ تب ہر آدمی کا ایمان اپنی جگہ درست تھا۔ آج ہماری خواہش ہے کہ ہمارا ہر حکمران حضرت عمر فاروقؓ جیسا ہو لیکن یہ خواہش کرتے ہوئے ہم یہ کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ تب رعایا صحابہ کرامؓ تھی۔ اگر ہم اپنے حکمرانوں کو امیر المومنین کے مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں خود اپنے آپ کو بھی صحابہ کرام کے کردار کے مقام پر لانا ہو گا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر آدمی دوسروں کو جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن خود دواجپائی کی سی زندگی گزارتا ہے۔ ہم دُنیا فرعون کی سی اور

سوال: بنیادی انفراسٹرکچر کے بغیر ترقی کیسے ممکن ہے؟

جواب: 1960ء کے اوائل میں اخبار میں ایک خبر چھپی کہ ایک نوجوان نے بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اس خبر کے چند روز بعد گورنمنٹ کالج کے ایک پروفیسر کا انگریزی اخبار ''پاکستان ٹائمز'' میں ایک خط چھپا جس کا متاثر کن متن آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ اُنھوں نے لکھا تھا ''نوجوان کی خودکشی کی خبر پڑھ کر مجھے بہت گہرا دُکھ ہوا۔ کاش! وہ نوجوان خودکشی کرنے سے پہلے مایوسی کے اس عالم میں مجھ سے مل لیتا تو اُسے خودکشی نہ کرنا پڑتی...... ہمارے نوجوانوں کا المیہ یہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ وائٹ کالر جاب کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارا نوجوان ایک رکشا ڈرائیور کا منشی ہونا اور اُس سے سو روپیہ تنخواہ لینا تو پسند کرے گا...... کیونکہ یہ وائٹ کالر جاب ہے لیکن وہ یہ نہیں سوچے گا جس رکشہ ڈرائیور کی نوکری میں کر رہا ہوں، میں خود بھی تو اُس جگہ آ سکتا ہوں کہ ایک منشی کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر رکھنے کے قابل ہو جاؤں۔

اگر وہ نوجوان میرے پاس آتا تو میں اُسے اپنی جیب سے کچھ رقم دے کر کہتا کہ بیٹا! بوٹ پالش کرنے والی ایک صندوقچی خرید دو اور لوگوں کے جوتے پالش کرنا شروع کر دو۔ چونکہ تم پڑھے لکھے ہو اس لیے تم اس بوٹ پالش کے فن میں بھی ندرت پیدا کر لو گے اور اُس ندرت کے ذریعے تمھارا کاروبار بہت چمکے گا۔ صرف سال بھر میں تم ایک کھوکھا کرائے پر لو گے جہاں ایسی کئی صندوقچیاں رکھے تمھارے کئی ملازم کام کر رہے ہوں گے۔ اگلے پانچ سال بعد وہ کھوکھا ایک بڑی دکان میں تبدیل ہو جائے گا جہاں تم کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہو گے اور دس ایسے ورکس اسٹیشن لگے ہوں گے جہاں لوگ تمھارے لیے کام کر رہے ہوں گے۔ اس کے بعد تم ایک کارخانے کے مالک بن جاؤ گے لیکن تمھیں ابتدا شو پالش کی ایک صندوقچی سے کرنا ہو گی۔''

بات یہ ہے کہ جب پڑھے لکھے Enlightened لوگ آگے آتے ہیں تو ترقی کے سفر کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر ڈاکٹر عبدالقدیر خان اٹامک انرجی کمیشن میں ایک ایسا Set-up پالے جس کا وہ ہیڈ بنا دیا جائے۔

1974ء میں جب میں ایک سرکاری ادارے کا جنرل مینیجر تھا تو ایک ریٹائرڈ ایئر فورس آفیسر سکواڈرن

نے ایک ایسی بات کہی کہ جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کہنے لگا" جناب! یہ سب اس کچے مکان اور پرانے زمانے کی مشین سے Develop ہوا ہے۔

میں یہ سن کر پانچ منٹ تک بالکل خاموش رہ گیا کہ ایسی پرانی مشینری سے اتنا Sophisticated equipment کیسے Develop کیا جا سکتا ہے؟

اُس نے میری حیرانی کو بھانپ لیا اور بات یوں واضح کی" جناب! یہ تو مشینیں ہیں۔ 1965ء کی جنگ میں ہمارے پاس F104 سٹار فائٹرز تھے جن کی Night vision capabilities کو امریکہ نے ہمیں دیتے ہوئے Blower کر دیا تھا۔ ہم کوشش کے باوجود بھی یہ Night vision capability محض ڈیڑھ میل تک بحال کر سکے۔

جنگ کے دوران انڈین ایئر فورس رات کے وقت ہمیں Intercept کرنا چاہتی تھی کیونکہ اُسے پتا تھا کہ ہماری Night vision capability صرف ڈیڑھ میل تک کی ہے۔ تب میں اور میرے چند ساتھیوں نے ایک دن اور رات صرف کر کے ایک مخصوص پتھر کرسٹل کو manually گھسایا اور ساتھ ساتھ اس کی فریکوینسی چیک کی۔ (یہ بتاتے ہوئے اُس ریٹائرڈ ائیر فورس آفیسر نے اپنی گھسی ہوئی تین انگلیاں ہمیں دکھائیں) ہم نے تقریباً چھتیس (36) گھنٹے کام کر کے Night vision capability کو ڈیڑھ میل سے بڑھا کر ساڑھے ستائیس میل کر دیا۔ اُس روز پوری جنگ میں پہلی بار انڈیا نے رات کو ہم پر حملہ کیا اور ہم نے مار مار کر اُن کا بھرکس نکال دیا۔

جناب! میں نے ایک پتھر اور اپنی اِن اُنگلیوں سے F 104 سٹار فائٹرز کی Capability بڑھائی ہے تو اِس کچے مکان میں پرانی مشینوں سے Sophisticated equipment کو Develop کرنا زیادہ مشکل تو نہیں۔"

یہ سارا قصہ سن کر میں Convince ہو گیا۔ اِس ساری کاوش کا مجھے پہلے سے علم تھا لیکن اُس وقت پہلی بار یہ پتا چلا کہ یہ عظیم کام سکواڈرن لیڈر کھوکھر کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ میں نے اُس کی ورکشاپ کی رجسٹریشن Approve کر دی اور یوں اُس نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ 1982ء میں جب میں نے گورنمنٹ جاب سے استعفا دیا تو کھوکھر صاحب میرے پاس آئے۔ میں نے پوچھا کیسے معاملات چل رہے ہیں؟"

میں نے بنایا Bomb-launching unit کا System develop کر دیتا ہوں۔ یوں میراج تھری کا
ہے۔ اس میں آپ ایک ایک کر کے بھی فائر کر سکتے ہیں۔ کوئی ایک Combination بنا کر دو اور تین کا
Combination بھی فائر کر سکتے ہیں...... Solo بھی فائر کر سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے جمرود میں ایک
Demonstration دلائی تھی جسے شاہِ ایران نے Witness کیا تھا۔

وہ Practical demonstration میرے Develop کیے گئے Equipment پر دی گئی تھی جو
بہت کامیاب رہی۔ جس پر میراج (Mirage) والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اب وہ میرا یہ ڈیزائن خرید
رہے ہیں۔ سکواڈرن لیڈر رکھوکھر اب ماشاءاللہ رب پتی انسان تھا...... یہ ساری بات ٹیلنٹ کی تھی...... اُس کو
انفراسٹرکچر کا غم نہیں تھا۔

Now, he forms a small component of national infrastructure.

بات یہ ہے کہ پڑھے لکھے آدمی آ گے آ ئیں (میں تعلیم یافتہ نہیں بلکہ پڑھے لکھے کہہ رہا ہوں) جب ایسے
لوگ آ ئیں گے اور اُن میں سے ہر شخص National cause کے لیے کام کرے گا تو انفراسٹرکچر خود بخود بنتا
چلا جائے گا اور ملک ترقی کرتا چلا جائے گا۔

(i) رب پر بھروسا بڑھانے کا فارمولا

(ii) رب کی دوستی پانے کا اُصول

سوال: رب تعالیٰ پر بھروسا کرنا ہم کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ اِس بھروسے میں اضافے کا فارمولا کیا ہے؟

جواب: رب تعالیٰ کے ساتھ ہمارے رویے میں کیا فرق ہے؟ ہم میں سے کوئی آدمی یہ بتائے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے لے کر موجودہ عمر تک کبھی کسی ایک لمحے میں بھی یہ خیال آیا کہ ہم گھر جائیں گے تو ہماری والدہ ہمیں کھانا نہیں دیں گی...... یا کبھی ایسا ہوا کہ اُنھوں نے ہمارے بستر کا خیال نہیں رکھا، ہمارے لیے لباس کا انتظام نہیں کیا یا مشکل وقت میں ہماری مدد نہیں کی۔

مجھے کوئی ایسا آدمی یاد نہیں جو محلے میں کسی سے کہنے گیا ہو کہ میری والدہ سے کہہ دیں کہ وہ مجھے کھانا دے دیں...... میرے لیے کپڑے اور بستر Arrange کر دیں۔ ہمیں کبھی ایک پل کے لیے بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہماری والدہ ہمیں Look after نہیں کریں گی۔

وجہ یہ ہے کہ والدہ پر ہم Trust کرتے ہیں۔ لیکن وہ رب تعالیٰ جو ہماری والدہ سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے، جو ہماری کوتاہیوں کے باوجود مسلسل ہمیں پالے جا رہا ہے، اُس کے ہوتے ہوئے ہم کبھی کسی عامل، شاہ صاحب یا پیر صاحب کے پاس دُعا کرانے دوڑے جاتے ہیں کہ آپ اللہ سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے کام کر دے۔

وجہ یہ ہے کہ رب پر ہمارا یقین تو ہے، اُس پر بھروسا نہیں

جب ہم رُوحانیت کی راہ میں علم حاصل کرتے ہیں اور اُس کی وجہ سے رب تعالیٰ پر بھروسا کرنا سیکھ جاتے ہیں تو یقین واطمینان کا یہ نور ہمارے چہرے سے بھی جھلکنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ہمارا ایمان اور بھروسا والدہ پر بھروسے سے زیادہ ہونا چاہیے۔ والدہ کی اپنی ضروریات اور حدود و قیود ہیں جب کہ رب تعالیٰ کی اپنی نہ ضروریات ہیں، نہ وہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اُس کی کوئی حدود و قیود ہیں۔ وہ اِن تمام چیزوں اور بندشوں سے بالا ہے۔ اگر والدہ اپنی تمام محتاجی کے باوجود ہمیں Look after کرتی ہیں تو ایسی ہستی جو اِن تمام چیزوں سے بالاتر اور بے نیاز ہے، وہ تو ہمیں Look after کرنے میں آزاد ہے...... اُسے کون پوچھنے والا ہے۔ اِس ایک حقیقت کا ادراک اور علم ہی ہمارے اندر ایمان اور بھروسا پیدا کر دے گا کہ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ رب مجھے Look after نہ کرے...... میرے کام نہ کرے۔ یہ ایک بھروسا جب رب تعالیٰ پر پیدا ہو جائے تو کام بن جائے گا۔

ہم نا سمجھی میں اُس میراثی کی مانند ہیں جو کسی گاؤں میں چوہدریوں کی خدمت کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔ ایک روز چوہدری نے اُسے بلایا اور اپنے بیٹے کی شادی کے دعوت نامے قریبی گاؤں کے چوہدریوں کو دینے کی تاکید کی۔ دعوت نامے دینے کے بعد شام کو وہ میراثی تھکا ہارا پیدل ٹانگیں گھسیٹتا ہوا واپس گاؤں آ رہا تھا اور مارے تھکن کے دُعا کر رہا تھا ''یا اللہ! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تو بے نیاز ہے تیرے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اگر تو مجھے ایک سواری عطا کر دے تو تجھے کون سا کسی نے پوچھنا ہے!''

دفعتاً اُسے اپنی پشت پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو گاؤں کا نمبردار گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اُس کا بچہ بھی تھا جس کی طرف اشارہ کر کے نمبردار بولا کہ طویل سفر طے کرنے کی وجہ سے یہ بے چارہ تھک گیا ہے۔ اب اِس سے چلا نہیں جا رہا۔ تم ایسا کرو کہ اِسے اپنے کندھوں پر سوار کر کے گاؤں پہنچا دو۔ میراثی مسکین بے چارہ نمبردار کا حکم نہ ٹال سکا۔ تھکن سے دگرگوں حالت کے باوجود گھوڑے کے بچے کو کندھوں پر ڈالا، گاؤں کی راہ لی اور چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا کر بہت بے چارگی سے کہنے لگا:

''اوئے ربا! میں ہیٹھاں دی سواری منگی سی...... اُپر دی نئیں...... نئیں سمجھ آئی سی تے

Observation ہمیں سکھاتی ہے کہ دوسرے بچوں کی مائیں بھی ہماری ہی ماں کی طرح اُنھیں Look after کرتی ہیں۔ اِس سے ہمیں ماں کی محبت اور شفقت پر یقین ہو جاتا ہے۔

جب لوگ میرے پاس آ کر کوئی ایسی بات کرتے ہیں تو میں اُنھیں بھروسا کامل کرنے کے لیے ایک پریکٹس بتاتا ہوں کہ آپ رات کو جب بستر پر لیٹتے ہیں تو اپنے بچپن سے لے کر آج کی عمر تک کو بار بار Review کیا کیجیے کہ زندگی میں کتنے مواقع آئے جب ہم بالکل مایوس تھے کہ یہ کام نہیں ہو پائے گا...... اور Out of the blue وہ کام ہو گیا...... کتنی بار ہم وسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے مایوس تھے لیکن غیب سے ایسی جگہ سے وسائل میسر آ گئے کہ جہاں سے ہمیں توقع تک نہ تھی۔ جب ہم یہ باتیں ہفتے میں ایک دو تین بار Review (دہرانے) کرنے لگیں گے تو رب تعالیٰ پر ہمارا بھروسا بڑھنے لگے گا...... اور ہم سوچیں گے کہ جب اُن کڑے حالات میں رب تعالیٰ ہمارے کام آتا رہا تو آئندہ بھی آئے گا...... یہ بھروسا پیدا ہو جانے کے بعد ہمیں یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ نہ جانے وہ ہمارا کام کرے گا بھی یا نہیں۔

سوال: اللہ سے کیا مانگا جائے؟

جواب: یہ بہت جامع دُعا ہے ''یا اللہ! میری دُنیا بھی بہترین کر دے اور آخرت بھی۔''

غالب کا ایک قصہ بہت مشہور ہے کہ جب اُنھیں ماہانہ وظیفہ ملا تو بجائے راشن اور دیگر گھریلو ضروریات کے لیے بیگم کو رقم دینے کے وہ شراب خرید لائے۔ بیگم نے سرزنش کی تو کہنے لگے ''بھئی رزق کا وعدہ تو رب نے کیا ہے...... اِس کا وعدہ رب نے نہیں کیا اس لیے یہ میں خود لے آیا ہوں۔''

یہ تو قصہٗ معترضہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم عموماً اُن چیزوں کے لیے زیادہ پریشان رہتے ہیں جن کا رب نے وعدہ کر رکھا ہے۔ مثلاً رب فرماتا ہے کہ میں رزق دیتا ہوں...... رزق دینے والا میں ہوں...... یہ رب تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے اور دعویٰ بھی...... لیکن رب تعالیٰ کے اس وعدے اور دعوے کے باوجود ہم رزق کے لیے پریشان پھرتے ہیں۔ ہم سے کوئی آدمی غلط کام صرف تین ہی صورتوں میں کر سکتا ہے:

- ہم اپنے باس کے غلط آرڈر کو اِس خدشے سے Obey کریں گے کہ کہیں میری نوکری نہ چلی جائے۔ اگر نوکری چلی گئی تو میں کھاؤں گا کہاں سے! گویا رزق کے بند ہو جانے یا اُس میں کمی آ جانے کے خوف

عزت وذلت، رزق اور جان، سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

اگر میں ابھی کہوں کہ صاحب، رزق دینے والا تو اللہ ہے تو آپ میں سے ہر کوئی کہے گا ''بے شک''، ''بے شک''۔ لیکن ہم اندر ہی اندر اپنے باس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ کہیں وہ ہمیں نوکری سے نہ نکال دے۔ رزق میں کمی کے خوف سے ہم باس کی ہر غلط بات ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اگر میں کہوں کہ عزت اور ذلت صرف رب کے ہاتھ میں ہے تو آپ سب بہت پُر زور انداز میں میری تائید کریں گے کہ ''بلاشبہ''۔ لیکن اگر ہمیں کوئی دھمکی دے کہ میرا فلاں کام اگر تم نے نہ کیا تو میں تمھیں بدنام کر دوں گا...... تو ہم اُس دھمکی سے خوف زدہ ہو کر غلط کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اِسی طرح اگر میں کہوں کہ زندگی اور موت رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، موت کا ایک دن معیّن ہے تو آپ فوراً کہیں گے ''بے شک''۔ لیکن دوسری طرف اگر کوئی ہمیں گولی مارنے کی دھمکی دے کر غلط کام کرنے کو کہتا ہے تو ہم موت کے خوف سے وہ کام کر دیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ ہم جن حقیقتوں کے بارے میں پختہ یقین کا اظہار کرتے ہیں، اُنہی کے بارے میں اِس قدر خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ غلط کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

جو چیزیں رب نے اپنے ذمہ لے لی ہیں اور جن کو دینے کا اُس نے وعدہ کر لیا ہے ہم اُس سے وہی چیزیں مانگتے رہتے ہیں۔ رب نے تو فرما دیا کہ میں تمھیں پالوں گا، تمھیں رزق دوں گا۔ لیکن میں پھر بھی ہر دو منٹ کے بعد اُس سے کہے جاتا ہوں ''یا اللہ! میرے کنستر میں آٹا ختم ہو گیا ہے...... مجھے آٹا دے دے۔'' جو چیز اُس نے اپنے ذمہ خود لازم کر لی...... جس کی ذمہ داری اُس نے خود قبول کر لی...... اُن چیزوں کا کیا مانگنا!

پھر رب تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ دُنیا میرے نزدیک حقیر ترین چیز ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بھیڑ کے مرے بچے پر گزرے تو فرمایا ''تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ یہ اسے ایک درہم کے عوض ملے؟'' صحابہ نے عرض کیا ''ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں کسی بھی چیز کے عوض ملے۔'' تو فرمایا ''اللہ کی قسم! دُنیا اللہ کو اِس سے زیادہ ذلیل ہے، جیسی یہ تمھارے نزدیک۔'' (صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقاق، حدیث:7607، صفحہ 210 جلد 8)

اس کا رحم، کرم، فضل اور رحمت مانگ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے! جب ہم اُس سے اُس کی ذات مانگتے ہیں تو وہ ہمیں اپنا آپ Just like that عطا نہیں کر دیتا۔ اُس نے خود قرآن میں فرمایا ہے جس کا مفہوم ہے کہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مجھ پر ایمان لے آئے، میں اُنھیں آزماتا ہوں۔

جب رب آپ کو اپنا آپ عطا کرنے لگے گا...... اپنا دوست بنانے لگے گا...... تو وہ یہ بھی دیکھے گا کہ ہم اپنے دعویٰ میں کتنے سچے ہیں...... ہم اُس کی دوستی کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں...... وہ دوستی کی اس تیاری کو Test کرے گا اور اس Test میں ہمیں خاصے سخت مقامات سے گزرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے مالی حالات میں ناقابلِ بیان حد تک تنگی آ جائے...... گھریلو سکون جاتا رہے...... ازدواجی زندگی اس قدر تلخ ہو جائے کہ نوبت علیحدگی تک آ جائے...... شدید تہمتیں اور بے پناہ الزامات لگنے لگیں۔ یہ اِتنا بڑا Test ہے کہ بڑے بڑے دل گردے کے لوگ اس مقام پر ہل جاتے ہیں۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ لالچ ترغیبات راہ کھوٹی کرنے کے لیے ہر آن اُکسائیں۔ ایسے ہر مقام اور موقع پر اللہ سے مدد مانگی جائے کہ یا اللہ! اپنے فضل سے مجھے اس سخت مقام سے گزار دے!

حضرت عبداللہ بن مفضلؓ بیان کرتے ہیں:

ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تم سوچ لو، تم کیا کہہ رہے ہو!'' اُس نے عرض کی۔ ''اللہ کی قسم! میں آپ ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تم سوچ لو، تم کیا کہہ رہے ہو!'' اُس نے عرض کی اللہ کی قسم! میں آپ ﷺ سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' یہ مکالمہ تین مرتبہ ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو غربت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہو کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے، فقر اُس کی طرف اِس سے زیادہ تیزی سے آتا ہے جتنی تیزی سے سیلابی ریلا اپنی منزل کی طرف جاتا ہے۔'' (جامع ترمذی۔ حدیث نمبر 2350)

سوال: دوستی عطا کرنے سے پہلے آزمائش کی وجہ کیا ہے؟

جواب: محترمہ! آپ یہ بتایئے کہ آج ایک نیا ملازم آپ نے رکھا ہے تو کیا آپ پہلے ہی گھنٹے میں اپنا تمام زیور اور کیش اُس کے حوالے کر دیں گی یا پھر پہلے اُسے چند دن آزمائیں گی کہ وہ کتنا ایماندار ہے؟

کشف و کرامات کو کسی شخص کے ولی اللہ ہونے کی کسوٹی قرار دیں گے تو یہ علم اور صلاحیت تو اہلِ کتاب میں سے بھی چند لوگوں کو حاصل ہے۔

جہاں تک علم غیب کا تعلق ہے تو رب تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا کہ عالم الغیب میں ہوں۔ ہاں میں جس کو جتنا چاہتا ہوں یہ علم عطا کر دیتا ہوں۔ اِس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ علم غیب صرف اللہ ہی کو حاصل ہے اور اُس نے یہ علم کسی کو بھی عطا نہیں کیا۔ اس کے بجائے ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ عالم الغیب صرف اللہ ہی ہے لیکن وہ جسے جتنا چاہتا ہے، علم عطا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قسم کھا کر فرمایا کہ میں نے اپنے نبی ﷺ کو ہر طرح کا علم عطا فرمایا...... یہ رب تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کی دلیل ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے، اُس کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ اپنی چیز میں سے جس کو جتنا چاہے عطا کر دے۔ اس لیے اُس نے جس قدر چاہا اپنے پیغمبروں، اولیائے کرام اور عام بندوں کو علم عطا کر دیا۔ اب اِس میں ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا سوال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ مالک ہے...... ہر چیز پر قادر ہے...... اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو مخاطب کر کے جہاں یہ فرمایا کہ ''آپ ﷺ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔'' یہ بھی رب تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کی دلیل ہے کہ اُس کے حکم کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں...... ایک پتا تک نہیں ہل سکتا۔ وہ نہ چاہے تو کوئی کسی کو نقصان یا فائدہ نہیں پہنچا سکتا...... آپ ﷺ اپنے تمام تر مرتبے اور خدا کے بعد بزرگ و برتر ترین ہستی ہونے کے باوجود بہر حال رب تعالیٰ کے بندے ہیں۔ بلاشبہ آپ ﷺ کی ذات بہت بلند ہے...... آپ ﷺ کی ہستی بہت بڑی ہے۔ بے شک اللہ کے رسول ﷺ اللہ کے محتاج ہیں اور اللہ ہی کے حکم سے عطا کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا کہ آپ چاہیں تو اللہ اُسے پورا نہ فرمائے۔ آپ ﷺ اللہ کے محبوب ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا ''میں نے آپ ﷺ کے رب کو اِس قدر جلدی کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس قدر آپ ﷺ کی خواہش پورے کرتی ہوئے دیکھتی ہوں۔'' (صحیح بخاری، کتاب الجمعة:4788)

دین و دُنیا

سوال: کیا محض شک کی بنیاد پر کسی کو قادیانی یا غیر مسلم سمجھا جا سکتا ہے؟

جواب: حضرت اُسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ''حرقۃ'' (قبیلے) کی طرف بھیجا۔ ہم نے اُن پر حملہ کر کے اُنھیں ہزیمت سے دو چار کر دیا۔ میں اور ایک انصاری اُن کے ایک فرد کے مقابلے میں آئے۔ جب ہم نے اُس پر قابو پا لیا تو اُس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا تو انصاری شخص رُک گیا لیکن میں نے اُسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔

جب ہم واپس آئے اور نبی اکرم ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ''اے اُسامہ! تم نے اُسے اُس کے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد بھی قتل کر دیا!'' میں نے عرض کی اُس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔'' آپ ﷺ نے اپنے جملہ کو مسلسل دہرایا یہاں تک کہ میں نے یہ آرزو کی کہ کاش میں اِس دن سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 4021)

یہ ایک واقعہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں تو ہم اُسے غیر مسلم قرار نہ دیں۔ لیکن قادیانیوں کے بارے میں قومی اسمبلی نے 7 ستمبر 1974ء کو مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ارکان کی قرارداد کو منظور کرتے ہوئے آئین میں ترمیم کی اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ اِس کے تحت کوئی بھی شخص جو نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو کسی طور پر نبی مانے وہ غیر مسلم ہے۔ اِس لیے ہم قادیانیوں کو کسی بھی صورت مسلمان نہیں گردان سکتے۔

یہ مرزا کا قصہ عجیب و غریب ہے۔ وہ علمیت کے لحاظ سے کافی بلند تھے۔ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے سے پہلے تک اُنھوں نے جتنی کتابیں لکھیں، وہ کمال کی ہیں...... شاید علم کی زیادتی اور راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اُن کا دماغ اُلٹا چلا گیا اور وہ شیطان کے قبضے میں جاتے گئے حتیٰ کہ مرتد ہو گئے اور اُن کی اپنی تحریروں پر گرفت ختم ہو گئی۔ مرزا کے ساتھیوں کو صحابہ کہا جانے لگا...... کسی نے صحیح کہا تھا کہ یہ سب فتنہ ہیں۔

سوال: مناسب راہنمائی اور علم نہ ہو تو ایسے میں انسان کیا کرے؟ کیا بہتر نہیں کہ Dot to line مکمل کرنے کے بجائے اپنے طور پر لائن کھینچ لے؟

جواب: اِس میں دو چیزیں ہیں: ایک تو یہ کہ انسان کو اپنے طور پر سوچنا چاہیے کہ میں کیا کروں...... انسان کو جب تک کسی چیز کا علم نہ ہو، وہ اپنی سوچ کے مطابق بہترین عمل کرے۔ جب اُسے باتوں کی سمجھ آنے لگے تو پھر وہ تمام جزئیات اور باریکیوں کو مدنظر رکھ کر اُن کے مطابق چل پڑے۔

اب آپ کا سوال کہ Dot to line کو ہم مکمل نہ کریں بلکہ اپنے طور پر لائن کھینچ لیں...... بہت اچھی بات ہے۔ انسان کو یہ کوشش کرنی چاہیے...... لیکن یاد رکھیے! فُٹ رول رکھے بغیر آپ لائن لگائیں گے تو وہ ٹیڑھی ہوگی۔ فُٹ رول رکھ کر جب لائن کھینچیں گے تو وہ سیدھی اور خوبصورت ہوگی اس لیے کہ وہ فٹ رول جو پنسل یا پن کو گائیڈ کر رہا ہے، وہ نمونہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہے۔ اِس لیے میں یہ ترغیب دیتا ہوں کہ آپ لائن خود لگائیے لیکن ایسا کرتے ہوئے آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا فٹ رول ساتھ رکھ لیجیے تا کہ آپ کے عمل کی لائن ٹیڑھی نہ ہونے پائے۔

جب تک انسان کو واضح راستے کی سمجھ نہ آئے تب تک بہتر ہے کہ وہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کی اُن باتوں پر عمل کرلے جو اُس نے سکول کی ابتدائی جماعتوں میں دینیات کے مضمون میں پڑھی تھیں۔

جب تک ہمارا بیٹا خود اپنے طور پر کار چلانے کے قابل نہیں ہو جاتا ہم اُس کے ساتھ کوئی Helper ضرور بٹھاتے ہیں جو اُس کے Actions کو Correct کرتا ہے۔ اس مرحلہ سے پہلے وہی بچہ اپنے والد یا ڈرائیور کو بڑے غور سے گاڑی چلاتے دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ خود گاڑی چلانا سیکھتا ہے تو باپ کے سٹائل کو Copy کرتا ہے...... لہٰذا صحیح عمل کے لیے غلط اور صحیح کی پہچان بہت ضروری ہے اور یہ پہچان مشاہدہ، علم اور راہنمائی سے آتی ہے۔

سوال: سنا ہے کہ سکھ بھی آپ کے معتقد اور معترف ہیں۔

جواب: سنی سنائی باتیں اکثر افسانوں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ قصہ صرف اتنا تھا کہ میں حضرت بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ (ایک منفی چیز جو میں اپنے اندر سے نہیں نکال سکا، وہ ہندو کے خلاف تعصب ہے۔ یہ میری اتنی بڑی پرابلم ہے جس سے میں تنگ آیا ہوا ہوں۔ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے اُس کے خلاف متعصب ہونا نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ یہ Condemn بھی ہونا چاہیے...... لیکن میں اس سے جان نہیں چھڑا پا رہا۔)

میں میریٹ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کے پاس ہی کاررینٹل والوں کا آفس تھا۔ میں گاڑی ہائر کرنے کے لیے وہاں گیا تو دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ ڈرائیور ہندو نہ ہو۔ میں نے اُن سے کہا کہ ڈرائیور سکھ ہو تو بہتر ہے۔ لیکن جب گاڑی آئی تو ڈرائیور ہندو تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ذہن پر بہت بڑا بوجھ بن گیا۔ اب میں

گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یا اللہ! کیا پانی پت تک سارا راستہ میں اسی طرح کڑھتا ہوا جاؤں گا!

ہندو کے بارے میں میرے ساتھ ایک پرابلم یہ بھی ہے۔ میں جہاز سے جب انڈیا جاتا ہوں تو جونہی پاکستان کا بارڈر کراس کر کے ہم انڈیا میں داخل ہوتے ہیں تو جہاز میں ایک دم سے ایک مخصوص Smell آنے لگتی ہے جس سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم انڈیا میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں اس عجیب Smell سے بہت تنگ ہوتا ہوں۔ اُس روز گاڑی میں بھی میں اسی کیفیت اور کوفت کا شکار تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ڈرائیور نے سامنے موجود Round about سے گاڑی گھمائی اور واپس رینٹل کار والوں کی پارکنگ میں آ ٹھہرا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟" کہنے لگا "مجھے بخار ہے میں گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتا۔" تب میرے ساتھ ایک سکھ ڈرائیور کو بھجوا دیا گیا۔ ہم پانی پت پہنچے۔ بوعلی قلندر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دے کر میں لوٹا اور مزار سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر کھڑی گاڑی میں جا کر جب بیٹھا تو سکھ ڈرائیور نے مجھے مخاطب کیا "مہاراج! کچھ ہمارے لیے بھی دُعا کر دیں آپ!" میں نے کہا "یار! تمھیں مجھ سے زیادہ کوئی گناہ گار آدمی نظر نہیں آیا دُعا کرانے کے لیے جو مجھ سے دُعا کرنے کو کہہ رہے ہو۔" وہ کہنے لگا "مہاراج! بات یہ ہے کہ ہم ڈرائیور صبح سے شام تک طرح طرح کے آدمیوں سے ملتے ہیں۔ جب آپ میرے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھے تھے اور میں نے گاڑی چلائی تو یہ بہت Light تھی۔ دوسرے بمبئی (موجودہ ممبئی) سے پانی پت تک یہ روز جتنا پٹرول کھاتی ہے آج اُس سے آدھا پٹرول اس نے کھایا۔ جب آپ گاڑی میں بیٹھے تھے تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کیسا آدمی میری گاڑی میں بیٹھا ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب آپ اپنا کام کر کے واپس آئیں گے تو میں آپ سے دُعا کراؤں گا۔" پھر اُس سکھ ڈرائیور نے مجھ سے میرا پاکستان کا ایڈریس لیا کہ میں دُعا کرانے کے لیے آپ کے پاس وہاں آؤں گا۔ بس اتنا سا قصہ ہے جس کا افسانہ بنا ہوا ہے۔

سوال: ایک فقیر کے لیے حصولِ دُنیا کی خواہش ممنوع کیوں ہے؟

جواب: رب تعالیٰ کے نزدیک دُنیا کی حقیقت ایک مردہ گلی سڑی بکری کے بال کے برابر بھی نہیں۔ رب تعالیٰ جس کو دوست رکھتا ہے اُس کو حقیر نہیں بلکہ اعلیٰ چیز دے گا۔

اِس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر چاہتے تو کوہِ اُحد سارے کا سارا سونے میں بدل دیا جاتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں چاہا۔ اگر دُنیا اللہ کے نزدیک پسندیدہ چیز ہوتی تو سب سے پہلے وہ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ عطا فرماتا۔

جس طرح کوئی بچہ آگ کا شعلہ پکڑنے کی ضد کرتا ہے اُسی طرح ہم بھی دُنیا جیسی حقیر چیز کے حصول کی ضد میں لگے رہتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی تیس (30) سالوں میں اِسے بہترین عروج نصیب ہوا۔ اُس دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل دیکھ لیجیے۔ کسی نے دُنیا قطعاً نہیں چھوڑی بلکہ دین اور دُنیا دونوں میں توازن رکھا...... کیونکہ پسندیدہ عمل یہی ہے کہ ایک ہاتھ میں دُنیا اور دوسرے میں دین لے کر اِس طرح چلا جائے کہ دین و دُنیا کا توازن بگڑنے نہ پائے۔

تصوف کا مقصد

سوال: فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول ﷺ اور فنا فی اللہ کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: اگر ہمارا باس ہمیں چھٹی سے ایک آدھ گھنٹا پہلے بلا کر کوئی کام کہے تو چونکہ ہم Mentally چھٹی کے لیے تیار ہوتے ہیں اس لیے اپنے کمرے میں واپس جائیں گے اور تھوڑی دیر بعد اپنے باس کو فون کر کے کہیں گے سر! میں نے پتا کیا ہے۔ وہ آدمی اِس وقت دفتر میں نہیں ہے اِس لیے یہ کام میں کل کروں گا۔ اِس کے بعد آپ گھر چلے جاتے ہیں۔ آپ کا اکلوتا بیٹا آپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے کہ مجھے کارنر شاپ سے چیونگم دلا کر لائیں۔ آپ تھکن کے باوجود بیٹے کو گود میں اُٹھائیں گے۔ اُس کے سر پر اپنا رومال ڈالیں گے تاکہ اُسے دھوپ نہ لگے۔ دکان پر جا کر چیونگم کے علاوہ بھی اُسے کچھ چیزیں دلائیں گے اور خوش خوش گھر لوٹ آئیں گے۔ اب آپ نے بچہ کو چھاؤں میں رکھا...... خود دھوپ میں رہے...... اپنی Hard-earned money اُس پر خرچ کی...... تھکن کے باوجود اِس تمام عمل میں آپ نے راحت محسوس کی...... جب کہ باس، جس سے آپ کو Salary (تنخواہ) ملتی ہے...... جس کے ہاتھ میں آپ کی پروموشن اور increment کی طاقت ہے...... اُس کی بات کو آپ نے کل پر ٹال دیا۔

باس کے یہاں چونکہ خوف ہے اِس لیے اُس کا حکم آپ نے ٹال دیا لیکن بیٹے سے چونکہ آپ کو محبت ہے اس لیے اُس کی بات یا فرمائش ٹالنے کے بجائے آپ نے فی الفور پوری کی اور اُس میں خوشی بھی محسوس کی۔ انسان کسی حکم یا بات کو دو ہی صورتوں میں مانتا ہے: خوف کے سبب یا پھر پیار، مان اور عزت کی وجہ سے...... اِس لیے کہا جاتا ہے کہ جس کو آپ اُستاد مانیں اُس کا ادب بھی بے پناہ کریں اور اُس سے پیار بھی بے حد کریں۔ جب آپ اُستاد کی محبت میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ آپ کی ذات کوئی ذات ہی نہیں رہتی...... اُستاد کہتا ہے کہ یہ دن ہے تو آپ رات کو بھی دن کہنے لگتے ہیں...... وہ کہتا ہے یہ صحیح ہے تو آپ نے کہا جی بالکل......! یہ سوچنا ہی نہیں کہ یہ غلط ہے بھلے سامنے ہی نظر آتا ہو کہ یہ غلط ہے۔

جب آپ مرشد کی محبت میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ اپنی ذات کو ختم کر لیتے ہیں تو یہ فنا فی الشیخ کہلاتا ہے۔ اگر آپ ﷺ سے اس طرح کی محبت ہوگئی کہ انسان کی اپنی ذات باقی ہی نہ رہی تو اسے ہم

فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے...... اسی طرح جب انسان اللہ کی محبت میں خود کو بھلا دیتا تو وہ فنافی اللہ ہو جاتا ہے۔ تصوف کی اِن تینوں Terminologies (اِصطلاحات) میں اندھا پیار پالنا پڑتا ہے اور اپنی ذات کو ختم کرنا پڑتا ہے۔

سوال: تصوف کو آسان لفظوں میں کیسے سمجھا اور بیان کیا جاسکتا ہے؟

جواب: صوفیا نے اپنے تجربات اور علم کے لحاظ سے تصوف کی تعریف کی ہے...... یوں کہہ لیں کہ اللہ کے احکامات کی تعمیل بغیر کسی ردوقدح کے تمام تر خوشی کے ساتھ کرنا "تصوف" ہے۔

تصوف کی تعریف کسی بھی انداز میں کی جائے، اُس کا نچوڑ یہی ہوگا کہ تصوف ہمیں سکھاتا ہے کہ شریعت پر آسانی کے ساتھ کیسے عمل کیا جاسکتا ہے۔ تصوف اصل میں انسان کی ٹریننگ کرتا ہے کہ کس طرح وہ شریعت کی راہ میں پیش آنے والے کٹھن مراحل سے آسانی سے گزر سکتا ہے۔

بدقسمتی سے عام آدمی تصوف کے بارے میں بڑے غلط تصورات لیے بیٹھا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تصوف کی بدولت انسان ماورائے فطرت قوتوں کا مالک ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تصوف نہیں، مداری پن اور شعبدہ بازی ہے۔! تصوف تو یہ ہے کہ انسان تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے آپ کو شریعت کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کے لیے تیار کرنے لگے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں تصوف پر مبنی اکثر کتابوں میں کرامات کے بیان پر زور دیا گیا ہے مثلاً اگر آج میں اپنے مرشد صاحب پر ایک کتاب لکھوں تو میں یہ پہلو بالکل ختم کردوں گا کہ میرے مرشد صاحب رزقِ حلال کمانے کے سلسلے میں اپنی خودداری کو قائم رکھتے تھے۔ سوال کرنے سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے۔ خاطر مدارات، مہمان نوازی، خوش خلقی، تواضع جیسی اعلیٰ درجے کی صفات کے مالک تھے کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی...... ان اعلیٰ صفات پر عمل پیرا ہونے کے دوران وہ کس مشقت سے گزرتے تھے میں اُسے تو بیان نہیں کروں گا لیکن اُن کی کرامات کے قصے ضرور بیان کروں گا۔

حکیم رحمت الٰہی جو علم جفر، علم جوتش اور نہ معلوم کون کون سے علوم میں عمل دخل رکھتے تھے...... طبیعت میں شرارت بھی بہت تھی...... میری وائف کے ماموں زاد ڈاکٹر زاہد کے وہ دوست تھے اور اُنہی کے توسط سے ایک روز وہ میرے پاس آکر کہنے لگے کہ میں آپ کے مرشد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اُنھیں اُن کے پاس لے گیا۔ وہ جا کر مرشد صاحب سے کہنے لگے کہ آپ مجھے کچھ پیسے دے دیں۔

میں یہ بات سن کر بہت جز بز ہوا کہ غلط بات ہے ایک فقیر کا بھرم کھولنا...... معلوم نہیں بڑے شاہ صاحب کے پاس پیسے ہیں بھی یا نہیں۔ اب میری خواہش تھی کہ میں کسی طرح اُن کے دائیں طرف جڑ کر بیٹھ جاؤں اور چپکے سے اُن کی سائیڈ پاکٹ میں پیسے ڈال دوں تاکہ اُن کا بھرم قائم رہ جائے۔ لیکن چاہنے کے باوجود مجھ سے یہ کام کسی طور نہیں ہو پا رہا تھا۔ اِسی اثنا میں مرشد صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ (مجھے معلوم تھا اُن کی جیب خالی ہے۔) وہ کچھ دیر اُس میں ہاتھ پھیرتے رہے...... پھر ایک بالکل نیا نوٹ نکالا جو غالباً دو روپے کا تھا۔

دیکھا اور زیر لب کہنے لگے ''یار! یہ نہیں چاہیے۔'' دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ روپے کا نوٹ نکلا۔ یہ بھی واپس رکھ دیا اور ایک بار پھر جیب میں ہاتھ پھیرنے لگے...... پہلے دس روپے اور پھر Finally پچاس روپے کا نوٹ نکلا۔ تب کہنے لگے ''ہاں یہ چاہیے۔'' میں نے خاص طور پر وہ نوٹ چیک کیا، اُس پر سٹیپل (Staple) کا کوئی نشان نہیں تھا۔ (سٹیٹ بنک والے نوٹوں کی گڈی بناتے ہیں اس لیے ہر نوٹ پر سٹیپل کا نشان ضرور ہوتا ہے لیکن اُن میں سے کسی نوٹ پر یہ نشان نہیں تھا۔)

اب اگر میں مرشد صاحب پر کتاب لکھوں گا تو ایسے واقعات کو نمایاں کروں گا۔ یوں ہم گھوم پھر کر دُنیا ہی کے چکر میں رہ جاتے ہیں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی ایسا شخص مل جائے جو Super natural powers (ماورائی قوتوں) کا مالک ہو اور اُس کے پاس جا کر ہم اپنی دُنیاوی مشکلات حل کروالیں...... کہیں نہ کہیں At the back of our mind دُنیا کے حصول کا خیال رہتا ہے...... شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو گا جو کبھی یہ کہہ دے کہ مجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جس سے میں قربِ الٰہی کا طریقہ سیکھ لوں تا کہ میری عاقبت سنور جائے۔ چونکہ یہ راہ بہت کٹھن ہے اِس میں بہت قربانیاں دینا پڑتی ہیں...... سختیاں جھیلنا پڑتی ہیں...... یہ مار ہم سے برداشت نہیں ہوتی کیونکہ یہ مجاہدہ مانگتی ہے۔

حکیم رحمت الٰہی کے ذکر سے مجھے ایک اور قصہ بھی یاد آ گیا۔ میں چونکہ کسی زمانے میں گورنمنٹ آف پاکستان کے لیے کام کر رہا تھا تو اُن دنوں مجھے اکثر و بیشتر پشاور جانا پڑتا تھا۔ جہاز کی ٹائمنگ اور سیٹ کے مسائل کی وجہ سے میں بائی روڈ سفر کو ترجیح دیتا۔ ایک بار کسی کانفرنس کے سلسلے میں پشاور جانا ہوا۔ اکثر اس سفر میں قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب میرے ساتھ تشریف فرما ہوتے۔ اُن دنوں میری سسٹر کے Husband کی اٹک کے قریب سنجوال کینٹ میں پوسٹنگ تھی۔ میری والدہ نے کہا کہ پشاور جاتے ہوئے مجھے سنجوال چھوڑتے جانا۔ ہم نے والدہ کو سنجوال کینٹ چھوڑا اور وہاں سے واپس پشاور کے لیے مڑے۔ اگر آپ لاہور سے پشاور جا رہے ہوں تو جی ٹی روڈ سے لیفٹ کو ایک سڑک نکالی گئی ہے جو سنجوال کینٹ کی طرف جاتی ہے۔ یہ سڑک تب بالکل ویرانے میں تھی اور Depth میں کوئی 18 میل اندر کو تھی۔ جب ہم سنجوال کینٹ سے لوٹ رہے تھے تو شام کا وقت تھا...... مون سون کا موسم تھا، بادل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک میری نظر اپنی 74 ماڈل کی بلیک مرسڈیز کے بونٹ پر پڑی جہاں آسمانی بجلی لہرا رہی تھی۔ دفعتاً وہ آسمانی بجلی بونٹ سے ہٹ کر سڑک پر رقص کرنے لگی۔ میں نے قبلہ مرشد صاحب سے بڑے آرام سے عرض کیا:

''حضور! یہ دیکھیے! یہ بجلی کیا کر رہی ہے؟'' وہ فرمانے لگے ''تمھاری نظر اس پر اب پڑی ہے ورنہ یہ پہلے گاڑی کی چھت پر موجود تھی۔ لو! اسے ابھی ہٹا دیتے ہیں۔'' (میں Normally ایسی باتیں کہتا نہیں کیونکہ کچھ لوگوں کو اس پر یقین نہیں آئے گا اور کچھ کو ایسا یقین آئے گا کہ وہ شرک میں چلے جائیں گے لیکن آج چونکہ کرامات کی بات ہو رہی ہے اس لیے سوچ کر اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ معتقدین اپنے مرشد کے بارے میں کس طرح کی باتیں کتاب میں لکھیں گے۔)

مرشد صاحب نے آسمانی بجلی کو مخاطب کر کے کہا ''ہٹ جا بھئی آگے سے!'' اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر چمک رہی تھی۔

اِس کے کچھ عرصہ بعد میں منسٹری کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھا کہ حکیم رحمت الٰہی کا فون آ گیا۔ کہنے لگے ''سر! سنا ہے آپ اسلام آباد آئے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا ''جی۔'' کہنے لگے ''واپسی پر مجھے بھی لاہور لیتے جایئے۔'' یوں ہم اسلام آباد سے لاہور آ رہے تھے۔ راستے میں جہلم اور کھاریاں کے درمیان پہاڑ کو کاٹ کر درمیان میں سڑک بنائی گئی ہے اور وہاں پہاڑ Bend ہیں۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اچانک میں کیا دیکھتا ہوں کہ اُس روز کی طرح آسمانی بجلی میری گاڑی کے بونٹ پر ہے۔ غلطی یہ ہوئی کہ بجائے خاموش رہنے کے میری زبان سے بے ساختہ پھسل گیا ''حکیم صاحب! دیکھیے، یہ تماشہ۔'' حکیم صاحب نے دیکھا تو اُن کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے کہا ''گھبرایئے نہیں۔ یہ ابھی ہٹ جاتی ہے۔'' میں نے اُونچی آواز میں آسمانی بجلی کو مخاطب کر کے کہا ''بھئی! کیوں ڈرا رہی ہو۔ آج تو قبلہ مرشد صاحب بھی نہیں ہیں جو تمھیں کہیں گے کہ ایک طرف چلی جاؤ۔'' جیسے ہی میں نے یہ الفاظ دہرائے، میں نے اللہ کی قدرت دیکھی کہ بجلی بونٹ سے ہٹی اور دائیں طرف جو پہاڑی تھی، اُس پر جا کر چمکنے لگی۔

مختصر یہ کہ تصوف کا مقصد کشف و کرامات کا حصول نہیں بلکہ اللہ کے قرب اور دوستی کا حصول ہوتا ہے۔

توہمات اور نا تمام خواہشات کے جنات

بعض اوقات ہمارے اندر کا کوئی ایسا کونا جاگ اُٹھتا ہے جس کی وجہ سے ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم پر جنات آ گئے، کسی نے جادو کر دیا یا بھوتوں نے ہمیں پکڑ لیا۔ مجھے تو آج تک روئے زمین پر کوئی ایسا جن نظر نہیں آیا جو انسان سے زیادہ طاقت ور ہو۔ انسان سے بڑا جن کوئی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِسے بے پناہ قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ جن نے انسان کو کیا پکڑنا ہے وہ تو انسان سے چھپتا پھرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح انسان سے محفوظ ہو جاؤں۔ بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ بہت پڑھے لکھے لوگ آ کر کہتے ہیں کہ ہم پر کسی نے کالا جادو کر دیا۔ یقین کیجیے یہ جادو کا چکر نہیں بلکہ ہماری خواہشات اور آرزوئیں اُس قدر بڑھ گئی ہیں کہ غیر فطری حدوں کو چھونے لگی ہیں۔ ہمارے اندر صبر ختم ہو گیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری خواہش فوراً پوری ہو جائے۔

رب تعالیٰ کا اپنا ایک نظام کام کر رہا ہے جس میں بہت سے Factors کارفرما ہیں۔ ایک Factor یہ بھی ہے کہ خود انسان کے لیے اُس کی خواہش کتنی فائدہ مند یا نقصان دہ ہے۔ جب ہمارے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ ہمارے لیے کس قدر مفید یا مضر ہے...... ہماری آرزوئیں اور خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو ہم الزامات دیتے ہیں کہ ہمارے مخالفین اور حاسدین نے ہم پر جادو کر دیا ہے...... حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

فرض کریں کہ گورنمنٹ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری کی خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد بطور سیکرٹری پروموٹ ہو جائیں۔ یہ خواہش کرنا اُن کا حق ہے لیکن اُس کی تکمیل میں بہت سے Factors شامل ہیں۔ مثلاً Vacancy ہے بھی یا نہیں، بجٹ میں Provision ہے یا نہیں، باس کا اُن کے بارے میں کیا خیال ہے، اور سب سے بڑھ کر اُس سیٹ پر ایک سیکرٹری پہلے سے موجود ہے جن کا ٹرانسفر یا ریٹائر ہونا ایڈیشنل سیکرٹری کے اختیار میں نہیں۔ اب وہ ایڈیشنل سیکرٹری کہتے ہیں کہ جی میری پروموشن نہیں ہو رہی...... مجھ پر کسی نے کالا جادو کر دیا ہے۔ ایسے میں اُنھیں سمجھانا پڑتا ہے کہ تم اپنی سنیارٹی دیکھو، اپنی اب تک کی سروس دیکھو، تم سے زیادہ Length of service والے اور زیادہ Efficient آفیسر بھی اپنی پروموشن کے منتظر ہیں لیکن وہ ایڈیشنل سیکرٹری اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور ایک ہی بات کی گردان کیے جاتے ہیں کہ

مجھ پر جادو ہو گیا ہے۔ یہ وہم اُن کی راتوں کی نیند چھین لیتا ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ آپ اُنھیں شب بیداری کی ترغیب دیں۔

ایک صاحب نے ایسا ہی شکوہ جب میرے سامنے دہرایا تو میں نے اُن سے کہا کہ میرا دل تو چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لوں کیونکہ آپ تو ولی اللہ ہو گئے ہیں کیونکہ وہ راتوں کو نہیں سوتے...... آپ تو مزے کریں اور رات کو عبادت کیا کریں۔ ورنہ یہاں تو لوگ جاگتے رہنے کے لیے گولیاں کھاتے ہیں۔ آپ اس موقع سے فائدہ اُٹھائیے اور شب بیداری کے ذریعے رب کا قرب حاصل کر لیجیے۔

آپ نئی گاڑی لیتے ہیں، جب وہ دو چار سال پرانی ہو جاتی ہے تو اُسے آئے روز Repair کی ضرورت پڑتی ہے...... یہ نیچرل چیز ہے۔ انسان جب بڑھاپے میں پہنچ جانے کے باوجود چل پھر لیتا ہے تو یہ اللہ کی بہت عنایت اور رحمت ہے۔ Repair تو ساتھ ساتھ چلتی ہی رہے گی۔ آج گھٹنے کی تو کل ہاتھ کی Repair ہو رہی ہے۔

بس دُعا کریں کہ دماغ کی Repair کی ضرورت نہ پڑے۔

نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں۔ خواہشوں کا دیر سے پورا ہونا یا نا تمام رہ جانا بھی ایک ناگزیر امر ہے۔ ہمیں اِن سب حقیقتوں کو خوش دلی سے تسلیم کرنا چاہیے اور اِن توہمات میں نہیں پڑنا چاہیے کہ مجھ پر کسی نے کالا جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے میرے کام رُک گئے ہیں یا ادھورے رہ گئے ہیں۔

سوال: بھروسا اور توکل میں کیا فرق ہے؟

جواب: بھروسا اور توکل، دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں...... یہ ایک ہی ہیں۔ جب انسان کے اندر یہ شعور اُتر آتا ہے کہ میری ذمہ داری کیا ہے اور یہ کہاں ختم ہو گی اور اللہ کی Discretion کہاں شروع ہو گی تو اِس فرق کا ادراک میرے نزدیک بھروسا کہلاتا ہے۔

اگر انسان کو یہ پتا چل جائے کہ میرے ذمہ صرف ایک کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ذہنی صلاحیتیں اور جسمانی قوتیں عطا فرمائی ہیں میں اُن کو بھرپور طریقے سے استعمال کر کے محنت کروں اور اُس محنت کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دوں پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی صلہ یا نتیجہ عطا ہو میں اُسے خوش دلی سے قبول کر لوں...... یہی توکل اور بھروسا ہے۔

عرفِ عام میں بھروسا سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ انسان اس یقین سے محنت کرتا رہے کہ میرا رب موجود ہے، وہ مجھے ضرور Look after کرے گا اور میری مدد کرے گا۔ بدقسمتی سے ہم میں سے اکثر لوگ یہ نہیں کر پاتے کہ اللہ کی عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کر کے عملی کوشش کریں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری محنتوں کا ثمر اگر ہماری مرضی کے برعکس بھی عطا کرے تو ہم اُسے خوش دلی سے تسلیم کر لیں۔

سوال: اللہ کی صفات رحمٰن و رحیم کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: اللہ تعالیٰ کی دونوں صفات ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کا بظاہر ایک ہی مطلب ہے لیکن اِن کا اِصطلاحی مفہوم

مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رحمٰن ہونے کے ناتے بغیر حساب کے، بغیر کسی کی اوقات و کردار دیکھے، بغیر کسی کے اعمال کا تجزیہ کیے، سب کو عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ مشرکین کی بھی سنتا ہے جو اُسے رب ہی نہیں مانتے۔ جو اُس کے وجود سے انکاری ہیں، اُن کو بھی عطا کرتا ہے۔ منکرین کو بھی دیے چلا جاتا ہے۔ نافرمانوں پر بھی اپنی نوازشات کرتا ہے۔ جو مسلمان اور مومن ہیں اُن کی بھی سنتا ہے اور کھلے ہاتھوں سب کو عطا کرتا ہے۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کے رحیم ہونے کی بات کرتے ہیں تو بحیثیت رحیم اُس کی عطا مختلف Factors پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ مانگنے والوں کو عطا فرماتا ہے...... اور نہ مانگنے والوں سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رب تعالیٰ کی ربوبیت اُس کی مختلف صفات کے تحت کام کرتی ہے۔ اُس کی کسی نہ کسی صفت کے تحت لوگ نوازے جا رہے ہوتے ہیں۔ رحمٰن ہونے کے ناتے رب تعالیٰ سب کو بن مانگے اور بے حساب عطا کرتا ہے...... نیک و بد سب کی سنتا ہے۔ البتہ رحیم ہونے کے ناتے وہ انسان کے اعمال کو Consider کرتا ہے، اُس کے سوال کو دیکھتا ہے اور جب بندہ اُس سے سوال نہیں کرتا، مانگتا نہیں، تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ مانگنے سے مراد یہ نہیں کہ ہم اُس سے صرف رزق یا دُنیاوی چیزیں ہی مانگتے رہیں۔ وہ تو رب ہے۔ وہ سب کو پالتا ہے...... رزق دینے کا تو اُس نے وعدہ کر رکھا ہے۔ وہ رب، جو رحیم ہے...... جو سوال کیے جانے کو پسند کرتا ہے...... اُس سے بہت کچھ ایسا مانگا جا سکتا ہے جس کا اُس نے وعدہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں یہ ضرور تمھیں عطا کروں گا۔ رب تعالیٰ سے رحم اور اُس کی رحمت مانگی جا سکتی ہے...... مغفرت طلب کی جا سکتی ہے...... اُس کے قرب اور دوستی کا سوال کیا جا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اُس سے اُس کی اپنی ذات مانگی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اُس رحیم رب سے اکثر و بیشتر دُنیا ہی مانگتے رہتے ہیں۔

سوال: اہلِ فقر کے نزدیک شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: فقیر کا شکر ادا کرنے کا طریقہ قدرے عجیب ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ میرا نہیں، میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ اِس پر میرا صرف اِتنا حق ہے کہ میں اِس سے اپنی اور اپنے خاندان کی جائز ضروریات پوری کر لوں۔ اِس کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے اُس پر دوسروں کا حق ہے۔ جو چاہے آ کر لے جائے۔ فقیر اپنے مخالفین اور دشمنوں پر دل کھول کر مال خرچ کرتا ہے کیونکہ وہ اُس زائد مال کو اپنے پاس دوسروں کی امانت سمجھتا ہے جس پر بلا تفریق سب کا حق ہے۔ یہی فقیر کا اندازِ اظہارِ تشکر ہے۔

سوال: اللہ کے ساتھ نفع کا سودا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: آپ کے گھر میں دو ملازم ہیں...... ایک ملازم آپ کی بھرپور خدمت کرتا ہے۔ یکم کو وہ آپ سے تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے...... یہ اُس کا حق ہے۔ کیونکہ آپ نے اُس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دوسرا ملازم بھی آپ کی خدمت کرتا ہے لیکن یکم ہونے کے باوجود وہ آپ سے تنخواہ کا مطالبہ نہیں کرتا۔ آپ دس تاریخ کو اُس سے پوچھتے ہیں "بھئی کیا تم نے تنخواہ نہیں لینی تھی؟" وہ جواب دیتا ہے "صاحب میں تو پیار کی وجہ سے آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔" اب وہ ملازم آپ کی محبت میں آپ کی خدمت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ اُسے تنخواہ دیں گے۔

ذرا سوچیے کہ ان دونوں ملازموں میں سے کون سا ملازم آپ کو زیادہ عزیز ہوگا؟ یقیناً وہ ملازم جو بغیر کسی لالچ اور توقع کے محض محبت کی وجہ سے آپ کی خدمت کر رہا ہے۔

اگر ہم اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کریں اور یہ توقع رکھیں کہ اللہ اس کے عوض مجھے دس گنا عطا فرمائے گا...... پھر ہم اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ ہمیں دس روپے کب ملیں گے۔ یہ بھی ایک کیفیت اور عمل کا درجہ ہے۔

دوسری کیفیت یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں یہ سوچ کر مال خرچ کروں کہ یہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یہ اللہ کے بندوں کے کام آ جائے۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے میرے دل میں کوئی لالچ اور بدلے (Return) کی توقع نہ ہو۔ یقین مانیے رب تعالیٰ کو یہ طریقہ بہت زیادہ پسند آئے گا۔ وہ خوش ہو کر آپ کے اِس عمل کا بے حد و حساب اجر اور صلہ آپ کو عطا فرمائے گا۔ اس لیے اللہ کے ساتھ گھاٹے کا سودا کرنے کے بجائے، ہم نفع کا سودا کیوں نہ کریں؟ اور نفع کا سودا وہی ہے جس میں بے لوث محبت شامل ہو۔

سوال: کیا محض علم فقہ، حدیث و تفسیر سیکھنے سے ہم اللہ کے مقربین اور دوستوں میں شامل ہو سکتے ہیں؟

جواب: آپ علم فقہ، حدیث و تفسیر ضرور سیکھیے لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے کہ بہت سا علم سیکھ کر اُس پر عمل کرنے کے بارے میں Selective ہونے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان تھوڑا علم سیکھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس پر عمل کرتا چلا جائے...... اللہ کو یہ بات زیادہ پسند آئے گی۔

یاد رہے! اللہ کو اپنے بندوں سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ پر مہربان ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ مہربان ہو جائیے۔ آپ دوسروں کے لیے قربانیاں دینا شروع کر دیں...... یوں زندگی بھر آپ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کر پائیں گے۔ یہ دو کام کر لیجیے: ایک تو یہ کہ Be kind to others اور دوسرا کام یہ کر لیں کہ اللہ کے بندوں کے لیے اپنی خواہشات اور ضروریات اور آرام کی قربانی دے دیجیے...... اِس سے اللہ کا قرب اور دوستی آپ کو عطا ہو جائے گی۔

آپ زیادہ زور Practical aspect (عملی پہلو) پر دیا کیجیے۔ اگر فقیر کی زندگی کو گہرائی سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ عملی زندگی پر اُس کا Major emphasis ہوتا ہے لہٰذا اگر آپ اللہ کے قرب کے متلاشی ہیں تو ان دو عملی پہلوؤں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیجیے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ ضرورت سے زائد مال دوسروں پر خرچ کر دیں۔ "ضرورت" کی تعریف کیا ہے؟

جواب: میں نے جائز ضروریات کی بات کی ہے۔ فرض کریں آپ کی مارکیٹنگ کی جاب ہے جس کی Requirement یہ ہے کہ آپ Well dressed اور Well groomed ہوں۔ ایسے میں دو جوڑے کپڑوں سے آپ کی ضرورت پوری نہیں ہوگی...... چار سے پوری ہو جائے گی۔ یہ جائز ضرورت ہے۔ آپ کی اوّلین ترجیح اپنی اور اپنے Dependents (منحصرین) کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ اِس کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے وہ دوسروں کا حق ہے۔

اصل شکر

شکر کی تعریف مختلف اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف انداز میں کی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شکر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو عطائے نعمت کا مستحق نہ سمجھے۔''

حضرت عطاؓ اور حضرت عبیدؓ بن عمیر حضرت عائشہؓ سے ملنے گئے۔ حضرت عبیدؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا۔ ''آپ ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ عمل بتائیں جو آپ نے دیکھا۔'' حضرت عائشہؓ کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر فرمایا ''ایک رات سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا اے عائشہؓ! مجھے اپنے رب کی عبادت کے لیے اجازت دو۔'' میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں اور آپ کی خوشی چاہتی ہوں۔'' پھر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ سرکار نے وضو فرمایا، پھر نماز ادا فرمائی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روئے حتیٰ کہ آپ کا دامن تر ہو گیا۔ پھر روتے رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی مبارک تر ہو گئی۔ پھر روتے رہے حتیٰ کہ زمین تر ہو گئی۔ حضرت بلالؓ تشریف لائے نماز کے لیے اذان کہی۔ حضرت بلالؓ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روتے دیکھا عرض کی ''یارسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کیوں روتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے اگلوں پچھلوں کے گناہ معاف فرمائے۔'' اور سرکار نے فرمایا ''کیا میں اُس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ آج رات مجھ پر ایک آیت کریمہ نازل ہوئی (ال عمران: 190) اور فرمایا وہ شخص برباد ہو جس نے اس آیت کریمہ کو پڑھا لیکن اس میں غور و فکر نہ کیا۔'' (صحیح ابن حبان باب التوبہ ذکر البیان۔۔۔حدیث 620، جلد 2، صفحہ 386)

اِس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور شان کے ادراک پر اُس کا شکر ادا کیا جائے اور اس شکر گزاری میں عاجزی ہو۔

ایک بار ایک پیغمبر کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں اُنھوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ اُبل رہا ہے۔ اُنھوں نے حیرت سے پتھر سے پوچھا ''تم اتنے چھوٹے ہو لیکن تم سے اتنا بڑا چشمہ اُبل رہا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟'' اللہ تعالیٰ نے پتھر کو قوتِ گویائی عطا کی اور وہ بولا ''جس دن سے مجھے یہ پتا چلا ہے کہ انسان اور پتھر جہنم کا ایندھن بنا دیے جائیں گے، اُس روز سے میں خوف سے رو رہا ہوں۔ چشمے کا یہ پانی میرے آنسوؤں کا ہے۔'' یہ سن کر اُن پیغمبر کو رحم اور ترس آیا اور اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے

حضور دُعا کی "یا باری تعالیٰ! تو اِس پتھر کو معاف فرما دے۔" اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور جواب عطا فرمایا کہ اِس پتھر کی مغفرت کر دی گئی ہے۔ وہ پیغمبر چند دن بعد جب دوبارہ اُس پتھر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑا چشمہ اُس پتھر میں سے اُبل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے اور پتھر سے اس کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا "پہلے میرے آنسو ڈر اور خوف کے تھے...... لیکن اب میرے یہ آنسو خوشی اور شکر کے ہیں...... اِس لیے اِن میں شدت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔"

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "شکر یہ ہے کہ آدمی نعمت دینے والے کو دیکھے، نعمت کو نہ دیکھے۔ جو نعمت میسر ہوا سے زوال پذیر یا ضائع نہ ہونے دے، جو مقصود ہو، اُسے تلاش کرے۔"

ایک اور بزرگ نے فرمایا "کسی نعمت کے مل جانے پر اللہ کی شکر گزاری شکر ہے لیکن کسی مصیبت کے نازل ہونے پر شکر ادا کرنا شکور ہونے کی نشانی ہے اور شکور وہ ہے کہ اگر دیر تک کچھ نہ ملے تو اُس پر بھی شکر ادا کرے۔"

"شکور" کے اصطلاحی معنی ہیں شکر کا شکر ادا کرنا۔

اللہ نے اپنے لیے یہ نام پسند فرمایا اور اُس کے اسماء الحسنیٰ میں سے ایک نام شکور بھی ہے۔

اب بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اُبھرے گا کہ رب تعالیٰ کیسے کسی کا شکر گزار ہو سکتا ہے؟ رب تعالیٰ نے اپنے آپ کو شکور اِس لیے کہا کہ جب کوئی بندہ اُس کا شکر ادا کرتا ہے تو اُس کے جواب میں وہ اُس بندے کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ بات مجازاً اُس نے اپنے آپ سے منسوب کی ہے...... ورنہ اِس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ مجازاً یوں ہے کہ جس طرح رب نے کہا کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے جب کہ درحقیقت بُرائی کا بدلہ بُرائی نہیں بلکہ بھلائی ہے۔ اِسی طرح شکر کا بدلہ شکر ہے...... یہ مجازاً ہے۔ لیکن اس کی اصل تشریح یہ ہے کہ جب کوئی بندہ رب کا شکر ادا کرتا ہے تو رب تعالیٰ اُسے پسند فرماتا ہے اور اُس کی تعریف کرتا ہے۔ یہ شکر کا بدلہ ہے اور اِس نسبت سے وہ شکور ہے۔

یہ جو مصیبت نازل ہونے پر شکر کی بات ہے، یہ نہ تو سرکشی ہے اور نہ ہی رعونت...... بلکہ یہ عاجزی اور خود سپردگی کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ بظاہر تو مصیبت پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنا رعونت اور چیلنج لگتا ہے لیکن درحقیقت یہ اعلیٰ درجے کی بندگی ہے۔ وہ اِس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نعمت عطا فرمائی تو بندے نے کہا "یا باری تعالیٰ! میں تیرا احسان مند اور شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔" جب کوئی مصیبت آئی تو بندے نے کہا "یا اللہ! یہ بھی تیری مہربانی ہے۔ اِس سے بڑی مصیبت بھی مجھ پر آ سکتی تھی لیکن تو نے اِس چھوٹی مصیبت کے بدلے مجھے بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اے اللہ تعالیٰ! تو بڑا مہربان اور رحیم و کریم ہے...... تیری شانِ کریمی سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی کہ تو نے یہ مصیبت میرے بھلے کے لیے نازل نہ کی ہو۔ یقیناً اس میں میرے لیے تو نے بھلائی چھپا رکھی ہے۔ میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے میرے لیے یہ سب پسند فرمایا۔"

مصیبت میں اس طرح شکر ادا کرنا بندگی کا اعلیٰ مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں واضح طور پر فرما

دیا کہ تم پر کوئی مصیبت نہیں آتی ماسوائے تمھارے اپنے ہاتھ کے!

"اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اُس کا جو کمایا تمھارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے وہ بہت سے گناہ۔" (سورۃ الشوریٰ:30)

ورنہ رب تعالیٰ کی شانِ کریمی تو یہ ہے کہ وہ معاف کر دیتا ہے..... گرفت نہیں کرتا۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ اہلِ علم پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں؟

جواب: اگر آپ کسی دکان پر جاتے ہیں یا کوئی آپ کے پاس آپ کی گاڑی خریدنے آتا ہے اور آفر کرتا ہے کہ میں آپ کو Hard cash دیتا ہوں یا Post dated چیک دے سکتا ہوں جس پر 10 ہزار فالتو رقم میں آپ کو دوں گا یا میں آپ کے اکاؤنٹ میں دو سال بعد رقم ٹرانسفر کر دوں گا اور پچاس ہزار روپے زائد رقم ادا کروں گا۔ اب آپ سوچتے ہیں کہ مجھے بعد میں Payment لینے میں فائدہ ہے لہٰذا آپ گاڑی بیچ دیتے ہیں اور خود بسوں، ویگنوں میں سفر کرنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف آپ کے دوست نے Hard cash پر گاڑی بیچی اور اُن پیسوں سے خریدی گئی دوسری گاڑی آرام سے لیے پھرتا ہے لیکن دو سال بعد اُس کی گاڑی گھس گھسا کر آدھی قیمت کی بھی نہیں رہ جائے گی۔ اور آپ کو دو سال بعد کئی گنا پیسہ مل جائے گا جس سے آپ نئی مرسڈیز خرید لیں گے..... فیصلے کی چوائس آپ کی اپنی ہے۔

ولی اللہ، اللہ کے ساتھ جتنے بھی سودے کرتا ہے وہ کل کے وعدے پر ستر گنا زائد کے حصول پر کرتا ہے اس لیے آج وہ ویگنوں اور بسوں پر دھکے کھائے گا تو کل ستر گنا زائد حاصل کرے گا۔ لیکن جو کل کے وعدے پر سودا نہیں کرتے بلکہ آج ہی ساری Payment لے لیتے ہیں وہ کل کو دھکے کھا رہے ہوں گے..... جب کہ ولی اللہ عیش کر رہے ہوں گے قصہ بس اِتنا سا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ انسان پر مصیبت اُس کے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔ پھر پیغمبروں کی زندگی میں اِتنے مصائب کیوں نظر آتے ہیں حالانکہ پیغمبر تو معصوم ہوتے ہیں؟ اِسی طرح اولیاء اللہ بھی اللہ سے بہت قریب ہوتے ہیں پھر بھی مشکلات برداشت کرتے ہیں۔

جواب: مصیبت اِس Sense میں نہیں جو آپ سمجھے ہیں۔ اولیاء اللہ نے جتنی بھی مصیبتیں اُٹھائیں، وہ اپنی Duty ادا کرتے ہوئے اُٹھائیں۔ فرض کریں آپ پولیس کی لیگل برانچ میں بھرتی ہوئے..... یونیفارم پہنی۔ عدالت کھلی تو وہاں چلے گئے۔ دو بجے عدالت بند ہوئی..... آپ گھر واپس آ گئے اور سارا دن فارغ رہے۔

پھر یوں ہوا کہ FIA میں بطور انسپکٹر آپ کی ڈیوٹی لگ گئی جہاں آپ کے انچارج کے آنے جانے کے ساتھ آپ کی ڈیوٹی منسلک ہو گئی۔ اگر انچارج 5 بجے تک آفس بیٹھا ہے تو آپ کو بھی تب تک آفس میں رہنا پڑے گا۔

اگر آپ کی ڈیوٹی کسی علاقے کے تھانے میں بطور SHO لگ گئی تو آپ کبھی رات کو چوروں کے

تعاقب میں جارہے ہیں تو کبھی ڈاکوؤں کے ساتھ پولیس مقابلہ ہو رہا ہے۔ کبھی ہاتھ پر تو کبھی ناک پر چوٹ لگ رہی ہے۔

اگر آپ فوج میں چلے گئے تو چوبیس گھنٹے کے لیے ملازم ہو گئے...... نہ دھوپ کا پتا نہ بارش کی خبر...... نہ بھوک کا پتا نہ پیاس کا علم۔ اور اگر فوج سے کمانڈوز فورس میں چلے گئے تو پھر بالکل ہی حشر ہو گیا۔

اب یہ بتائیں کہ کمانڈو، جس کی سب عزت کرتے ہیں...... جو اتنی صعوبتیں اُٹھاتا ہے...... کیا وہ صعوبتیں اُس کے اعمال کا نتیجہ ہیں؟ جتنے بھی پیغمبر ہیں اُن پر وہ مصیبتیں نہیں آئیں جن کو قرآن پاک میں یوں Refer کیا گیا ہے کہ انسان پر کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اُس کے اپنے ہاتھ سے۔ پیغمبروں نے اپنی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے اپنی اُمت کے لیے دُکھ اور مصیبتیں اُٹھائیں۔

اگر انسان کا ہاتھ جلتا ہے تو یہ اُس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے لیکن اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود آگ میں ڈال دے تو یہ ڈیوٹی Perform (ادا) کرنے کا نتیجہ ہے۔ دونوں قسم کی تکلیف میں بہت فرق ہے۔

سوال: روزمرہ زندگی میں لوگوں کو ایسے دُکھ بھی سہنے پڑتے ہیں جن میں اُن کا اپنا ہاتھ نہیں ہوتا۔

جواب: پہلے تو آپ یہ سمجھیں کہ مصیبت کتنی قسم کی ہے۔ جب یہ Concept (تصور) Clear ہو جائے گا تو باقی چیزیں خود بخود Clear ہوتی چلی جائیں گی۔ ایک بار پھر واضح کردوں کہ اگر ہنڈیا پکاتے یا روٹی بناتے ہوئے کسی کا ہاتھ جل جائے تو جلنے کی یہ مصیبت اُس کی بے پروائی کا نتیجہ ہے لیکن اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود کو برداشت کرنا پڑتا ہے تو یہ مصیبت نہیں بلکہ ڈیوٹی Perform (ادا) کرنے کا حصہ ہے۔

فرض کریں ایک ولی اللہ بازار جاتا ہے اُسے ایک جوتا بہت پسند آتا ہے وہ اُسے خریدنا چاہتا ہے تو اُسے اُس کا سائز نہیں ملے گا یا مطلوبہ رنگ دستیاب نہیں ہوگا۔

اس معاملے کو دو مختلف زاویہ نگاہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک Angle تو یہ کہ یہ مصیبت ہے کہ اُسے سزا مل رہی ہے...... دو دو سال تک باوجود کوشش کے اُسے اُس کی پسند کا جوتا نہیں ملتا۔ دوسرا Angle یہ ہے کہ اللہ اُسے اُس کے نفس کی خواہشات سے بچا رہا ہے کہ یہ شخص نفس کا غلام نہ ہونے پائے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے دوست کو نفس کا غلام ہونے سے بچا رہا ہے...... کئی سال تک اُسے اُس کی پسند کا جوتا نہیں ملتا اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک کے بجائے تین جوتے اُسے مل جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے! یہ مصیبت ہے یا انعام!!!

اسی طرح ایک شخص کو ایک مخصوص کپڑا بہت پسند ہے...... وہ خوشی خوشی اُسے خریدتا ہے، سلائی کے لیے درزی کو لا کر دیتا ہے۔ درزی وہ سوٹ خراب کر دیتا ہے یا پھر پریس کرتے ہوئے نیا سوٹ جل جاتا ہے۔ تیس برس گزر جاتے ہیں لیکن احتیاط کے باوجود اُس کے پسندیدہ کپڑے کا سوٹ ہمیشہ خراب ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے کپڑے اُسے ملتے رہتے ہیں۔ کیا یہ مصیبت ہے؟ یا پھر اُسے نفس کی غلامی سے بچایا جا رہا ہوتا ہے؟

انسان بھوکے پیٹ بہت لگن سے عبادت کرتا ہے۔ جب انسان کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہوتی ہیں تو اُس کے دل میں گداز پیدا ہوتا چلا جاتا ہے...... وہ رب تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب ولی اللہ کو لوگ تنگ کر رہے ہوں اور وہ چپ چاپ اُن کی زیادتیاں سہتا چلا جاتا ہو...... پلٹ کر جوابی کارروائی محض اِس لیے نہ کرتا ہو کہ اُس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ تو پھر ہوتا یہ ہے کہ خاموشی سے اُن زیادتیوں کو برداشت کرنے کے نتیجے میں اُس کے اندر دُکھ پلنے لگتا ہے۔ جس سے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اُسے رب کی قربت حاصل ہو جاتی ہے...... کیا یہ مصیبت ہے یا رب تعالیٰ کی رحمت؟

اگر اِس کے برعکس انسان کو تمام دُنیاوی آسائشیں حاصل ہو جائیں...... اُس کی خواہشات پوری ہونے لگیں۔ وہ دُنیا میں کھو جائے اور رب سے دُور ہو جائے، تو کیا یہ اصل مصیبت نہیں؟

اگر ہم اِن تمام باتوں پر غور کریں تو سمجھ آتی ہے کہ جس کو ہم مصیبت سمجھ رہے تھے، وہ تو اصل میں مصیبت تھی ہی نہیں۔

ایک روز میں بڑے شاہ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ ہماری ہمت نہیں ہوتی تھی اُن سے ذاتی سوال کرنے کی! ہم انتظار کیا کرتے کہ وہ کچھ ارشاد فرمائیں یا کچھ بتائیں۔ ایک روز اُن کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ دورانِ گفتگو ایک دم فرمانے لگے "میں نے شادی کی تھی۔ ایک بیٹا بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کیا جو کچھ مہینے بعد وفات پا گیا۔ (یہ بیان کرتے ہوئے اُن کے لہجے میں دکھ کا کوئی عنصر نہ تھا۔) میں نے اللہ کا بڑا شکر ادا کیا کہ وہ مر گیا...... اگر زندہ ہوتا تو شیطان ہوتا اور میرے لیے ایک عذاب ہوتا۔"

یہ سن کر ہم حیران تھے کہ کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ ہم اُسے بڑی مصیبت گردانتے ہیں۔ لیکن بڑے شاہ صاحب اِس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ یہ دراصل مصیبت پر شکر کا ایک انداز تھا۔ بیگم کے مرنے کا ذکر بھی وہ اِس انداز میں کرتے کہ اِس میں شکر گزاری کا پہلو نمایاں ہوتا۔

ہمیں دقت وہاں آتی ہے جہاں ہماری تمام تر زندگی کا محور دُنیاوی آسائشیں اور کامیابیاں بن جاتی ہیں۔ اگر ہم نے یہ دیکھنا ہو کہ ہم دُنیا کی فکر میں کس قدر گھل رہے ہیں تو ٹی وی پر چلنے والا پروگرام "استخارہ" دیکھ لیں۔ اِس طرح کے پروگراموں کو پروگرام سمجھ کر نہ دیکھیے بلکہ ایک Case Study سمجھ کر کیجیے۔ کال کرنے والے سو فی صد لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جتنے لوگ بھی اِن پروگراموں میں دُعا کے لیے درخواست کر رہے ہوں گے، اُن کی دُعا کا مقصد دُنیا کا حصول ہوگا۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان اُس چیز کے لیے فکر مند ہوتا ہے جو چیز اُس کے لیے اہم ہوتی ہے اور جس کی چاہت اُس کے دل میں ہوتی ہے۔ اِن پروگراموں کو میں نے بہت گہرائی سے دیکھا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی پروگرام میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے آخرت میں بہتری کے لیے کوئی سوال کیا ہو۔

عجیب بات ہے کہ مجھے بھی یہ دعویٰ ہے کہ میں آخرت کے لیے بہت پریشان ہوں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ

میں نے کبھی اُس کے لیے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ کبھی لمحہ بھر کے لیے خیال آیا بھی کہ رخصت کا وقت قریب آن پہنچا کس منہ سے اللہ کے حضور جاؤ گے، تو اگلے ہی لمحے اس خیال کو جھٹک کر دُنیاوی مصروفیات میں اُلجھ گیا۔
آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑھاپے میں زیادہ تر والدین کو اولاد کے ہاتھوں خواری اُٹھانا پڑتی ہے۔ (زیادہ تر کا لفظ استعمال کر رہا ہوں ورنہ بہت سعادت مند بچے بھی ہیں۔
ماں باپ اکثر دربدر ہو جاتے ہیں۔ ڈگری کا فرق ہے لیکن اکثر والدین کو یہ خواری برداشت کرنا پڑتی ہے۔ جس قدر ہم دُنیا کے لیے فکر مند رہتے ہیں اُس کا نصف بھی اگر ہم آخرت کے لیے فکر مند ہو جائیں تو دُنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سنور جائے گی۔ یہ باتیں تلخ ضرور ہیں...... دل کو اچھی بھی نہیں لگتیں ......لیکن بہرحال سچ ہیں۔

سوال: شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: دُعا کی طرح شکر بھی ایسی کیفیت ہے جس کا مختلف اولیائے کرام نے مختلف انداز میں ذکر کیا ہے۔ اُن کے نزدیک شکر ادا کرنے کے پانچ طریقے ہیں:

1۔ زبان سے شکر
2۔ قلب سے شکر
3۔ عملی شکر
4۔ آنکھوں سے شکر
5۔ کانوں سے شکر

1۔ زبان سے شکر

جب کوئی انسان زبان سے شکر ادا کرتا ہے تو اِس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نہایت عاجزی سے نعمت عطا کرنے والے کا احسان بھی مانے اور اُس کی تعریف بھی بیان کرے۔

2۔ قلب سے شکر

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہایت عاجز گنے اور دل میں مان لے کہ اللہ نے مجھے جو بھی نعمتیں عطا کی ہیں، میں ہرگز اُن کے لائق نہیں تھا، لیکن رب تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان کیا اور مجھے یہ سب نعمتیں عطا کیں۔

3۔ عملی شکر

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اُن حدود کے اندر رہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طے کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنے ارادوں کو فنا کردے اور اپنے عمل کو اللہ کے ارادوں کے تابع کردے۔

4۔ آنکھوں سے شکر

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے کسی میں عیب، خامی یا بُرائی دیکھے تو اُس کی پردہ پوشی کرے۔ دیکھی ہوئی بات کو وہیں دفن کردے اور کسی کے سامنے اُس کو بیان نہ کرے۔

5۔ کانوں سے شکر

کانوں سے شکر یہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی عیب یا خامی سنے تو اُسے آگے بیان نہ کرے بلکہ اُسے پوشیدہ رکھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک دُنیادار، ایک عابد اور ایک فقیر کی شکر گزاری میں کیا فرق ہے؟

پہلا شکر (زبان سے) دُنیادار یا عالم کا ہے۔

دوسرا شکر (قلب سے) عابد کا ہے۔

تیسرا شکر (عملی شکر) فقیر کا ہے۔

فقیر کا طریقہ بہت اعلیٰ ہے...... فقیر خود کو اللہ کی صفات اور اُس کے نور میں فنا کردیتا ہے۔ اُس کی اپنی ہستی ختم ہوجاتی ہے اور وہ فنافی اللہ ہوجاتا ہے۔

میرے نزدیک شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان صدقِ دل سے یہ سمجھے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ میرا نہیں، میری محنت کی کمائی نہیں بلکہ میرے رب تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے اُس پر میرا صرف اِتنا حق ہے کہ میں اپنے اہلِ خانہ کی اور اپنی جائز ضروریات پوری کرلوں وہ جائز ضروریات پوری ہوجانے کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے، اُس پر اللہ کے بندوں کا حق ہے خواہ کوئی بھی آکر لے جائے...... وہ کسی کے بھی کام آجائے۔

جب انسان اُس بچے ہوئے رزق سے کسی کی خدمت کرے تو ذہن میں یہ نہ آئے کہ میں کسی کی خدمت کررہا ہوں بلکہ وہ اُس آدمی کا احسان مند ہو جس کی اُس نے خدمت کی...... یہ سوچ کر کہ اُس نے مجھ سے اپنا حصہ بروقت وصول کرکے مجھے فرائض سے بری الذمہ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اِسی بات کو مختصر الفاظ میں یوں بیان فرمایا تھا کہ

فقیر پر لازم ہے کہ وہ دوسرے کی خدمت اِس طرح کرے کہ خود خدمت لینے والا یہ سمجھے کہ اُس نے خدمت لے کر اُس فقیر پر احسان کیا ہے۔

لوگوں کی اِس انداز میں خدمت عملی شکر ہے۔

کامیاب کون؟

سوال: صرف علم کافی ہے یا عمل بھی؟

جواب: پاکستان میں نوے (90) فی صد لوگ اِس وہم میں مبتلا ہیں کہ اُن پر کسی نے جادو یا تعویذ کر دیے ہیں۔ اس نشست میں میری کوشش ہوتی ہے کہ ہم سب کے Concepts (تصورات) Clear ہو جائیں...... کیونکہ جب ہمارے اسلام کے بارے میں Concepts clear ہو جائیں گے تو ہمیں صحیح راستہ از خود ملتا چلا جائے گا۔ ہم لمبا چوڑا علم سیکھنے کے بجائے ایک چھوٹا سا کام کریں کہ زندگی میں کوئی بھی قدم اُٹھانے یا فیصلہ کرنے سے پہلے ہم یہ Recall کریں کہ آپ ﷺ نے ایسے کسی بھی موقع پر کیا عمل فرمایا تھا۔ اگر میرا ہمسایہ مجھے تنگ کرتا ہے، کوڑا میرے دروازے کے سامنے پھینک دیتا ہے تو میں اُسے ہنس کر برداشت کرلوں۔ یوں پڑوسی کے معاملے میں آپ ﷺ کی سنت پر عمل شروع کر دوں گا۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص مجھے گالی دیتا یا بُرا بھلا کہتا ہے...... میرے خلاف سازشیں کرتا ہے تو میں آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اُسے معاف کر کے دُعا دے دوں گا۔ ان دو باتوں پر عمل کرنے سے میں Start لوں گا اور ہر مہینے مزید ایک یا دو سنتوں پر عمل کرتا چلا جاؤں گا۔ میرا ایمان ہے کہ سنت پر عمل کر کے میں درحقیقت قرآن پر عمل کر رہا ہوں گا کیونکہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ عملی قرآن ہے۔ یوں اپنے عمل کی بدولت میں رب تعالیٰ کو عزیز ہو جاؤں گا۔

علم حاصل کرنا اچھی بات ہے...... اِس کے حصول کے لیے کوشش کیجیے لیکن پہلے جو علم آپ کے پاس موجود ہے اُس پر عمل کر لیجیے۔ عمل کرنا Theories کی نسبت زیادہ اہم ہے۔

سوال: ایک کامیاب انسان بننے کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: تقدیر مبرم یا معین تو تقدیرِ کل کا پانچ سے دس فی صد حصہ ہے۔ نوے سے پچانوے فی صد تو تقدیر معلق ہے جس میں قادرِ مطلق رب نے انسان کو اختیارات عطا کر دیے۔ اِسے Freedom of thought (خیال کی آزادی)، Freedom of decision (فیصلے کی آزادی) اور Freedom of Action (عمل کی آزادی) عطا فرما دی کہ جو چاہو سوچو، جو چاہو فیصلہ کرو اور جس طرح چاہے اُس پر عمل کرو۔ تمھیں یہ سب کرنے کا اختیار ہے لیکن یاد رکھو کہ تمھیں لوٹ کر میرے پاس ہی آنا ہے۔ اگر میرے مقرر کردہ

Parameters کے مطابق زندگی گزاری تو انعام ورنہ سزا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیارات اور آزادی عطا کر دی لیکن انگریز کے ایک قول کے مطابق "ایک انسان کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے۔"

لہٰذا جہاں انسان کے کسی فعل سے اللہ تعالیٰ کی کائنات کے Delicate system میں کوئی رخنہ آنے کا اندیشہ ہو تو رب تعالیٰ جو مختارِ کل ہے، وہ اپنی Veto power استعمال کرتے ہوئے انسان کو اُس فعل سے روک دے گا۔ جس طرح ماں اپنے بچے کو پورے گھر میں کھیلنے کی اجازت دیتی ہے لیکن جونہی بچہ آگ کا شعلہ چھونے کی کوشش کرتا ہے، ماں ایک دم اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک دیتی ہے۔

انسان بڑی Complex مخلوق ہے۔ بظاہر تو یہ جسم اور قلب (رُوح) پر مشتمل ہے۔ انسانی جسم کی Formation میں چار بنیادی عناصر مٹی، ہوا، پانی اور آگ شامل ہیں۔ پھر رب تعالیٰ نے اس میں ہر طرح کی خصلتیں رکھ دیں۔ اس میں چرند، پرند اور درند کی خصوصیات بھی ہیں...... شیطانی صفات بھی ہیں، فرشتوں کی سی خصلتیں بھی موجود ہیں (یہ جسم کی بات کر رہا ہوں، رُوح کی نہیں)۔ تمام انسانی خصوصیات کا تعلق اس بات سے ہے کہ اُس کا زندگی گزارنے کا ڈھب کیا ہے۔ اگر محض کھایا پیا اور سو گئے باقی کچھ نہ کیا تو سمجھ لیں کہ یہ حیوانی طرزِ زندگی ہے۔ اگر شیطانی صفات مثلاً غصہ، شرارت اور شر وغیرہ کو اپنا لیا اور باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیا تو شیطان کے پیروکاروں میں داخل ہو گئے۔ اگر انسان فرشتوں کی سی صفات کے حصول کا خواہش مند ہوا تو وہاں اس کا دوسرا حصہ یعنی قلب یا رُوح Counter ہو جائے گا۔ تب انسان رحمانی صفات کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اُن رحمانی صفات کو اخلاص سے اپنا کر رب تعالیٰ کا قرب حاصل کر لے گا۔ جب اُسے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے گا تو وہ رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔ یاد رکھیے! رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ صرف رحمانی صفات کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس طرح جسم کے چار بنیادی عناصر ہیں، اُسی طرح قلب یا رُوح کے بھی چار Ingredients ہونے چاہییں۔! لیکن ہم رُوح پر زیادہ بات نہیں کر سکتے کیونکہ آپ ﷺ نے رُوح کو Discuss کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رُوح کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کہہ دو کہ یہ امرِ الٰہی ہے! اس لیے رُوح کی ماہیت پر بات نہیں ہو سکتی البتہ رُوح کی لطافت کو بڑھانے والے عوامل پر گفتگو ممکن ہے۔ مثلاً اگر شیطانی اور حیوانی صفات کو قابو کر لیا جائے تو رُوحانی پرواز میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ شیطانی صفات کو قابو کرنا بالکل ایسے ہے کہ جیسے آپ ایک منہ زور گھوڑے کو رام کر لیں تو اُس کی تمام Energies (توانائیاں) آپ کے کام آنے لگیں گی۔ وہ منہ زور گھوڑا ایک عام گھوڑے کی نسبت بہت تیزی سے آپ کو ایک سے دوسری جگہ پہنچا دے گا کیونکہ اُس کی Energies ایک خاص Direction (سمت) میں Tame ہو چکی ہیں۔

اسی طرح اگر آپ نے غصہ کو Tame کر لیا تو اُسے بطور ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ پھر یہ غصہ تباہی اور

تخریب کاری کا ذریعہ بننے کے بجائے نفس کو قابو کرنے کے کام آئے گا۔ نفس کو قابو کرنے کا ایک آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی نفی شروع کر دیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ تھکے ہوئے ہیں اور آپ کا دل آرام کرنے کو چاہ رہا ہے تو آپ اِس کی نفی کرنے لگیں...... یہ جسم کا حق ہے کہ اِسے آرام پہنچایا جائے۔

نفس کی نفی سے مراد یہ ہے کہ اگر نماز کے وقت میرا نفس مجھے سونے پر مجبور کرتا ہے تو میں اس کی نفی کر دوں۔ اگر یہ ذائقہ دار کھانوں کی فرمائش کرتا ہے تو میں اسے Tame کرنے کے لیے بدذائقہ کھانے کھلاؤں تاکہ یہ خواہش کرنا بند کر دے۔ اگر نفس مجھے گناہوں کی طرف راغب کر رہا ہے تو میں اُس وقت عبادت میں مصروف ہو جاؤں...... اِس طرح نفس Tame ہوتا چلا جائے گا۔

نفس کی نفی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے...... اگر کوئی شخص آ کر مجھے بُرا بھلا کہتا ہے، گالیاں دیتا ہے تو میں چاہنے کے باوجود اُسے گالی نہ دوں۔ آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے گالی دینے والے کو مسکراہٹ سے جواب دوں۔ اگر کوئی شخص میرے خلاف پراپیگنڈا کرتا ہے تو میرا نفس کہتا ہے کہ میں بھی جواب میں پراپیگنڈا کروں اور اگر میں جوابی پراپیگنڈا کی پوزیشن میں نہیں ہوں تو میں اُس شخص کے خلاف ہو جاؤں گا اور ہر جگہ اُسے بُرا بھلا کہنے لگوں گا۔ ایسے لمحوں میں اگر میں یہ دیکھ لوں کہ آپ ﷺ کی سنت کیا ہے اور اُس سنت مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے میں اُس شخص کو نہ صرف معاف کر دوں بلکہ اُس کے ساتھ بھلائی کا سلوک کروں تو اس سے میرا نفس قابو میں آ جائے گا۔ اِسی طرح اگر کسی شخص نے مجھ سے اپنی ضرورت کے لیے قرض لیا اور وہ وقت مقرر پر لوٹا نہ سکا تو بجائے اُسے بُرا بھلا کہنے کے میں آپ ﷺ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اسے وہ قرض معاف کر دوں یا پھر اُسے اِتنی مہلت دے دوں کہ وہ بآسانی قرض کی رقم واپس کر سکے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے دشمنی کرتا رہا مگر پھر چل کر میرے پاس آ گیا تو میں آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اُسے معاف کر دوں اور سینے سے لگا لوں۔

یہ طرزِ عمل اختیار کر کے ہم نفس کی نفی کر سکتے ہیں۔ جس قدر نفس کی نفی ہوتی ہے اُسی قدر رُوح لطیف ہونے لگتی ہے اور جوں جوں رُوح لطیف ہوتی چلی جاتی ہے توں توں اُس کی پرواز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر ہم رُوحانی طور پر اِس عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں۔ عالمِ خلق وہ ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ خلق کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا اندازہ کرنا یا کسی چیز کو Measure کرنا۔ چونکہ اِس دُنیا میں ہر چیز Quantity اور Mass پر Measure ہوتی ہے اِس لیے اِس جہان کو رُوحانی زبان میں عالمِ خلق بھی کہا جاتا ہے۔ جب کہ عالمِ امر وہ ہے جو Quantity اور Mass سے Beyond ہے۔ لطافت کی صورت میں عالمِ امر کی طرف رُوح کی پرواز بڑھ جاتی ہے اور اُسے عجائباتِ عالم کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔

عجائباتِ عالم کا مشاہدہ اِس لیے ضروری ہے کہ جب تک ہم کسی صانع کی مصنوعات کو نہیں دیکھیں گے تب تک اُس کے کمال کا ہمیں اندازہ نہیں ہو پائے گا...... جب تک آپ کسی مصور یا آرٹسٹ کی بنائی ہوئی Paintings نہیں دیکھتے تب تک اُس آرٹسٹ کے فن کی گہرائی و بڑائی اور بلندی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اِسی

طرح جب تک عجائباتِ عالم کا مشاہدہ نہ ہو تب تک رب تعالیٰ کی بڑائی اور بزرگی کا اِدراک نہیں ہوتا۔ ایک مقام وہ ہے جہاں انسان رب تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے...... اُس مقام پر پہنچنے سے پہلے عجائباتِ عالم کا مشاہدہ ضروری ہے۔ اِس مشاہدہ سے صحیح معنوں میں رب تعالیٰ پر یقین اور بھروسا پیدا ہونے لگتا ہے...... ورنہ عالم خلق میں رب تعالیٰ پر یہ بھروسا اور یقین محض Lip service تک محدود رہتا ہے جس کا مظاہرہ شب و روز ہمیں اپنے اردگرد دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان رب تعالیٰ کو مالکِ کل اور قادرِ مطلق جانتا ہے۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کے حکم کے بغیر پتا تک نہیں ہل سکتا وہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر رب نہ چاہے تو کوئی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اگر رب تعالیٰ کی مرضی نہ ہو تو کوئی لاکھ کوشش کے باوجود کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اِس سارے یقین اور بھروسے کے باوجود وہ شخص آپ کو یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ صاحب! کسی نے میرا رزق باندھ دیا ہے۔ میرا کام روک دیا ہے۔ مجھ پر جادو کر کے میرے تمام کاموں میں رکاوٹیں ڈال دی ہیں۔ اب وہ شخص زبان سے تو رب تعالیٰ کو قادرِ مطلق، مالکِ کل اور رزاق مانتا ہے لیکن اُس کا عملی یقین اِس زبانی کلامی یقین کے برعکس ہے۔ اُس کا عملی یقین یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جادو یا تعویذ کے زور سے اُس کا رزق باندھ سکتا ہے۔

عجائباتِ عالم کے مشاہدہ کے بعد یہ کیفیت ختم ہونے لگتی ہے اور واقعتاً صحیح معنوں میں رب تعالیٰ پر Believe کے ساتھ ساتھ Trust بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ عجائباتِ عالم کا مشاہدہ کرتے کرتے ایک مقام پر جا کر انسان رب تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اُسے رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔

ضروری ہے کہ انسان جسم کے بجائے قلب (رُوح) کی پرورش کرے۔ جب میں ''قلب'' کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اِس سے مراد ''رُوح'' ہے ورنہ دل تو محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور رُوح کی سواری اور رہائش ہے۔ ہم قلب (رُوح) کی پرورش کے لیے لمبی چوڑی ریاضت اور مجاہدوں میں گم ہونے کے بجائے ایک آسان سا کام یہ کریں کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کریں اور کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے Recall کر لیں کہ ایسے کسی بھی موقع پر آپ ﷺ کا طرزِ عمل یا رویہ کیا تھا۔ ہم آنکھیں بند کر کے اُس کی نقل کر لیں...... اِس نیت سے نہیں کہ میری دُنیا سنور جائے گی بلکہ اِس نیت سے کہ میری آخرت سنور جائے گی اور مجھے رب تعالیٰ کا قرب اور دوستی عطا ہو جائے گی۔ یہ طریقۂ کار اپنا کر ہم اپنے قلب کی پرورش کر سکتے ہیں۔

یاد رکھیے! رب کے قرب اور اُس کی دوستی کا حصول اِتنا بڑا اعزاز ہے کہ اِس سے بڑھ کر کوئی اعزاز ہو نہیں سکتا...... ! رب تعالیٰ ہمارا خالق و مالک اور آقا ہے۔ جس طرح ہم دُنیا میں اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ پرائم منسٹر یا President میرا دوست ہے اور میں اُن کے گھر آزادانہ جا سکتا ہوں...... ہم اُن کے ساتھ دوستی میں فخر اور Safe محسوس کرتے ہیں کہ اِس دوستی کی وجہ سے ہمارا کوئی کام نہیں رُکے گا...... رب تعالیٰ تو سب جہانوں کا مالک ہے، اگر اُس کی دوستی ہمیں نصیب ہو گئی تو پھر کسی کام کے رُکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے قرب اور دوستی کے حصول اور اپنی عاقبت سنوارنے کی غرض سے آپ ﷺ کی سنت کو Follow کرنا شروع کر دیا تو پھر ہو گا یہ کہ ہم لحہ بہ لحہ یہ سوچیں گے کہ ہم اپنے اس عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ مثلاً اگر میں کہیں ملازمت کر رہا ہوں تو اس خوف سے بالکل صحیح وقت پر دفتر جاؤں گا کہ دفتر کا وقت آٹھ بجے ہے اور میں تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں رب تعالیٰ کو جواب دہ ہوں کہ میں نے اوقاتِ کار میں ڈنڈی کیوں ماری...... ! یہ بد دیانتی ہے۔ جس سے بچنے کے لیے مجھے صحیح وقت پر دفتر پہنچنا چاہیے اور ٹھیک وقت پر چھٹی کرنی چاہیے۔ جواب دہی کے اس احساس کے تحت میں دفتری اوقات میں پوری دل جمعی اور محنت سے یہ سوچ کر کام کروں گا کہ میرا یہ وقت میرے دفتر نے خرید رکھا ہے اور اِسے میں نے دفتر کے معاملات و اُمور کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ میرے اِس رویے کے نتیجے میں میری Output بہتر ہو جائے گی جس سے میں اپنے Boss یا آجر کا چہیتا ہو جاؤں گا۔ اُس کا چہیتا ہونے کا مطلب یہ ہو گا کہ گویا میری ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

میری بہترین کارکردگی کی وجہ سے میرے Colleagues کے دل میں میری عزت بڑھ جائے گی۔ وہ سوچیں گے کہ یہ بہت Proficient انسان ہے۔ اِسی طرح جب میں کسی معاملہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، غلط بیانی نہیں کروں گا تو پورے آفس میں میری دھاک بیٹھ جائے گی کہ صاحب! یہ بہت سچا انسان ہے۔ میرے اِس رویے کی وجہ سے لوگ مجھ پر اعتبار بھی کریں گے اور میری عزت بھی کریں گے۔ میری Honest Dealings کے نتیجے میں مجھ پر Blind faith رکھیں گے۔ اِس سلسلے کو آگے بڑھاتے جائیے حتیٰ کہ آپ کو احساس ہو گا کہ میں بہت ہی نیک کردار انسان گنا جانے لگا ہوں۔ ہر انسان مجھ پر بھروسا کرتا ہے اور آنکھیں بند کر کے مجھ پر یقین کرتا ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو گی تو دفتر میں جب بھی ترقی کی بات آئے گی تو سب سے پہلے میرا نام Consider ہو گا۔

اِس مثال کو آپ سیاست پر منطبق کر لیں۔ اِسی طرح بحیثیت فیملی ممبر اگر آپ کا یہی کردار ہے کہ آپ گھر والوں کے لیے گھنا شجر تو ہیں ہی لیکن رشتہ دار و احباب کو مصیبت و مشکل میں دیکھ کر رضا کارانہ طور پر اپنے موجود وسائل سے اُن کی مدد کرتے ہیں اور اِس خدمت کے صلے کی توقع رکھنا تو در کنار کسی سے اِس کا ذکر تک نہیں کرتے تو رفتہ رفتہ آپ اپنے خاندان میں سب سے باعزت اور ہر دلعزیز انسان شمار ہونے لگتے ہیں۔

اِس لیے میں عرض کر رہا تھا کہ درویش سے زیادہ Successful شخص شاید ہی آپ کو ملے گا۔ اللہ کو حاصل کرتے کرتے دُنیا As a by-product خود بخود ہی آپ کو مل جاتی ہے۔ لیکن اگر میں Elbow کے زور پر دُنیا حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوں تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو ہم ہر روز اپنے گرد و پیش میں دیکھتے ہیں۔ میں ہر وقت پریشان رہوں گا...... کسی پیر صاحب کی تلاش میں رہوں گا کہ دُعا کراؤں کہ میرا کام کسی نے روک دیا ہے، جادو یا تعویذ کر کے میرا رزق باندھ دیا ہے، خدا کے لیے اس کا توڑ کر دیں، ہو گا یہ کہ وہ پیر صاحب اپنی فیس چارج کرتے کرتے میرے کپڑے تک بکوا دیں گے۔

حالاں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے ناخوش گوار حالات کے پس پردہ اصل وجہ وہ نہیں جس کا اظہار میں پیر صاحب کے سامنے کر رہا ہوں بلکہ اصل وجہ میری حد سے زیادہ آگے بڑھنے کی خواہش ہے۔ میرے Ambitions دراصل Over-ambitions کے درجے میں چلے گئے ہیں اور میں آگے بڑھنے کے لیے ہر جائز و ناجائز رویہ اپنائے ہوئے ہوں۔ میں Elbow کے زور پر آگے بڑھنا چاہتا ہوں لیکن کون مجھے ایسے آگے بڑھنے دے گا۔ مجھے ہر مقام پر مزاحمت اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا...... جس کی وجہ سے میری رفتار مدھم ہو جائے گی اور اِس سست رفتاری کی وجہ سے میں پیچھے رہ جاؤں گا۔ ایسے میں کسی دُعا کرنے والے، تعویذ کرنے والے یا عامل کے پاس جاؤں گا لیکن وہ بھی میرے مسائل کو حل نہیں کر پائیں گے جس کی وجہ سے میں آگے نہیں بڑھ پاؤں گا...... یوں دُنیا کے لیے کوشش کرنے سے سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ دُنیا بھی ہاتھ سے گئی اور آخرت بھی۔ لیکن جب آپ نے اپنی آخرت سنوارنے اور رب کے قرب اور دوستی کے حصول کے لیے کوشش کی تو دونوں جہان خود بخود آپ کے ہو گئے!

اِس لیے میں زور دیتا ہوں کہ اگر ہم بغیر یہ دیکھے کہ اِس سے حاصل کیا ہوگا، رب تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے آپ ﷺ کی سنت پر Humanly possible حد تک عمل کرتے چلے جائیں...... خاص طور پر اگر آپ اِسے اپنی روزمرہ زندگی کا وتیرہ بنالیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے زیادہ Successful دُنیا میں کوئی نہیں ہوگا!

سوال: جادو تو آپ ﷺ پر بھی ہوا تھا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

جواب: آپ ﷺ کا معاملہ مختلف ہے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے ایسے حبیب اور محبوب ہیں جو وجہ تخلیق کائنات ہیں...... آپ ﷺ سے اللہ کا عشق اس درجے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کوئی کام نہیں کرتا محض احکامات جاری کرتا ہے...... وہ جو واحد کام کرتا ہے وہ آپ ﷺ پر درود بھیجنا ہے۔ ایسی بلند و بزرگ ہستی پر ایک دُنیا دار یہودی جادو کر دے، یہ ممکن ہی نہیں۔! لیکن جادو ہوا، وجہ یہ تھی کہ جس طرح رب تعالیٰ نے یہ چاہا کہ وہ ہم میں سے بصورت بشر ایک نبی پیدا کرے تا کہ ہم میں سے کسی کو یہ حجت نہ رہے کہ ہم آپ ﷺ کی سنت پر کیسے عمل کر سکتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ تو ماورائے بشریت ہیں......! ہماری یہ حجت ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نہ صرف بصورت بشر پیدا فرمایا بلکہ اُن تمام سختیوں، مشکلوں اور آزمائشوں سے بھی گزارا جن سے ایک عام انسان کو گزرنا پڑ سکتا ہے۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو نیکی کی طرف بلایا تو اہلِ قریش کا ناروا سلوک آپ کے سامنے ہے۔ طائف میں آپ ﷺ کا خون پاؤں کی ایڑیوں تک بہہ گیا لیکن پھر بھی آپ ﷺ اہلِ طائف کے لیے دُعا گو ہی رہے۔ اسلام کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے اُوپر اوجڑیاں تک پھینکیں لیکن آپ ﷺ کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ آپ ﷺ کی اولادِ نرینہ آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے دُنیا سے رُخصت ہو گئی حتیٰ کہ کفار نے آپ ﷺ کو ابتر تک کہا لیکن آپ ﷺ نے صبر و برداشت اور تحمل و بردباری کی انتہا کر دی۔ آپ ﷺ

کی وہ لاڈلی اور عزیز بیٹی کہ جن کی آمد پر آپ ﷺ تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور اپنی چادر مبارک زمین پر بچھا کر اُس پر اُنھیں بٹھاتے۔ اُس پیاری بیٹی کے ہاتھوں پر آپ ﷺ نے مسلسل چکی چلانے کی وجہ سے چھالے پڑے بھی دیکھے اور مسلسل پانی کی مشک اُٹھانے سے کندھے پر پڑنے والا Strap کا نشان بھی آپ ﷺ کے علم میں تھا۔ پھر آپ وہ ہستی کہ جنھوں نے فاقے بھی کیے، پیٹ پر دو دو پتھر باندھ کر جنگیں بھی لڑیں، یہودی سے قرض لے کر ضرورت مندوں کی مدد بھی کی اور دو جہانوں کے سردار ہونے کے باوجود اُس یہودی کی سخت باتیں بھی برداشت کیں...... حالانکہ آپ ﷺ چاہتے تو کوہِ اُحد پورے کا پورا سونے کا ہو جاتا...... لیکن وجہ تخلیق کائنات اور آقائے دو جہاں ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے ہر قسم کی سختی، تنگی، مصیبت اور تکلیف انتہائی خندہ پیشانی سے برداشت کی۔

آپ ﷺ پر جادو کا اثر ہو جانا بھی دراصل اُمت کی تربیت کا ایک طریقہ تھا۔ اُمت کو یہ بتانا مقصود تھا کہ جب کبھی ایسی صورت حال ہو تو معوذتین (سورۂ فلق اور سورۃ الناس) اِس جادو کو توڑ دیں گی۔

ہم یہ تو دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر جادو ہو گیا تھا لیکن افسوس! کہ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ آپ ﷺ نے تو تب کسی سے یہ نہیں کہا کہ مجھ پر اِس جادو یا تعویذ کے ذریعے کسی نے بیماری طاری کر دی ہے یا میرا رزق باندھ دیا ہے (معاذ اللہ!)۔ ہمیں اِس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ اِس موقع پر آپ ﷺ کا عمل کیا تھا۔ آپ ﷺ کا کسی بھی موقع اور صورت حال میں کبھی بھی رب تعالیٰ پر یقین و ایمان اور بھروسا متزلزل نہ ہوا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے کلام (معوذتین) کو استعمال کیا تو جادو سے نجات مل گئی۔ یہ جادو اور اُس کا توڑ سب اُمت کی تربیت کا طریقہ تھا اور کچھ نہیں تھا۔

سوال: رب تعالیٰ کی تجلیات سے کیا مراد ہے؟

جواب: ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو میں رب تعالیٰ کی تجلیات کو ''رب کے کارخانۂ قدرت'' کے معنوں میں مَیں استعمال کر رہا تھا۔ رب تعالیٰ کا کارخانۂ قدرت ایک عام آدمی کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے لیکن جب کوئی شخص رب تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو رب تعالیٰ اُسے سب سے پہلے عجائباتِ عالم کی سیر کراتا ہے۔ جب اُس کی رُوح کی لطافت بڑھ جاتی ہے تو رب تعالیٰ اُسے کارخانۂ قدرت کی سیر کرانے لگتا ہے۔

آپ نے بہت سے بزرگوں کے بارے میں پڑھا ہو گا کہ اُنھوں نے جیتے جی جنت کی سیر کی اور اُس کے ایک حصے کو دیکھا، فرشتوں کو دیکھا، مختلف آسمانوں کے درمیان آباد جہانوں کی سیر کی...... یہ سب کارخانۂ قدرت کا حصہ ہے۔ میں رب تعالیٰ کی تجلیات کو بمعنی کارخانۂ قدرت بیان کرتا ہوں......

جس طرف آپ کا دھیان گیا ہے...... رب تعالیٰ کی اُس تجلی کا مشاہدہ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا...... جب کہ تجلیاتِ رب سے یہاں میری مراد اللہ کا نور نہیں بلکہ کارخانۂ قدرت کا مشاہدہ ہے جو عام آدمی کی نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ کسی انسان کی تابعداری اور فرماں برداری سے خوش ہو کر رب تعالیٰ اُسے اجازت دے دیتا ہے کہ وہ اُس کے کارخانۂ قدرت کا ایک حد تک مشاہدہ کر سکے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ

بذاتِ خود بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ اعزاز عطا کر دے تو اُسے اللہ تعالیٰ کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ یہ مشاہدہ رب تعالیٰ پر یقین کا کام کرتا ہے۔

سوال: مرشد کیوں ضروری ہے؟

جواب: جب ایک بچہ حصولِ تعلیم کا آغاز کرتا ہے تو اُس کی والدہ اُس کی Energy اور Trends کو ایک Certain direction کی طرف Channelize کر رہی ہوتی ہے۔ یوں وہ بچہ گھر سے ابتدائی قاعدہ پڑھنے اور الف، ب، پ پڑھنے کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہ سکول میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اُس کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سکول ٹیچر اُس بچے کو ایک Particular direction میں حصولِ تعلیم میں راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اب آپ کا یہ سوال کہ مرشد کی کیوں ضرورت ہے؟

ایک بچہ بازار سے کتابیں خرید کر لاتا ہے، گھر میں بیٹھ کر بغیر کسی راہنمائی کے امتحان کی تیاری کرتا ہے، پھر امتحان دیتا اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتا ہے۔ دوسرا بچہ کتابیں خرید کر لاتا ہے، ٹیوٹر کی مدد سے تیاری کرتا ہے، امتحان میں بیٹھتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتا ہے۔ تیسرا بچہ سکول پھر کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ماسٹرز ڈگری حاصل کر لیتا ہے۔ اب ان تینوں طالب علموں کے پاس ماسٹرز ڈگری ہے لیکن تینوں کی Personality اور Level of knowledge میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آپ تینوں کے سامنے ایک مسئلہ رکھیں اور اُنھیں حل کرنے کو کہیں۔ پہلا بچہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ٹامک ٹوئیاں مارے گا اور کچھ دیر بعد اُس کا حل Suggest کر دے گا۔ دوسرا بچہ کچھ بہتر حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا جب کہ تیسرا بچہ اُس کا سب سے بہترین حل پیش کرے گا کیونکہ زمانہ طالب علمی میں اُس کی Sportsman spirit, punctuality, regularity اور Group task کی عادت بہت بہتر ہو چکی ہوتی ہے...... اُس کی Personality grooming اور Personality building ہو چکی ہوتی ہے۔

مرشد کا رول اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ آپ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی غیر محسوس انداز میں تربیت کرتا ہے۔ وہ Through advice نہیں بلکہ Personal example کے ذریعے آپ کی تربیت کرتا ہے۔ آپ لاشعوری طور پر اُسے کاپی کرنے لگتے ہیں، یوں آپ کی Personality کی Grooming ہونے لگتی ہے...... اس لیے مرشد ضروری ہے۔

لیکن یہ کہنا کہ صاحب! مرشد کے بغیر دُنیا میں کچھ نہیں...... یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ رب سب کا ہے۔ آپ رب کے ساتھ اپنا تعلق براہِ راست قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ آپ سے ہرگز نہیں کہے گا کہ آپ کسی وسیلہ کے ذریعے اُس تک آئیں کیونکہ وہ تو مالک و آقا ہے آپ کا۔ بحیثیت ادنیٰ غلام ہمارے بھی فرائض

ضروریات کے لیے صرف اُسی کی طرف دیکھیں...... مشکل میں اُس کی طرف رُجوع
ں چاہیں، اُسی سے مدد مانگیں یہ ہمارا حق ہے رب تعالیٰ پر اور وہ ہمارا حق ادا کرتے
ہ تم اپنے مرشد کے ذریعے مجھ تک کیوں نہیں آتے......!
ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ایک طالب علم کو اُستاد کی۔

حصولِ معرفتِ الٰہی میں قلب کا کردار

سوال: معرفتِ الٰہی کے حصول میں رُوح یا قلب کا کردار کتنا اہم ہے؟

جواب: انسانی جسم فنا ہو جائے گا۔ اِس کی Utility (افادیت) فنا ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن رُوح فنا نہیں ہوتی۔ رُوح کو تصوف میں حقیقت یا قلب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انسانی قلب اور بدن کا رشتہ اس طرح بنتا ہے کہ جسم قلب کا گھر یا مملکت ہے۔ جسم کے اعضا قلب کے مختلف کاموں کے لیے Instruments ہیں۔ ہمارا کھانا پینا جسم کی خوراک ہے تاکہ جسم توانا رہے اور قلب کے لیے کام کرتا رہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ بدن قلب کی سلطنت ہے، عقل وزیر ہے، غصہ ٹاؤن پولیس آفیسر کی مانند ہے، حواس سنسر کا کام کرتے ہیں اور خواہشات عوام کا درجہ رکھتی ہیں۔

جس طرح ایک سلطنت کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ وزیر، کوتوالِ شہر اور عوام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھا جائے تاکہ یہ اپنے فرائض مناسب طور پر انجام دیں اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے مختلف System devise کیے جاتے ہیں۔ جس طرح عوام میں اچھے، بُرے، جھوٹے سچے لوگ پائے جاتے ہیں اِسی طرح انسانی خواہشات جائز و ناجائز ہوتی ہیں۔ جس طرح پولیس شہر میں اِس کام پر مامور ہوتی ہے کہ مجرم آزاد نہ پھریں اور شرفا سکون سے زندگی بسر کرسکیں بالکل اُسی طرح عقل اِن خواہشات کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ جائز خواہشات کے پورا ہونے کا سامان کرتی ہے اور ناجائز خواہشات کو رد کر دیتی ہے۔ جہاں خواہشات بے لگام ہونے لگتی ہیں، وہاں غصہ Active ہوتا ہے اور انسان اس خواہش کو ختم کرنے کے لیے اپنے آپ سے لڑنے لگتا ہے۔ عقل کے ذمہ دوسرا کام بدن کی حفاظت ہے۔ جب کوئی Factor بدن کو نقصان پہنچاتا ہے تو غصہ Active ہو کر جسم کی حفاظت کرنے لگتا ہے۔

عقل اپنی حدود سے اس طرح تجاوز کرے گی کہ ہر وہ چیز جو انسانی مفاد میں ہے، اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور انسان کی کمائی ہوئی دولت اور وسائل کو اُس کی اپنی ذات تک محدود رکھنے کی جدوجہد کرے گی۔

قلب اگر طاقتور ہے تو ایک طاقتور بادشاہ کی طرح وزیر کو Veto کر دے گا اور اپنی مرضی چلائے گا۔ قلب عقل پر غالب آجائے گا اور انسان کی کمائی اور وسائل کو دوسروں کی بھلائی کے لیے صرف کر دے گا...... جو بظاہر گھاٹے کا سودا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اِس میں فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب قلب اِس مقام پر آجاتا ہے کہ جسم کی تمام چیزوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھے اور اُن سے مناسب کام لے تب اُسے اللہ کے قریب جانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ مشاہدۂ جمال کرنے لگتا ہے۔

اِس لیے بجائے عبادت پر زور دینے کے ہم نیکی پر توجہ دیں۔ فرض عبادات ضرور کی جانی چاہییں کیونکہ ہم اُن کے لیے جواب دہ ہیں لیکن وظائف واوراد کی نسبت ہم نیکی کمانے پر توجہ دیں...... اِس سے ہماری رُوح لطیف ہو جائے گی اور اُس کی پرواز بڑھ جائے گی جس سے رب کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ممکن ہوگا جب ہم جسم کو خوراک فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ رُوح کو بھی اُس کی غذا مہیا کریں۔

مثلاً نماز اسلام کا بنیادی رُکن ہے۔ اِس کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ''نماز بُرائیوں سے روکتی ہے۔'' آپ ﷺ سے صحابہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں کیسے پتا چلے کہ ہماری نماز قبول ہو رہی ہے یا نہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر نماز تمھیں بُرائیوں سے روک رہی ہے تو سمجھ لو کہ قبول ہو رہی ہے ورنہ نہیں۔''

گویا نماز کی قبولیت کی نشانی یہی ہے کہ وہ بُرائیوں سے روک دیتی ہے۔ نماز ایک کافر اور مسلمان کے درمیان تمیز کرتی ہے۔ اِس درجے کی اہم عبادت کی کسوٹی یہ رکھی گئی کہ وہ برائیوں سے روک دیتی ہے۔

برائیاں کیا ہیں......؟ کسی کا حق مارنا، دھوکا دینا، جھوٹ بولنا، ناجائز منافع خوری غرض یہ کہ مختلف بُرائیوں کی لمبی فہرست موجود ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے Overdose چلے گئے۔ اگرچہ اِس میں کسی قسم کی بدنیتی کو دخل نہیں تھا لیکن ہم نے یہ تاثر پیدا کر دیا کہ گویا منزل نماز ہے۔ اگر ہم نے نماز پڑھ لی تو ہماری نجات ہو گئی......! حالاں کہ اہمیت یوں بیان کی جانی چاہیے تھی کہ نماز وہ زینہ ہے جو ہمیں بُرائیوں سے بچا کر منزل پر پہنچا دے گا۔ یوں نگاہ اِس پر رہنی چاہیے کہ میں نماز صرف پڑھ رہا ہوں یا ادا کر رہا ہوں۔ نماز اِس وقت ادا ہوگی جب ہم بُرائیوں سے بچنا شروع ہو جائیں گے۔

ہمارے ہاں کچھ بُرائیاں اِس قدر رواج پا گئی ہیں کہ اب ہم انہیں بُرائی سمجھتے ہی نہیں۔ مثلاً جب ہم مل بیٹھتے ہیں تو غیر موجود شخص کے بارے میں ایسی گفتگو کرنے لگتے ہیں جس سے اُس کی عزت پر حرف آئے، وہ بدنام ہو جائے یا اُس کے عیب کھل کر سامنے آجائیں۔ حالانکہ قرآن پاک کی آیت ہم سب کو ازبر ہوتی ہے ''کیا پسند کرتا ہے تم سے کوئی شخص کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے......'' (سورۃ الحجرات:12)

غیبت کی سنگینی کا اندازہ اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار چند صحابہ کرامؓ ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب بہت گھبرائے ہوئے وہاں تشریف لائے اور کہنے لگے ''آج مجھ سے خود پر ایک بہت بڑا ظلم ہو

گیا۔ میں ایک غیر عورت کی طرف راغب ہو گیا۔" صحابہ کرامؓ نے فرمایا "ہم تو تمھیں اِس قدر پریشان حالت میں دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خدانخواستہ تم سے کسی کی غیبت سرزد ہو گئی ہے۔"

اگر ہم درست انداز میں نماز ادا کرنے لگیں تو غیبت جیسی معاشرتی واخلاقی بُرائی سے نجات پالیں گے۔

یہ میں نے ایک عبادت "نماز" کی مثال دی ہے۔ اگر ہم ہر طرح کی عبادت اُس کی اصل رُوح کے ساتھ کرنے لگیں تو رفتہ رفتہ تمام بُرائیوں سے چھٹکارا پاتے چلے جائیں گے۔

ہماری نظر اِس پر ہونی چاہیے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں یا ادا کر رہے ہیں! درست نماز وہی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھ، پاؤں، زبان اور کان بُرائیوں سے رُک جائیں۔

جس طرح جسم کی غذا کھانا پینا اور سونا ہے اِسی طرح قلب (رُوح) کی غذا خیال و فکر اور ذکر ہے۔ رب تعالیٰ کے ذکر سے مراد محض وظائف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ جو ہم اِس وقت گفتگو کر رہے ہیں یہ بھی رب تعالیٰ کا ذکر ہے۔ رب تعالیٰ کا ذکر بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے ہمارا دل اور دماغ یادِ الٰہی میں گم رہے گا اور یوں ہم بُرائیوں سے بچے رہیں گے۔ اِس سلسلے میں شرط یہی ہے کہ رب کا محض زبانی ذکر نہ کیا جائے بلکہ اس کے ذکر میں "مبتلا" رہا جائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ غور و فکر میں مبتلا رہیے! قرآن پاک کے کسی ایک نکتے کو پکڑ لیں اور اُس پر غور و فکر شروع کر دیں شروع میں صرف Brainstorning ہو گی، اِس سے گھبرائیے نہیں کیونکہ Brainstorming رفتہ رفتہ حقیقی غور و فکر میں بدل جائے گی...... جونہی آپ Contemplate (مستغرق ہونا) کرنے لگیں گے تو آپ پر حقیقت آشکار ہو جائے گی اور آپ مشاہدۂ جمال کرنے لگیں گے۔ آپ مصور کو اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اُس کے کام (Works) کو نہ دیکھ لیں، اُس پر غور نہ کر لیں۔ اُس کے Works کو جانے بغیر مصور کے ذہن کو پڑھا نہیں جا سکتا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔ حقیقت پر غور کر کے صناعی کھلنے لگے گی اور جہاں صناعی عیاں ہو گئی وہاں صناع (رب تعالیٰ) کی عظمت و بزرگی کا اِدراک بھی ہو گیا۔

جب کچھ نہیں تھا تو رب تھا۔ رب تعالیٰ نے چاہا کہ وہ ایسی مخلوق تخلیق کرے جو اُس کی ذات کا مظہر ہو۔ رب تعالیٰ نے اپنے نور سے دو حصے لیے نور المومنین اور نور العالمین۔ نور المومنین سے اُس نے تمام پیغمبروں جب کہ نور العالمین سے عام انسانوں کی ارواح کو تخلیق کیں۔ پھر انسانی رُوح کو اُس آسمان پر اُتارا گیا جہاں فرشتے رہتے ہیں...... وہاں اُس رُوح کو نور کا غسل دیا گیا۔ اُس مقام پر وہ رُوح انسانی The Pak Soul کہلائی۔ اِس کے بعد اُس رُوح انسانی کو تیسرے آسمان پر اُتارا گیا اور ایک بار پھر غسل دیا گیا جس کے بعد اُسے The moving soul کا نام دیا گیا۔ تب تمام ارواح کے متعلق احکامات صادر فرما دیے گئے کہ کس رُوح کو کب زمین پر جانا ہے۔ جس رُوح کا جسم زمین پر تخلیق ہو جاتا ہے وہ رُوح اپنے وقتِ مقررہ پر زمین کی طرف روانہ کر دی جاتی ہے اور انسان کے دل کے عین درمیان میں گہرائی میں وہ رُوح Pack کر دی جاتی ہے...... اُس انسانی رُوح کے ذمے صرف ایک ہی کام ہے کہ وہ اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھے۔

جب کوئی رُوح اپنے خالق کی طرف سرسری رُجوع رکھتی ہے تو انعام کے طور پر اُسے دُنیاوی آرام و آسائش عطا کر دیا جاتا ہے۔ جب رُوح اِس سے بڑھ کر رب تعالیٰ سے رُجوع رکھتی ہے تو اُسے گھر اور اولاد کا سکھ اور سکون عطا کر دیا جاتا ہے۔ جب کوئی رُوح اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ رب تعالیٰ کی طرف رُجوع کرتی ہے تو اُسے علم عطا کر دیا جاتا ہے۔ جب رُوح اس سے بھی بڑھ کر رب تعالیٰ کی طرف رُجوع رکھتی ہے تو اُسے عقل و فراست عطا کر دی جاتی ہے اور یاد رکھیے کہ Essence of wisdom خود رب تعالیٰ ہے! یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں حدیثِ مبارکہ ہے "مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ رب کے نور سے دیکھتا ہے۔" جب ہم غور و فکر کرنے لگیں گے تو پھر ہم پر حقیقت واضح ہو جائے گی اور مشاہدۂ جمال کا آغاز ہو جائے گا۔ اِس میں ہمارے حواس بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب ہمیں علم لدنی عطا ہوتا ہے تو ہمارے تمام حواس بہت زیادہ Sharp ہو جاتے ہیں۔ عموماً علم لدنی کے حصول کے بعد حسیات کی صلاحیت عام آدمی کی حسیات کی نسبت چھ گنا بڑھ جاتی ہے۔

اگر ہم تسبیحات اور اوراد و وظائف کے بجائے کثرت سے تلاوت قرآنِ پاک کو اپنا معمول بنا لیں اور فارغ اوقات میں اِس کی آیات پر غور کریں تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اور اس کے ذریعے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی......اور یہی ہماری وجہ تخلیق ہے......!

سوال: دین و دُنیا میں اعتدال کیسے اختیار کیا جا سکتا ہے؟ نیز دُعا اور عبادت سے متعلق اپنے تصورات (Concepts) کو ہم کیسے سنوار سکتے ہیں؟

جواب: اولیائے کرام کے بارے میں ہماری معلومات اُن کے کشف و کرامات تک محدود ہیں کیونکہ یہ کتابیں عموماً اُن کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے لکھی ہیں۔ لیکن اگر آپ اولیائے کرام کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو اُن میں تعلیمات ہی اور ہیں۔ دُور دُور تک کشف و کرامات کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ اپنے آپ کو مجبورِ محض قرار دیتے ہیں...... دین ہو یا دُنیا۔ اعتدال ہر معاملے میں ضروری ہے۔

اگر ہم نفلی عبادات کے لیے فرائض سے منہ موڑ لیں گے تو یہ قابلِ گرفت ہو گا ایک شادی شدہ شخص کے لیے اپنی بیوی کی دل جوئی کرنا اور اُس کی ضروریات کا خیال رکھنا فرض ہے۔ اِسی طرح بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت بھی فرض ہے، اِس میں کوتاہی کے معاملے میں انسان رب کے حضور جواب دہ ہو گا۔

اگر آپ کا سارا وقت تسبیحات اور ذکر اذکار میں گزرنے لگا تو آپ اولاد کی تربیت کا پہلو نظر انداز کرنے لگیں گے۔ اِسی طرح والدین کی ضروریات کا خیال رکھنا اور اُن کی دل جوئی کرنا ہم پر فرض ہے۔ والدین کی خدمت بھی فرض ہے۔ اگر والدین محتاج ہوں اور دوسرا کوئی خدمت کرنے والا موجود نہ ہو تو والدین کے خدمت جیسے فرض کی ادائیگی کی برکت سے حج معاف ہو سکتا ہے تو نفلی عبادات کا درجہ تو کہیں بعد میں آتا ہے۔

کوئی شخص اللہ کا دوست بنتا ہی اِس وقت ہے جب وہ Total submission میں چلا جاتا ہے۔ جب اللہ کی دوستی ہی اُسے Total submission میں جانے سے ملی ہے تو ایسے میں وہ کس طرح اپنے فرائض سے منہ موڑ سکتا ہے؟

آپ نفلی عبادات ضرور کیجیے لیکن اس سلسلے میں اپنے فرائض کو نظر انداز مت کریں۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ وہ وقت جو ہمارے آرام کے لیے مخصوص ہے اُس میں سے کچھ حصہ ہم نفلی عبادات کے لیے مختص کر لیں لیکن یاد رہے کہ اپنے جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے جو Barest minimum time آپ کو چاہیے، اُس وقت کے علاوہ ذاتی آرام کا باقی وقت نفلی عبادات، تسبیحات اور وظائف کے لیے مخصوص کر لیں۔

آج ایک بات واضح کرنا چاہوں گا کہ بدقسمتی سے ہم نے ہر مسئلہ کا حل تسبیحات میں ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے...... بچہ بیمار ہے، دم کروالیجیے...... دفتر میں ترقی نہیں ہو رہی تو کسی سے وظیفہ حاصل کر لیجیے...... میاں بیوی میں لڑائی ہو رہی ہے تو جا کر پیر صاحب سے دعا کرا آئیے۔

ذرا غور کیجیے کہ اللہ نے یہ کہاں فرمایا کہ ہر مسئلہ کا حل دم درود اور وظیفے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو عمل کی تلقین کرتا ہے۔ وہ انسان کو Active دیکھنا چاہتا ہے اور ایسے باہمت لوگوں کو پسند کرتا ہے جو ہر وقت عمل پر آمادہ رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک اِس لیے تو نہیں اتارا تھا کہ ہم اپنی دُنیاوی ضروریات اور مقاصد کے حصول کی لیے کچھ مخصوص آیات اور سورتوں کی تلاوت کرنے لگیں۔ قرآنِ پاک تو دل سے دُنیا کی محبت نکالنے کے لیے نازل کیا گیا تھا لیکن افسوس! ہم نے اُسی قرآن پاک کو دُنیا کے حصول کا ذریعہ بنالیا۔ ہم عمل کی راہ چھوڑ کر اوراد و وظائف میں پڑ گئے۔ بچہ سکول نہیں جاتا تو اُسے پیار سے سمجھائیں...... نہ کہ شاہ صاحب کے پاس بھاگے جائیں کہ بچہ پڑھتا نہیں، اُس کو دم کر دیں۔

اِسی طرح بیماری کی صورت میں حدیث کے مطابق علاج کرانا چاہیے...... نہ کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے دم درود کرنے والے کے پاس بھاگے چلے جائیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جناب! ہمارا رزق کسی نے تعویذ جادو کر کے باندھ دیا ہے۔ اُن سے پوچھا جائے کہ رازق کون ہے؟ فوراً جواب آئے گا۔ اللہ تعالیٰ۔ پوچھا جائے کہ کیا وہ قادرِ مطلق اور طاقت ور ہے اور کیا اُس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا؟ جواب آئے گا "بے شک......!"

جب آپ کا یہ یقین اور ایمان ہے تو پھر آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ کوئی آپ کا رزق باندھ سکتا ہے۔ جب آپ نے کسی انسان کو اِس قابل سمجھ لیا کہ وہ رازق کے دیے ہوئے رزق کو باندھ سکتا ہے تو آپ شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اِسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ کسی نے جادو کر دیا ہے تا کہ میں ہمیشہ بیمار رہوں۔ جب آپ کا یہ ایمان ہے کہ صحت اور شفا دینے والا رب ہے، اگر رب تعالیٰ آپ کو بیمار نہیں کرنا چاہتا تو کسی کی کیا مجال کہ آپ کو جادو کر کے بیمار کر دے۔

اولیائے کرام کے بارے میں اُن کے مریدوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر ہم اوراد و وظائف کی طرف راغب ہو گئے اور جدوجہد اور عمل کی راہ کو ترک کر دیا۔

بلاشبہ دُعا بھی بہت اہم ہے......لیکن دُعا سے پہلے ہم اپنی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں سے بھرپور طریقے سے کام لے کر محنت اور کوشش کرلیں پھر رب کے حضور دُعا کریں کہ وہ اس محنت کا وہ نتیجہ عطا فرمادے جو ہمارے مفاد میں بہترین ہو۔

اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے۔ وہ انسان کی کوشش کا اجر کئی گنا بڑھا کر عطا فرماتا ہے......وہ جو کچھ بھی عطا فرمائے گا وہ ہماری کوششوں سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔ اگر ہماری جدوجہد کا نتیجہ ہماری توقع کے برعکس نکلے تو ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ چونکہ رب تعالیٰ ہماری والدہ سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے، اس لیے اُس کا یہ فیصلہ یقیناً ہمارے حق میں بہترین ہے۔ اس میں کہیں ہمارے لیے کوئی بہتری ضرور چھپی ہے جو ظاہری آنکھ کو دکھائی نہیں دے رہی۔ ہم اپنے آقا کے فیصلے کو ہنسی خوشی تسلیم کرلیں تو مسائل حل ہوجائیں گے۔ ذکر اذکار اور تسبیحات سے جان چھڑائیے اور فرض عبادات اور رب تعالیٰ کی بندگی کی طرف آیئے......! یہ بندگی کا معاملہ بھی خوب ہے۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کے سلسلے میں بھی Selective ہیں۔ جو احکامات ہمیں Suit کرتے ہیں، اُنھیں ہم Adopt کرلیتے ہیں اور باقی احکامات کے بارے میں توجیہات پیش کرنے لگتے ہیں۔

نماز افضل ترین عبادت اور اسلام کا بنیادی رُکن ہے۔ ایک مسلمان اور کافر کے درمیان فرق نماز کا ہے لیکن اگر سورج طلوع یا غروب ہورہا ہو یا زوال کا وقت ہو تو ہم نماز نہیں پڑھیں گے۔ اگر نماز عبادت ہے تو ان تینوں اوقات میں بھی سجدہ کرلیجیے۔ لیکن ہم ان تینوں اوقات میں اس لیے سجدہ نہیں کرتے کیونکہ رب تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ تو پھر عبادت کیا ہے؟ نماز؟ یا پھر رب کا حکم ماننا؟ یقیناً رب تعالیٰ کا حکم ماننا ہی عبادت ہے۔

روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتا ہے "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اُس کا اجر دوں گا۔" روزہ رکھنا بہت افضل عبادت ہے لیکن عید کے روز آپ روزہ نہیں رکھتے کیونکہ رب تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ تو عبادت کیا ہوئی؟ روزہ رکھنا؟ یا رب تعالیٰ کا حکم ماننا؟

اگر رب تعالیٰ کا حکم ماننا ہی عبادت ہے تو اُس کے اور بھی بہت سے احکامات ہیں جن سے ہم پہلوتہی کر جاتے ہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ بندگی Total submission کا نام ہے۔ جو رب تعالیٰ نے فرما دیا ہم بلا حیل وحجت اُس کا حکم بجالائیں۔ اُس کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ہم اپنی ڈکشنری سے پانچ "ک" کب، کیوں، کیسے، کیا، کہاں نکال دیں۔ اُس کے چھوٹے سے چھوٹے حکم کو بھی پورے دل وجان سے تسلیم کریں اور بجالائیں۔ یہی Total submission ہے۔

سوال: قرآنِ پاک کی تلاوت کس طرح کی جائے کہ اُس کی سمجھ آنے لگے؟

جواب: ہم عجمی لوگ جب قرآن پاک کو کلامِ الٰہی سمجھ کر بار بار پڑھتے ہیں تو عجیب بات ہے کہ اس کا مفہوم خود بخود ہمیں سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ جس طرح مختلف Degrees کے ساتھ ولایت کے دس درجے ہیں بعینہٖ قرآن پاک کے دس معانی ہیں۔ جوں جوں انسان ولایت کے مراحل طے کرتا ہے توں توں قرآنِ پاک کے

مخفی معانی اُس پر آشکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب انسان اللہ کے قریب ہونے لگتا ہے تو اُس پر قرآن کے بھید کھلنے لگتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بہت بلند پایہ عالم اور ولی اللہ تھے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں رب تعالیٰ کی زیارت کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے احمد بن حنبل! مانگو کیا مانگتے ہو؟" امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کی "یا باری تعالیٰ! اپنے تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ بتا دے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قرآنِ پاک کی تلاوت کثرت سے کیا کرو۔"

قرآنِ پاک کی کثرت سے تلاوت کرنے سے اُس کے مختلف نکات ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ دھیان اُدھر متوجہ ہوتا ہے تو پھر اُن نکات پر غور و فکر شروع ہو جاتا ہے۔ یوں مفہوم واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ پھر مختلف نکات سمجھنے کے لیے آپ کو کسی اُستاد کی ضرورت پڑے گی۔

اگر اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے تو میں قرآنِ پاک کی تلاوت یوں کروں گا کہ پہلی بار بغیر ترجمہ کے محض عربی متن تلاوت کروں گا، دوسری بار معنی کے ساتھ اُس کی تلاوت کروں گا کیونکہ اِن دونوں طریقوں کی اپنی فضیلت ہے۔ لیکن ہمیں دھیان رکھنا چاہیے کہ قرآنِ پاک کی تلاوت نہ تو اتنی روانی سے کی جائے کہ کسی لفظ کی سمجھ نہ آئے اور نہ ہی اِتنی سست رفتار کہ یوں لگے کہ جیسے انسان خدانخواستہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے۔ امامِ خانہ کعبہ جناب عبدالرحمٰن السدیس کی دوران تراویح قرأت سننے کا آپ کو تجربہ ہوا ہوگا۔ قرأت کے دوران اُن کا ایک لفظ واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ اُن کی قرأت میں پانی کی سی روانی ہوتی ہے اور یہ انداز دل پر بہت اثر کرتا ہے۔

ایسا اندازِ تلاوت اپنانے کے لیے آپ قاری عبدالرحمٰن السدیس کی نمازِ تراویح کے لیے کی گئی قرأت کی ریکارڈنگ حاصل کر کے بار بار سنیں اور پھر ساتھ ساتھ قرآنِ پاک پڑھیں۔ حیرت انگیز طور پر رفتہ رفتہ آپ کا اندازِ قرأت بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔

سوال: آپ قرآن پاک کا کون سا ترجمہ پڑھتے ہیں؟

جواب: میں مولانا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری کا کیا گیا قرآن پاک کا ترجمہ پڑھتا ہوں۔ دونوں کے ترجمے میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ یہ دونوں تراجم بہت قریب قریب ہیں۔

سوال: ہم قرآن پاک کا بامحاورہ ترجمہ پڑھیں یا لفظی ترجمہ؟

جواب: قرآن پاک کے دس مخفی معانی ہیں اور ہر ولی اللہ پر قرآن پاک کا مفہوم اُس کے مقام اور درجے کے مطابق عیاں ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ولایت کے چھٹے درجے پر فائز ہے تو قرآن پاک کے چھٹے درجے کے مخفی معنی اُس پر عیاں ہو جائیں گے اور وہ اپنی ذہنی اور رُوحانی کیفیت کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر لکھے گا جس کو سمجھنے کے لیے ویسی ہی ذہنی و رُوحانی کیفیت درکار ہوگی۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنس پر لکھی گئی کتاب اگر پانچویں کلاس کا طالب علم پڑھے گا تو

بھٹک جائے گا اور اُسے سمجھ نہیں پائے گا کیونکہ وہ کتاب سائنس دان نے اپنے ذہنی معیار کے مطابق بہت ایڈوانس فارم میں لکھی ہے۔ایک پرائمری سکول کا طالب علم وہ کتاب صرف اُسی وقت سمجھ پائے گا جب وہ اُس کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر لکھی جائے گی۔

بعینہٖ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یا پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن پاک پر لکھی گئی تفسیر اُن کے اپنے معیار اور رُوحانی مقام کے مطابق ہے۔ہم چونکہ ابتدائی مدارج پر ہیں اِس لیے بہتر یہی ہے کہ قرآن پاک کا بامحاورہ ترجمہ پڑھ لیں۔رفتہ رفتہ تفسیر ہمیں خود ہی سمجھ آنے لگے گی۔ترجمہ بھی لفظی نہیں بلکہ بامحاورہ پڑھیں تا کہ بات آسانی سے سمجھ آ جائے۔کیونکہ لفظی ترجمہ کی صورت ہم Construction of sentence میں اُلجھنے لگتے ہیں۔

شیطان سے کیسے بچا جائے

سوال: شیطان سے بچاؤ اور دل کو آئینہ بنانے کا کیا فارمولا ہے؟

جواب: شیطان سے بچاؤ کے لیے بسم اللہ زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ایک شخص نے کہا شیطان ہلاک ہو۔ میں نے اُس سے کہا" ایسا نہ کہو۔ اِس سے شیطان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اِس شخص پر غالب آ گیا ہوں۔ لہٰذا تم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہو۔ ایسا کہنے سے شیطان دب کر چیونٹی جیسا ہو جاتا ہے۔"

جب ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کثرت سے پڑھتے ہیں تو ہمارے دل اور ذہن پر جمع شدہ دُنیاوی مصروفیات کا گرد و غبار دُھل جاتا ہے۔ یادِ الٰہی سے غافل رہنے سے جو قلب زنگ آلود ہو چکا تھا، بسم اللہ کی برکت سے وہ آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے اور دل جب آئینہ بن جاتا ہے تو اُس میں انسان کو خود اپنی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ جس انسان نے خود کو پہچان لیا، وہ رب تعالیٰ کو پہچاننے لگتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی بندہ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لے تو اللہ تعالیٰ اُسے تمام دن اپنی پناہ میں رکھتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا "تم استعاذہ کے ساتھ گناہوں کے دروازے بند کرو...... بسم اللہ کے ساتھ بندگی کے دروازے کھولو۔"

ایک روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر لعنت کی تو آدم علیہ السلام کی طرح اُس کی بائیں پسلی سے ایک عورت پیدا کی جس نے اکتیس (31) انڈے دیے۔ اُن سے اولاد پیدا ہوئی جو بڑھ کر جنگلوں، دریاؤں میں پھیلی۔ پھر انڈے دیے جس سے دس ہزار نر اور مادہ شیطان پیدا ہوئے۔ جو پہاڑوں، جزیروں، ویرانوں، جنگلوں، دریاؤں، ریگستانوں اور درختوں کے تنوں میں بھر گئے...... کوئی چشمہ، دوراہا، چوراہا، حمام بھی اُن سے محفوظ نہ رہا۔ ستر کی جگہ، گندگی کے مقامات، گڑھوں، لڑائی اور ناقوس کی جگہوں، قبروں، گھروں، محلوں، صحرا نشینوں کے خیموں، عبادت گاہوں غرض سب جگہ میں داخل ہو گئے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات چند صحابہ کرامؓ جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سلمانؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر شامل تھے، آپ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے

آ ئے۔ اسی اثنا میں آپ ﷺ بھی تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ کے چہرے پر موتیوں کی مانند پسینہ نظر آ رہا تھا جیسے بخار آ رہا ہو۔ آپ ﷺ نے تین دفعہ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور فرمایا "اس ملعون پر خدا کی لعنت ہو۔" پھر سر مبارک جھکا لیا۔ حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا "یارسول ﷺ! آپ نے کس پر لعنت کی؟" آپ ﷺ نے جواب دیا "شیطان لعین دشمنِ خدا پر۔" اُس مردود نے اپنی دُم کو مقعد میں داخل کیا اور سات انڈے دیے۔ اُن سے اُس کے سات بچے پیدا ہوئے۔ پھر اُن میں سے ہر بچہ آدم علیہ السلام کی اولاد کو گمراہ کرنے پر مامور ہوا۔ ایک کا نام "مُدحش" ہے جو عالموں کو ہوس و حرص کی ترغیب دینے پر مقرر ہوا۔ دوسرے کا نام "حدیث" ہے جو نمازیوں کو نماز بھلانے، کھیل میں لگانے، بہکانے، جمائی لینے اور اونگھنے میں مبتلا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ سو جاتے ہیں۔ پھر جب سونے والے سے کہا جاتا ہے "تو سو گیا؟" وہ کہتا ہے "میں سویا نہیں" پھر بے وضو ہی نماز میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اُن میں کوئی ایسا ہے جسے اُس کی نماز کے ثواب کا نصف چوتھائی یا دسواں حصہ ہی ملتا ہے بلکہ اُس کی نماز کے گناہ ثواب سے بڑھ جاتے ہیں۔

تیسرے شیطان کا نام "ذلبنون" ہے جس کے سپرد بازاروں کا انتظام ہے۔ یہ رات دن بازاروں میں رہتا ہے۔ لوگوں کو کم تولنے کی ترغیب دیتا ہے، خرید و فروخت میں جھوٹ بولنے، سامان کو سجانے، اُس کی تعریفیں کرنے کے راستے بتاتا ہے۔ چوتھے شیطان کا نام "بتر" ہے جو مصیبت کے وقت لوگوں کو اپنے گریبان پھاڑنے کی رغبت دلاتا ہے، اپنا منہ نوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ اُنھیں سکھاتا ہے کہ واویلا کریں، اپنے آپ کو کوسیں اور صبر کرنے سے جو ثواب ملتا ہے، اُس سے محروم رہیں۔ پانچویں شیطان کا نام "منشوط" ہے۔ یہ لوگوں کو جھوٹ بولنے، چغلی کھانے، طعن و تشنیع کرنے اور اِس قسم کے دیگر گناہوں کی ترغیب دیتا ہے۔

چھٹے شیطان کا نام "واسم" ہے جو مرد و عورت کو زنا پر اُکساتا ہے۔ ساتویں شیطان کا نام "اعور" ہے جو چوری کرنا سکھاتا ہے۔ چور سے کہتا ہے کہ چوری کرنے سے تمھارا فاقہ دُور ہو گا، اپنا قرض ادا کر سکو گے، کپڑے پہن سکو گے، چوری کرنے کے بعد توبہ کر لینا۔"

روایت ہے کہ عثمانؓ بن عاص نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "میری نماز اور قرأت کے درمیان شیطان آ کر داخل ہو جاتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اُس شیطان کا نام "خترب" ہے۔ اُسے دیکھو تو اللہ کے یہاں اُس سے پناہ مانگو۔ اپنے دائیں بائیں تین دفعہ تھوک دیا کرو۔" حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں "میں نے اس پر عمل کیا تو شیطان بھاگ گیا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے: "رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا "تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا۔" اُنھوں نے عرض کی "یارسول اللہ ﷺ آپ کے ساتھ بھی۔" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے خلاف میری مدد کی تو وہ مومن ہو گیا۔ اب مجھے بھلائی کا ہی مشورہ دیتا ہے۔"

(صحیح مسلم، کتاب صفتة القيامة والجنتة والنار......حدیث 7286، جلد 8، صفحہ 139)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" کیا تم ابلیس اور اُس کی اولاد کو میرے بجائے اپنا دوست بناتے ہو......؟ حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔ ان ظالموں کے لیے برا بدلہ ہے۔"

شیطان سے دُور رہنے کا ایک آسان طریقہ یادِ الٰہی ہے۔ کیونکہ یادِ الٰہی پاکیزگی کا دروازہ ہے، پاکیزگی یا تقویٰ جنت کا دروازہ ہے جب کہ خواہشاتِ نفس دُنیا کا دروازہ۔ جب انسان اللہ کی یاد میں مگن رہتا ہے تو اُسے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے...... وہ دُنیا سے دُور رہنے لگتا ہے جس سے تقویٰ پر قائم رہنا اُس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور جب وہ تقویٰ پر قائم رہے گا تو اُسے قربِ الٰہی حاصل ہو جائے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائے گا...... لیکن اگر انسان خواہشاتِ نفس کا شکار ہو گیا تو وہ دُنیا میں غرق ہو جائے گا اور دُنیا میں غرق ہونے سے وہ شیطان کا شکار ہو جائے گا۔

اگرچہ قرآن پاک میں واضح طور پر ارشاد ہے" جو حلال چیزیں تم کو دی گئی ہیں، اُن میں سے کھاؤ اور پیو۔" لیکن اولیائے کرام اِس میں بھی اِس قدر احتیاط اختیار کرتے ہیں کہ حلال چیزوں کو بھی کم سے کم استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ دُنیا میں ڈوبنے نہ پائیں۔ اولیائے کرام نے یہ بھی تاکید کی کہ کسی انسان سے کوئی اُمید نہ باندھو، کسی بھی شخص سے کسی صلے یا تحائف کی توقع نہ رکھو کیونکہ تحائف کی توقع بڑھ کر صلے کی توقع میں بدل جاتی ہے جس سے انسان دوسروں کا مرہونِ منت ہونے لگتا ہے۔ اور جہاں انسان غیر اللہ کا مرہونِ منت ہوا وہاں وہ اللہ سے دُور ہو گیا۔

اولیائے کرام کی اِس تلقین کے پیچھے وہ حکمِ الٰہی پوشیدہ ہے کہ بے شک تم گناہ نہ کرو لیکن ایسی جگہ پر بھی نہ جاؤ جہاں گناہ ہو رہا ہو۔ اولیاء اللہ کی تمام نصیحتیں، ہدایات یا Code of conduct گہرے مطالعہ پر مبنی ہیں۔ اُنھوں نے انسانی فطرت اور بشری کمزوریوں اور خوبیوں کے عمیق مطالعہ کے بعد Code of conduct مقرر کیا کہ اِس Framework میں رہتے ہوئے اگر ایک مخصوص طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا جائے تو انسان رب تعالیٰ کے قریب چلا جائے گا۔

اِسی لیے اولیائے کرام کہتے ہیں کہ حلال چیز کے استعمال میں بھی کفایت سے کام لیا جانا چاہیے تاکہ انسان دُنیا میں ڈوبنے نہ پائے۔ خوراک اور لباس کے معاملے میں بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ حرام ذرائع یا کمائی سے تو حاصل نہیں ہو رہا۔ جب انسان اِن معاملات میں بے پروا ہو جاتا ہے اور حرام کا لقمہ اُس کے اندر جانے لگتا ہے تو پھر دل بہت جلد زنگ آلود ہو جاتا ہے لیکن جب انسان ہر معاملے میں احتیاط کا دامن تھامے رکھتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کے قریب ہونے لگتا ہے۔ جب وہ رب تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے تو رحمٰن کی یاد اُس کے دل میں جاری و ساری رہنے لگتی ہے۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور عبادات کے سلسلے میں اِس قدر محتاط ہو گئے کہ فرض اور مؤکدہ عبادات کو ظاہراً اور جہراً ادا کیا لیکن دیگر عبادات کی طرف اپنے باطن کا رُخ یوں پھیر دیا کہ اُن کا دل ہمہ وقت رحمٰن کی یاد میں ڈوبا رہنے لگا تو اِس کے نتیجے میں اُنھیں قربِ الٰہی حاصل ہو گیا۔ اور جب انسان کو قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے تو اللہ اُسے اپنا

دوست بنا لیتا ہے اور اُس کے لیے ہدایت کے راستے نکالنے لگتا ہے...... وہیں سے کشف وکرامات کا آغاز ہوتا ہے۔

کشف کا آغاز خواب (رُویا) سے ہوتا ہے۔ متقی و پرہیز گار لوگوں کو رب تعالیٰ سچے خواب دکھاتا ہے۔ اور یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی ہے کہ سچے خوابوں کا ایک مخصوص وقت ہوتا ہے۔ مستند اور Authentic اولیائے کرام جب نمازِ فجر کے بعد سوتے ہیں تو اُس وقت عموماً وہ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ خواب عموماً اطلاعی ہوتے ہیں۔ فجر کی نماز سے پہلے دکھائی دینے والے خوابوں کی تعبیر جاننے کے لیے بہت سے عوامل دیکھے جاتے ہیں مثلاً خواب دیکھنے والے شخص کی رُوحانی کیفیت کیا ہے؟ اُس کی رُوح کی لطافت کا معیار کیا ہے؟ اس کی سوچ اور زندگی گزارنے کا انداز کیا ہے؟ وغیرہ۔

سچے خوابوں کے علاوہ اطلاع اور Guidance (راہنمائی) کا ایک اور ذریعہ 'اِلقا' ہے۔ اِلقا کی دو اقسام ہیں:

1۔ القائے ملکوتی　　　2۔ القائے دشمن

القائے ملکوتی من جانب اللہ ہے...... اور اِس کے ذریعے ہمیشہ انسان کو خیر اور بھلائی کے حوالے سے Guidance فراہم ہوتی ہے۔ جب کہ القائے دشمن شر سے متعلق ہے۔ اِسے عرفِ عام میں القائے شر بھی کہتے ہیں۔ اِس کا تعلق نفس سے ہے۔

القائے ملکوتی کا مقام انسان کی رُوح اور اُس کا دل ہے جب کہ القائے دشمن کا مقام انسان کا نفس ہے۔ القائے ملکوتی کی مزید Sub-divisions ہیں۔ ''القائے نفس'' اور ''القائے شر'' کا تعلق ''القائے دشمن'' سے ہے جب کہ ''القائے ملک''، ''القائے رُوح''، ''القائے یقین'' اور ''القائے عقل'' کا تعلق خیر اور رب تعالیٰ سے ہے۔ اِن میں سب سے Superior ''القائے یقین'' ہے...... ''القائے یقین'' اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان ''عین الیقین'' میں داخل ہونے لگتا ہے۔

اِلقا کے بعد کشف کی مختلف صورتیں شروع ہو جاتی ہیں...... لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے آپ کو یادِ الٰہی میں گم کریں گے اور اپنا دل یوں آئینہ کی مانند صاف کر لیں گے کہ اُس میں ہمیں اپنی صورت اور ذات نظر آنے لگے گی۔ اپنی ذات کو پہچانتے پہچانتے ہم رب تعالیٰ کو پہچاننے لگیں گے اور رب تعالیٰ کے قریب ہو جائیں گے۔

سوال: انسان اپنے آپ کو کیسے پہچانتا ہے؟

جواب: جب انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو اُسے اپنی خوبیاں اور خامیاں نظر آتی ہیں۔ جب وہ اُن پر غور کرتا ہے تو اُسے اپنی خوبیوں میں قدرتِ الٰہی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اُسے یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی رب تعالیٰ موجود ہے کیونکہ یہ سب چیزیں رب تعالیٰ کے سوا نہ تو کوئی بنا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کنٹرول کر سکتا ہے یوں انسان خود شناسی سے رب شناسی تک کا سفر طے کرتا چلا جاتا ہے۔

فقیر ہمیشہ خود تنقیدی میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنی خامیوں پر نظر رکھتا ہے اس لیے اُسے دوسروں کی کمزوریاں اور خامیاں نظر نہیں آتیں اور جب اُسے کسی کی کوئی خامی یا کمزوری دکھائی ہی نہیں دیتی تو وہ کسی کی بُرائی بھی نہیں کرتا۔ یوں فقیر کی زبان سے کسی کی عیب جوئی نہیں ہوتی۔ اُسے اپنی ذات سے بُرا کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا جس شخص نے اپنی خامیوں پر نظر رکھی اور اُن کو درست کرنے میں لگا رہا، وہ بھلائی کے راستے پر چل نکلا۔

انسان کو جب اپنا آپ دکھائی دینے لگتا ہے تو اُس کی خامیاں دُور ہونے لگتی ہیں۔ اِس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ رب تعالیٰ کے قریب ہونا چاہتے ہیں تو اپنی کجیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھیں اور ہر ممکن طریقے سے انھیں دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اِس کے دو فائدے ہوتے ہیں...... ایک تو انسان خود سدھر جاتا ہے۔ دوسرا جب اُسے کسی کی خامیاں نظر نہیں آتیں تو وہ Gossip سے بچ جاتا ہے۔

سوال: رب تعالیٰ سے لو لگانے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: جو لوگ رب تعالیٰ کی طرف رُجوع کر لیتے ہیں وہ فرائض اور مؤکدہ سنتوں کے علاوہ تمام عبادات کے سلسلے میں اپنے باطن کی طرف رُجوع کر لیتے ہیں۔ وہ بظاہر کاروبارِ حیات میں مصروف ہوتے ہیں لیکن اُن کا دل اللہ کے ذکر اور یاد میں مگن رہتا ہے...... وہ فنافی اللہ ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہوش و خرد سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں بڑے انعام کی خوش خبری ہے، دُنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد رب تعالیٰ سے ملاقات اور اُس کے دیدار کا وعدہ ہے لیکن یاد رہے کہ رب سے رُجوع مبنی بر اخلاص ہو۔

زمانۂ نوجوانی میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ مجھے اپنے عبادت والے کمرے میں لے گئے جہاں جانماز بچھا تھا۔ کمرے کے آخری کونے میں خانہ کعبہ کا ایک بہت بڑا پورٹریٹ رکھا تھا۔ جانماز کے Centre سے لے کر خانہ کعبہ کے اُس پورٹریٹ تک ایک سفید لائن کھنچی تھی۔ آگے جا کر لائنوں کی مدد سے ایک Triangular بنائی گئی تھی جس کا رُخ خانہ کعبہ کی جانب تھا۔ میں نے اُن صاحب سے پوچھا "یہ سب کیا ہے؟ ان لائنوں کا کیا مقصد ہے؟ کہنے لگے "یہ اِس لیے ہے تاکہ میری ناک اِس سفید لائن کی سیدھ میں رہے اور Triangular کا Arrow head خانہ کعبہ کی سمت کی نشان دہی کر رہا ہے کہ مجھے اس طرف منہ کر کے نماز پڑھنی ہے۔"

رب سے لو لگانے یا اُس کی طرف رُجوع کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم اِس طرح کی حرکتیں کرنے لگیں۔ اِن سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیں اِس Sense میں رب تعالیٰ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اُس کے احکامات کیا ہیں۔ اگر میں گاڑی Drive کر رہا ہوں اور ایک صاحب بیچ سڑک میں موبائل فون پر باتیں کرنے میں مگن ہیں۔ میرے ہارن دینے کے باوجود وہ مجھے راستہ نہیں دے رہے تو میں بجائے تلملانے اور ہارن پر ہارن بجانے کے اپنے آپ سے کہوں کہ میں ان صاحب کو سہولت دے دیتا ہوں اور خود تاخیر سے

منزل پر پہنچ جاتا ہوں۔ اِسی طرح اگر کوئی مجھے پتھر مارے تو آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے میں اُسے دُعا دے دوں۔

اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنا ہی دراصل یادِ الٰہی ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے اللہ سے لو لگ جاتی ہے اور انسان اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ کے احکامات اور اُس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنے سے جب انسان اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شمار ہو گیا تو اُسے رب تعالیٰ کی قربت حاصل ہو گئی۔ جب رب تعالیٰ کا قرب اُسے حاصل ہو گیا تو پھر اُس کی دوستی بھی اُسے عطا ہو گئی اور جب رب تعالیٰ کی دوستی آپ کو مل گئی تو پھر یہ کائنات پوری کی پوری آپ کی ہے۔ کیونکہ وہ آپ کے دوست کی ملکیت ہے۔

سوال: کچھ لوگوں نے محنت اور ریاضت کی، اللہ سے لو لگائی اور بہت کچھ پالیا۔ جب کہ دوسری طرف پیغمبر ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جو آگ لینے گئے اور اُنھیں پیغمبری مل گئی۔ اِسی طرح دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ صاحبانِ دُعا کے پاس محض دُعا کرانے گئے اور بہت کچھ بطور گفٹ پالیا۔

جواب: پیغمبر کی مثال دینا زیادہ مناسب نہیں کیونکہ جب پیغمبروں کی ارواح تخلیق ہوئیں تو یہ پہلے سے Decided تھا کہ یہ نبوت کے مقام پر فائز ہوں گی۔ عام طور پر پیغمبر چالیس (40) سال کی عمر کے بعد نبوت کے باقاعدہ منصب پر فائز ہوئے کیونکہ مرد عموماً 40 سال کی عمر میں Mature ہوتا ہے۔ یہ دراصل Marked تھے لیکن دیکھنے والوں نے سمجھا کہ کوئی آگ لینے گیا یا غار میں پہنچا تو اُسے پیغمبری مل گئی...... حالانکہ اُن کی ارواح تو روزِ اول ہی بطور پیغمبر تخلیق ہو چکی تھیں۔ یہ اور بات کہ اُن کے Maturity کی عمر کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنا پیغام آگے پہنچانے کا حکم دیا۔

جہاں تک کچھ لوگوں کی کچھ صلاحیتوں یا خوبیوں کے God-gifted ہونے کی بات ہے یا کسی صاحب علم و دُعا کے پاس جانے سے اِن میں تبدیلی آنے کا قصہ ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اکثر چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ عبادات سے پارسائی آتی ہے جب کہ نیکی سے رب ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص عبادت گزار نہ ہو لیکن اُس کے اندر نیکی چھپی ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو میں شرابی سمجھتا ہوں، وہی شخص نہ جانے کتنی ہی بیواؤں کی کفالت کرتا، کتنے یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہو، رات بھر اپنی ماں کے پاؤں دباتا ہو اور اُس کے ایک اشارے کا منتظر رہتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب کام اِس قدر خاموشی سے کرتا ہو کہ اس کے اُس نیک عمل کی کسی کو خبر ہی نہ ہو۔

آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ اُمتی خُلق کے اُس درجہ پر فائز ہو جائیں کہ وہ جب بھی کسی سے ملیں، اُس میں اس قدر محبت اور اپنائیت ہو کہ وہ شخص یہی سمجھے کہ یہ انسان میرا ہی ہے۔ مجھ سے ہی سب سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص جسے میں شرابی کبابی اور بُرا سمجھ رہا ہوں، وہ خلق خدا کے لیے نہ جانے کس قدر حُسن خلق رکھتا ہو۔ حُسن خلق رکھنا بذات خود بہت بڑی نیکی ہے۔

افسوس! ہم سطح کے اُوپر موجود بُرائی تو دیکھ لیتے ہیں لیکن سطح کے نیچے چھپی ہوئی نیکی اور اچھائی ہمیں نظر نہیں آتی۔ بظاہر گناہ گار اور بُرا نظر آنے والا شخص چونکہ پوشیدہ طور پر نیکی کے کاموں میں مصروف رہتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اُس کے نیک کاموں کا انعام اُسے یوں عطا فرماتا ہے کہ جب وہ کسی صاحبِ دُعا کے ساتھ Contact کرتا ہے، اُس کے ساتھ تعلق جوڑتا ہے تو ظاہری بُرائیوں کے گردوغبار سے بھی پاک ہو جاتا ہے......جس کی وجہ سے دیکھنے والے حیرت سے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ابھی دو چار روز پہلے اِس نے صاحبِ دُعا کے پاس جانا شروع کیا ہے اور یہ نیک بھی ہو گیا......اور اتنی جلد اُسے کشف و کرامات بھی حاصل ہو گئیں۔ لیکن اِس سارے قصے میں کامیابی کا راز خلقِ خدا پر مہربان ہونا ہے......جو کہ ایک دشوار امر ہے۔

سوال: خلقِ خدا پر کس حد تک مہربان ہوا جائے؟

جواب: انسان اپنی استطاعت، ہمت اور توفیق کے مطابق جس قدر ممکن ہو خلقِ خدا پر مہربان ہو جائے۔ لیکن یاد رہے کہ نفل کو فرض پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ خلقِ خدا پر مہربان ہونے سے پہلے اپنے فرائض ضرور ادا کر لیجیے کیونکہ اُن کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی۔ ہمارے والدین، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کی دستیاب وسائل کے مطابق بہترین کفالت ہم پر فرض ہے۔ اِس پر ذرا سی کوتاہی پر بھی ہمارا مواخذہ ہو گا۔

میری ایک Additional گزارش ہے کہ جہاں مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں اپنے فرائض کو نوافل پر مقدم رکھوں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ میں دوسروں کو اُن کے فرائض Discharge کرنے میں مدد دوں۔ فرض کریں میں ڈاکٹر تنویر کا دوست ہوں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو وقت دیں۔ ایسے میں مجھ پر لازم ہے کہ میں اُنھیں اپنے ساتھ نہ گھسیٹوں بلکہ اُنھیں سہولت فراہم کروں کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزار سکیں اور اُن کے مشاغل اور تعلیمی سرگرمیوں پر گفتگو کر سکیں۔

آپ اپنے اُصول بنا کر اُن پر عمل کیجیے اور دوسروں کے اُصولوں کا بھی نہ صرف احترام کریں بلکہ اُنھیں Support کریں کہ وہ اپنے اُصولوں پر قائم رہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی نیکی ہے۔

سوال: کیا فقر میں بھی اعتدال ضروری ہے؟

جواب: اعتدال ہر شے میں بہت ضروری ہے۔ فقیر تو اعتدال کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ایک زمانہ تھا کہ پڑھائی کے اثرات کی وجہ سے میرے اندر جلال بہت بڑھ گیا۔ ہوتا دراصل یہ ہے کہ جب انسان کو نیا نیا علم ملتا ہے تو اُس میں پہاڑی ندی کی سی سرکشی ہوتی ہے......انسان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے اور وہ اپنے اُس علم کی وجہ سے نت نئی شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ مثلاً وہ دیکھتا ہے کہ فلاں پڑھائی والا آدمی جا رہا ہے تو اُس کی پشت پر پھونک مار دیتا ہے......وہ غریب وہاں ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ اِسی طرح کسی مجذوب کو جاتے دیکھا تو اُس کے پیچھے بڑے آرام سے درود پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ اب وہ مجذوب اینٹیں مارتا اور گالیاں دیتا ہے لیکن آپ اپنی شرارت سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔

اُن دنوں میرے اندر بھی پڑھائی کا جلال بڑھ جانے سے میری کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ اگر سڑک پر جاتے

ہوئے کسی نے مجھے راستہ نہیں دیا تو میں پکڑ کر اُسے مارنے لگتا۔ لیکن جب میں اپنی اس کیفیت سے باہر آتا تو مجھے اپنے روّیے پر بہت دکھ ہوتا۔

ایک روز ہم پاکپتن شریف سے واپس آ رہے تھے۔ گاڑی میں مرشد صاحب، میں اور دو دیگر صاحبان تھے۔ مرشد صاحب بڑے موڈ میں تھے۔ عموماً ہماری ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اُن سے کسی دُعا یا کام کے لیے کہتے۔ ہم منتظر رہا کرتے کہ وہ خود سے ہمیں مخاطب کریں تو ہم کچھ بولیں۔ اُس روز جب اُنھوں نے مخاطب کیا تو اُن کے خوش گوار موڈ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے کہا ''حضور! زندگی میں میری دو خواہشات ہیں اور ایک آپ سے گزارش ہے۔'' کہنے لگے ''بولو! کیا ہیں۔'' میں نے عرض کیا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے یہاں ایسا لنگر جاری کر دے کہ جو بھی یہاں آئے وہ کھاتا رہے۔'' مرشد صاحب بولے ''وہ تو ہو جائے گا۔''

میں نے کہا ''حضور! دوسری خواہش یہ ہے کہ میں ایک ایسی فاؤنڈیشن بنالوں جس کے ذریعے ایسے Talented مسلمان طالب علموں کو جو وسائل کی کمی کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے، بیرون ملک اعلیٰ تعلیم دلوا سکوں۔'' میری اس خواہش پر اُنھوں نے قدرے خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا ''اچھا! اللہ کرے گا۔''

پھر میں نے اپنی گزارش پیش کی ''حضور! میرے اندر غصہ بہت بڑھ گیا ہے۔ دُعا کر دیجیے کہ یہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ میں اس کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔'' مرشد صاحب نے فرمایا ''یہ غصہ رفتہ رفتہ دُور ہو جائے گا۔'' اور واقعی چھ ماہ کے بعد میں حد سے بھی زیادہ نرم ہو گیا۔

اِس کے کچھ عرصہ بعد ایک بار جب میں اُن کے پاس اُس تھڑے (چبوترہ) پر بیٹھا تھا جہاں وہ بطور ڈیوٹی بیٹھا کرتے تھے تو دورانِ گفتگو وہ مجھ سے کہنے لگے ''میاں! تم اپنے اندر کچھ نہ کچھ جلال قائم رکھو۔ سانپ بھلے کسی کو نہ کاٹے مگر اپنی پھنکار نہ چھوڑے، اُسے دُنیا کھا جائے گی۔ تم اپنی پھنکار نہ چھوڑ دو ورنہ دُنیا کھا جائے گی۔''

اِس بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ میں اس قدر نرم ہو گیا تھا کہ مرشد صاحب کو مجھے یہ نصیحت کرنا پڑی۔ اِس طرح فقیر ہر معاملے میں اعتدال پر بہت زور دیتے ہیں۔

تعلیم سے تربیت اور مرید سے مراد تک

جب آپ کسی ولی اللہ کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو اُس میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں دیکھیں گے کہ فلاں ولی اللہ تعلیم یافتہ تھے۔ ہمیشہ "تربیت یافتہ" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تربیت یافتہ تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے موجودہ Syllabus میں تربیت کا پہلو Eliminate کر دیا گیا۔ اب تعلیم پر تو زور ہے لیکن تربیت کا فقدان ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں غیر مسلم بہت تیزی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بہت سے کلچر اور تہذیبیں Amalgamate (آمیزش ہونا) ہوئیں۔ عرب کے لوگ ایران میں جا بسے، افغانستان اور روم میں جا ڈیرے بسائے۔ وہاں کی لوکل تہذیبیں اِس قدر طاقت ور تھیں کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود وہاں کے لوگوں نے اپنی صدیوں پرانی روایات کو ترک نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پر اُن صدیوں پرانی روایات اور رُسوم کی گرد جمنے لگی...... جس کی وجہ سے ایک ایسا وقت آیا کہ اسلام Distort (مسخ) ہونے لگ گیا۔ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد ضرور آتا ہے۔ مجدد دین کی تجدید نہیں کرتا کیونکہ دین مکمل ہو چکا۔ اب اِس میں نہ کسی لفظ کا اضافہ نہ کمی کی جاسکتی ہے......!

مجدد دین پر روایات و تہذیب کی جمنے والی گرد کو جھاڑ پونچھ کر اُس کی اصل صورت میں واپس لے آتا ہے۔ ہر Millennium کے آخر میں ایک مجدد کامل پیدا ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بہت سے اولیائے کرام ہر زمانے میں آتے رہے جو دین کی اصل شکل کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک مربوط خانقاہی نظام بھی وجود میں آتا رہا۔

خانقاہی نظام سے مراد وہ نہیں جو عموماً ہم لیتے ہیں۔ ہم لوگ اُردو میں مزار کو خانقاہ کہتے ہیں۔ مراکش میں خانقاہ کو زداویہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک درویش نے اپنے ڈیرے پر تعلیم و تربیت کی غرض سے آنے والے لوگوں کے قیام، Lodging, Boarding، طعام اور لباس کا انتظام کر رکھا ہوتا ہے۔ اُسے بھی خانقاہ کہا جاتا ہے۔ دینی مسائل، مشورے کی غرض سے آنے والوں کے لیے وہاں انتظام ہوتا ہے۔ درس و تدریس اور عبادات کے لیے بھی وہاں جگہیں مخصوص ہوتی ہیں۔ اُسے خانقاہ کا نام دیا گیا اور ایک زمانے میں جگہ جگہ اُن کا وجود نظر آتا تھا۔ یہ خانقاہیں تعلیم و تربیت کا مرکز تھیں۔ وہاں کا تربیت یافتہ شخص ایک بہترین انسان ہوتا تھا۔

خانقاہ پر لوگ مختلف مقاصد کے تحت آتے تھے:

- کچھ لوگ وقتی غرض سے آتے تھے...... وہ کوئی مسئلہ دریافت کرنے یا درس سننے کے لیے آتے اور یہ مقصد پورا ہونے کے بعد چلے جاتے۔
- کچھ لوگ کوئی خاص علم سیکھنے کے لیے آتے اور وہ علم سیکھنے کے بعد واپس چلے جاتے۔
- کچھ لوگ طویل مدت کے لیے خانقاہوں کا رُخ کرتے۔ اُن کا مقصد اللہ کی راہ پر چلنا اور اللہ کے قرب کا حصول ہوا کرتا تھا۔ چونکہ اُن لوگوں کو کچھ خاص علم عطا کرنا ہوتا تھا اس لیے اُن کو Judge کرنے کے لیے کہ وہ رُوحانیت کی راہ پر چلنے میں کس حد تک مخلص ہیں اور اِس راہ کی صعوبتیں کس حد تک برداشت کر سکیں گے، اُن سے ایک Commitment لی جاتی تھی جو بظاہر تو یک طرفہ نظر آتی تھی لیکن در حقیقت دو طرفہ تھی۔

رُوحانیت کی راہ پر چلنے کا خواہش مند یہ Commit کرتا تھا کہ میں اپنا ماضی اِس خانقاہ کے دروازے پر چھوڑ آیا ہوں۔ اب میں وہ کچھ کروں گا جس سے رب راضی ہو جائے...... اور یہ سب کچھ میں اس انداز میں کروں گا جس انداز میں مرشد یا خانقاہ کا درویش مجھے گائیڈ کرے گا۔ خانقاہ کے درویش کی جواب میں یہ Commitment ہوتی تھی کہ میں تمھیں حتی الامکان بہترین تعلیم و تربیت دینے کی کوشش کروں گا۔ اس Mutual commitment کو بیعت کا نام دیا گیا۔

بیعت عربی کے لفظ "بیع" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے سودا یا فروخت کر دینا۔ جو مرید درویش کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر Commitment کرتا ہے وہ دراصل درویش کے ہاتھ خود کو فروخت کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُس کی اپنی کوئی خواہش، مرضی، ارادہ یا ضرورت نہ رہی...... اب وہ درویش کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کرے گا۔

خانقاہ کے درویش واقعتاً درویش تھے۔ وہ دُنیاوی لالچ و اغراض سے مبرا ہوتے اور بے لوث خدمت خلق کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے ہاتھوں مرید کے Exploit ہونے کا اندیشہ نہ تھا...... یہ خانقاہی نظام چلتا رہا۔

تب برصغیر پاک و ہند میں ہندومت نمایاں تھا۔ ہندومت دُنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اُس میں اس قدر تبدیلیاں ہوئیں کہ اب وہ مذہب نہیں رہا بلکہ رسم و رواج کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے...... اس میں بہت سی خرابیاں در آئیں۔ ہندو پنڈتوں، سادھوؤں اور پروہتوں نے اس مذہب کی ایسی طرح ڈالی کہ اس میں تربیت بہت کم اور Exploitation بہت زیادہ ہوگئی۔

اِس خطے میں چونکہ اکثریت ہندو سے مسلمان ہوئی اِس لیے اُنھوں نے اِس اثر کو جلدی قبول کیا اور یوں دین اسلام میں پیری مریدی کے رُجحان نے جنم لیا...... جہاں تعلیم و تربیت کم اور مرید کی Exploitation زیادہ ہے۔

جب آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو آپ اُس کی ہر بات ماننے کے پابند ہیں لیکن وہ درویش

بھی پابند ہے کہ آپ کو نہایت سختی سے dos اور Don'ts پر عمل کرنے پر مجبور کردے۔ بیعت کرنے والا مرید کہلاتا ہے اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے اُسے مرشد کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی معنوں میں مرید وہ ہے جو اللہ کی رضا طلب کرتا ہے۔ اس کے تین پہلو ہیں:

(الف) مرید

(ب) مراد

(ج) مقصود

مرید ابتدا ہے۔ مراد انتہا ہے اور مقصود کا تعلق ارادت سے ہے۔ مرید کو یوں بھی Define کیا جاسکتا ہے کہ مرید وہ ہے جو بوجھ اُٹھاتا ہے۔ مراد وہ ہے جس سے رب بوجھ ہٹا دیتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ مرید وہ ہے جو تدبیر علم سے Operate ہوتا ہے کیونکہ مرید جب اللہ کی رضا کے حصول کے لیے پہلا قدم اُٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے مختلف قسم کے مصائب و آلام اور مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ معاذ اللہ، رب تعالیٰ آپ کو مصیبت دے کر خوش ہوتا ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کوئی ایسی مضبوط عمارت بنانا چاہتے ہیں جو زلزلے کے شدید جھٹکے سہہ جائے، Windstorm اور آسمانی بجلی بھی برداشت کرے اور لوگوں کے ہجوم کا بوجھ بھی اُٹھالے تو اِس کے لیے ضروری ہے کہ اُس عمارت کی بنیادیں اور اُس کے Load- bearing wheels بہت مضبوط ہوں۔ سول انجینئرنگ کی زبان میں بنیادوں کو جس قدر زیادہ Setting کا ٹائم دیا جائے گا اُسی قدر وہ بنیادیں مضبوط اور دیرپا ہوں گی۔ اِسی طرح مرید کو اگر چکی کے دو پاٹوں میں ڈال کر پیسا نہیں جائے گا تو اُسے مصیبتیں اُٹھانے کی پریکٹس نہیں ہو سکے گی...... جس کی وجہ سے وہ ذرا سی مصیبت پر چیخ اُٹھے گا...... لیکن اگر اُسے چکی کے دو پاٹوں میں پیسا گیا ہے تو مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کر اُس میں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے گا اور جب انسان مصیبتوں کو ہنسی خوشی سہنا سیکھ لیتا ہے تو حضرت علیؓ کے فرمان کے مطابق ریاضت کا اجر صبر ہے۔

ہم جتنی ریاضتیں، مجاہدے اور چلہ کشی کرتے ہیں اُن سب کا اجر صبر ہے۔ انسان مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کر بھی اُف نہیں کہتا اور یوں صابر ہو جاتا ہے...... وہ اپنے نفس کو ہر لحظہ شکست دیتا ہے۔ جب دل میں کوئی خواہش جنم لیتی ہے تو وہ اُس کے برعکس عمل کرتا ہے۔ بھوکا ہو تو خاموشی سے سہتا ہے اور ظاہر نہیں ہونے دیتا...... لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ میں فاقے سے مر رہا ہوں یا مجھے نقاہت ہو رہی ہے۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ فقیر پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خود کو بہت سکھی ظاہر کرتا ہے۔ مفلس اور تنگ دست ہو تو خود کو امیر ظاہر کرتا ہے...... بیمار ہو تو خود کو تندرست ظاہر کرتا ہے یہ صبر کا دوسرا نام ہے۔ مرید اِن تمام مراحل سے گزرتا ہے۔ صبر تین قسم کا ہے۔ جس میں سے ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امر و نہی پر عمل پیرا ہونے کے دوران انسان تکلیف سے گزرتا ہے اور اُس تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے...... یہ صبر ہے۔

راہِ تصوف میں مرید میں صبر اور شکر کی خصوصیات پیدا کرنے کے لیے اُسے چکی کے دو پاٹوں میں رکھ کر

پیسا جاتا ہے اور دُنیا کی کوئی آزمائش یا مصیبت ایسی نہیں جس میں سے اُسے گزارا نہ جائے۔ جب وہ ان تمام مصیبتوں کو آسانی سے سہہ جاتا ہے تو رب اُس سے راضی ہو جاتا ہے اور اُسے اپنا قرب اور دوستی عطا فرما دیتا ہے۔ جب مرید کو یہ مقام عطا ہو جاتا ہے تو اِس سٹیج پر اُسے اپنے آپ سے لڑنا نہیں پڑتا کیونکہ اُس کا نفس اتنا عادی ہو گیا ہوتا ہے کہ کوئی خواہش ہی نہیں کرتا۔ اب اُس کا ہاتھ پاؤں عادتاً Slip ہی نہیں ہوتا۔ یوں اللہ اُس پر سے آزمائشوں، مصیبتوں اور لمبی چوڑی عبادات کا بوجھ ہٹا لیتا ہے۔ پھر وہ صرف فرض اور سنتیں ادا کرتا ہے۔ اللہ اُسے آسانی کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ یہ مراد کا مقام ہے۔ اِس مقام پر پہنچ کر انسان کی زبان دوسروں کو نصیحت کرنے لگتی ہے اُس کی ذات سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے Lighthouse اور گھنا سایہ دار درخت بن جاتا ہے جس کے نیچے ہر کوئی پناہ لے سکتا ہے۔ وہ پناہ دیتے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ اِس شخص نے گرم موسم میں مجھے پانی لگایا تھا، کھاد ڈالی تھی یا میری جڑیں کاٹی تھیں......وہ سب کو یکساں سایہ فراہم کرتا ہے۔

دُنیاوی نظروں سے دیکھیں تو حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ Popular (مشہور) وہ شخص ہوتا ہے جس سے دُنیا کو فائدہ پہنچتا ہے...... یوں درویش ایک کامیاب دُنیادار بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اور لوگ اُس سے پیار کرتے ہیں۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلتا ہے تو چار آزمائشوں سے گزرتا ہے:

سب سے پہلے مالی حالات کی صورت میں آزمائش آتی ہے اور وہ Financial crunch بعض اوقات اِس قدر ناقابلِ تصور اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے کہ اُس سے گھبرا کر اکثریت رُوحانیت کی راہ سے واپس دُنیا کی طرف لوٹ جاتی ہے......اور جو خوش قسمت لوگ اِس سٹیج سے کامیابی سے نکل جاتے ہیں اُن کو اگلی سٹیج پر مالی آزمائش کے ساتھ گھریلو بے سکونی کا اِس حد تک سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات نوبت طلاق تک چلی جاتی ہے...... یوں مالی اور ذہنی بے سکونی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اِس سے گھبرا کر پلٹ جاتے ہیں......لیکن چند خوش نصیب حوصلہ نہیں ہارتے اور یہ دونوں چیزیں آرام سے سہہ جاتے ہیں۔ پھر اُنھیں ایک تیسری آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ دُنیا بھر کی تہمتیں، الزامات اور عیب برداشت کرنا پڑتے ہیں...... جو کل تک تعظیماً سلام کیا کرتے تھے وہ اُس پر تھوکنے لگتے ہیں۔ اب ایک طرف تو وہ شخص Financial crunch سے گزر رہا ہے، شام کو گھر میں عذاب سہتا ہے، اب اِس سب کے ساتھ ساتھ اُسے لوگوں کے طعنے اور الزام تراشیاں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اگر وہ اِس مرحلے میں بھی ثابت قدم اور کامیاب رہا تو چوتھی سٹیج پر اُسے ان بدترین حالات میں ایسی ترغیبات ملنے لگتی ہیں۔ جب بجلی کٹی ہو، گھر کا کرایہ دینے کے لیے پیسے نہ ہوں، گھر میں لمبا چوڑا جھگڑا چل رہا ہو......الزامات نے زندگی اجیرن کی ہو......ایسے میں جب ترغیبات ملنے لگیں تو انسان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ ان مراحل میں سے ہر ایک کو گزرنا پڑتا ہے۔ اِس میں نہ کوئی Exception نہ Exemption۔ ان چاروں آزمائشوں میں عموماً تقریباً چھ،

سات یا آٹھ سال کا عرصہ لگتا ہے۔ اس مدت یا دورانیہ کا انحصار اس بات پر ہے کہ جو شخص اس مرحلے میں سے گزر رہا ہے اُس کی باڈی اور رُوح کی کیمسٹری کیا ہے۔ اُس کا تعلیمی لیول کیا ہے۔ ذہانت کا لیول کیا ہے Imagination کا لیول کیا ہے۔ یہ سب Factors فیصلہ کرتے ہیں کہ اس سارے Process میں اُسے کتنا عرصہ لگے گا۔ جب وہ ان آزمائشوں سے کامیابی سے گزر جاتا ہے تو مراد کو پہنچتا ہے۔ تب اُس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ وہ تمام نعمتیں جو واپس لے لی گئی تھیں وہ Multiply ہو کر عطا کی جاتی ہیں۔ اگر وہ شخص پہلے Millionaire تھا تو اب Billionaire ہو جائے گا۔ جو عزت گئی تھی اُس کی جگہ زیادہ اور بہتر کوالٹی کی عزت ملے گی۔ گھر کا جو سکون چھن گیا تھا وہ اچھے لیول میں لوٹ آئے گا۔ یہ مراد کا مقام ہے۔

سوال: بزرگانِ دین، شہداء اور ایک عام آدمی موت کے بعد کیا شعوری طور پر کہیں موجود ہوتے ہیں یا قیامت تک کے لیے سلا دیے جاتے ہیں؟

جواب: رُوح اور جسم انسان کے Essential ingredients ہیں۔ جسم مختلف اعضا سے مل کر بنا ہے جب کہ رُوح Single component ہے۔

انتقال کے وقت رُوح پرواز کر کے عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے اور جسم زمین میں دفن ہونے کے بعد عموماً گل سڑ جاتا ہے...... شعور اور لاشعور کا تعلق Brain سے ہے اور Brain اُس جسم کا حصہ ہے جو انتقال کے بعد گل سڑ گیا...... یوں شعوری یا لاشعوری طور پر زندہ رہنے کا سوال ہی نہیں۔ جب کہ رُوح زندہ و جاوداں ہے...... وہ فنا نہیں ہوتی۔ ارواح انتقال کے بعد اپنے اعمال کی مناسبت سے عالمِ برزخ کے متعلقہ درجے میں رہتی ہیں۔ وہاں وہ نیند کے عالم میں نہیں ہوتیں...... اُنھیں حالات و واقعات کا شعور رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کا انتقال ہو گیا، اُس کے لواحقین نے قرآن خوانی کروائی اور اُس کا ثواب مرحوم کی رُوح کو بخش دیا۔ اِس دُنیا سے رُخصت ہو جانے والی رُوح اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کے اضافے پر قادر نہیں لیکن جب ورثا یا لواحقین اُسے ایصالِ ثواب کرتے ہیں تو رُوح کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے تمھارے نامۂ اعمال میں یہ ثواب پہنچایا ہے۔ اِسی طرح کچھ دیگر اطلاعات بھی اُس رُوح کو ملتی رہتی ہیں۔

سوال: قرآنی تعلیم کے بغیر بیعت کے کیا معنی ہیں؟ خانقاہی نظام نے زر پرستی پر کیا اثرات مرتب کیے؟

جواب: برصغیر پاک و ہند میں ہندوانہ رُسوم و رواج کے اثرات کی وجہ سے خانقاہی نظام رفتہ رفتہ زر پرستی کی جانب چلا گیا۔ خانقاہوں میں تین طرح کے لوگ آتے تھے...... کچھ لوگ وقتی طور پر مسئلہ پوچھنے یا دُعا کرانے کے لیے آتے تھے، کچھ لوگ علمِ قرآن، علمِ فقہ و حدیث یا علمِ تفسیر کے حصول کے لیے آتے اور کچھ لوگ مکمل تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ جب آپ کسی سکول میں داخلہ لیتے ہیں تو وہاں کے تمام اُصول و قواعد کی تعمیل کرنا آپ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ہیڈ ماسٹر کا فیصلہ حتمی تصور ہوتا ہے۔ داخلے سے پہلے آپ اُس کے شرائط نامے پر دستخط کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرائمری کلاس کیے بغیر اُس شرائط نامے پر Sign کیوں کیے جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب! سکول میں داخلے کا مقصد ایجوکیشن ہے اور ایجوکیشن

حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سٹوڈنٹ Disciplined ہو اور Disciplined ہونے کے لیے اُصول وضوابط کی پابندی لازم ہے۔ دستخط کر کے ہم Agree کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم تمام متعلقہ Rules and regulations کی پابندی کریں گے۔ اِس طرح بیعت کے وقت آپ Rules and regulations (اُصول وضوابط) کے فارم پر دستخط تو نہیں کرتے ...... لیکن آپ اُس خانقاہ کے درویش کے سامنے عہد کر رہے ہوتے ہیں کہ میں جب تک اِس خانقاہ سے منسلک رہوں گا، اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر کاربند رہوں گا اور اِس سلسلے میں مجھے آپ کی طرف سے جو بھی ہدایات دی جائیں گی، میں اُن کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کروں گا۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرنے میں اپنی تمام تر ذہنی وجسمانی قوتوں کو بروئے کار لاؤں گا۔ اِن شرائط پر وہ پہلے بیعت کرتا ہے، اس کے بعد قرآنی علم سیکھتا ہے۔

سوال: رشوت ستانی کے خاتمے اور معاشرہ کے سدھار کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: رشوت ستانی انتہائی سنجیدہ مرض بھی ہے اور مسئلہ بھی۔ رشوت ستانی پانچ منٹ کے اندر اندر اس قوم سے ختم ہو سکتی ہے اور آیندہ پانچ ہزار سال تک جنم نہیں لے گی اگر ہم ایمان داری کو اپنا شعار بنالیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ فرض کریں اگر میرا بیٹا، بھانجا، بھتیجا یا کوئی اور عزیز چوری کرتا ہے اور پولیس اُسے پکڑ کے لے جاتی ہے تو میرا پہلا Reaction یہ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھوں گا کہ آیا میرا کوئی جاننے والا پولیس میں ہے۔ میں اُسے فون کر کے کہوں گا کہ آپ SHO سے سفارش کریں کہ وہ فلاں آدمی کو چھوڑ دیں۔ اگر میری کوئی ایسی جان پہچان نہیں ہے تو پھر میں SHO کو پیسے دے کر اپنے عزیز رشتہ دار کو چھڑالوں گا۔

اگر میں کہیں ہیڈ کلرک ہوں تو میری کوشش یہ ہوگی کہ لوگوں کے کام میرے پاس اٹکے رہیں ...... وہ دو چار بار آ کے مجھے سلام کریں اور بالآخر تنگ آ کر مجھے پیسے دے کر اپنا کام کرالیں۔

اِس کے برعکس اگر میں سوچتا ہوں کہ سولہ کروڑ آبادی میں سے اگر میرا بیٹا، بھتیجا یا بھائی پکڑا جاتا ہے تو میں اُس کی سفارش نہیں کرتا بلکہ پولیس سے کہتا ہوں کہ اگر اِس نے غلط کام کیا ہے تو اِس کو اُس کی سزا ملنی چاہیے۔

اگر میں یہ سوچوں کہ مجھے بس اپنے آپ کو درست کرنا ہے۔ میں ہیڈ کلرک ہوں، پورا دفتر کام کرے یا نہ کرے لیکن میرے پاس جو فائل بھی آتی ہے بغیر یہ دیکھے کہ وہ دوست کی ہے یا دشمن کی، میں میرٹ پر کام کرتے ہوئے اُسے آگے بھیج دوں ...... یوں کم از کم پورے معاشرے میں ایک آدمی تو سدھر جائے گا۔ اگر سولہ کروڑ آبادی میں سے ہر فرد یہ سوچ اپنالے کہ مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے ...... دوسرا خواہ کچھ بھی کرے ...... یوں پانچ منٹ میں سارا معاشرہ درست ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ شخص اپنی جگہ یہ سوچ لے کہ دوسرے لوگ بھی تو غلط کر رہے ہیں، اگر میں بھی ایسا کرلوں تو کیا فرق پڑتا ہے تو پھر معاشرہ پانچ ہزار سال میں بھی نہیں سدھر سکتا۔

طرزِ فقیر

مرید وہ ہوتا ہے جو اللہ کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک خاص ڈھب پر لا کر اِس انداز میں چلنے لگتا ہے کہ جس سے رب تعالیٰ راضی ہو جائے۔ اِس طرزِ زندگی میں انسان کو بے پناہ مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان اِن دِقتوں، تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزرتے ہوئے ایک مومن کی سی زندگی بسر کرتا ہے تو مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کو رب تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے اور رب تعالیٰ انسان سے اُن سختیوں اور تکالیف کو دُور فرما دیتا ہے۔ وہاں سے انسان کی اعلیٰ اور اچھی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ مرید کی زندگی مجاہدات اور ریاضتوں سے عبارت ہوتی ہے جب کہ مراد کی زندگی بخشش کی زندگی ہے۔ مرید مجاہدے کرتا ہے جب کہ مراد صرف فرائض، وجوب اور سنتیں ادا کرتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے مرید اور مراد کا فرق پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ "مرید تدبیرِ علمی کے تحت جب کہ مراد بخشش اور عطا کے تحت زندگی گزارتا ہے۔"

جب انسان مراد کے مقام پر پہنچتا ہے تو رب تعالیٰ اُسے عالمِ حیرت کی سیر کرا دیتا ہے۔ عالمِ جبروت میں حاکم جبروت اُسے جلالِ رب کا مشاہدہ کراتے ہیں۔ وہاں سے اُسے عالم جمال میں لایا جاتا ہے اور اُسے جمال کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے...... یوں اُسے مختلف مقامات پر مختلف مشاہدات ہوتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے سے بہت قریب کرتا ہے تو اُس پر ایک اور عنایت فرما دیتا ہے کہ اُسے ایک حد تک اپنی قدرت کے مشاہدے کی اجازت دیتا ہے۔ اِس طرح اپنے کارخانۂ قدرت کے اسرار اپنے بندے پر ایک حد تک واضح کر دیتا ہے لیکن وہ اسرار مخلوق کے سامنے بیان کرنے پر پابندی ہوتی ہے۔

جب وہ اُن اسرار سے واقف ہوتا ہے اور قدرت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے تو پھر اُس کی زبان سے خلقِ خدا کے لیے ہدایت کی باتیں نکلنے لگتی ہیں...... جو دل پر اثر کرتی ہیں اور خلقِ خدا اُن سے فائدہ حاصل کرنے لگتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم اولیائے کرام کے طور پر جانتے ہیں۔

اِس مقام پر پہنچ کر بظاہر تو اولیائے کرام جسمانی طور پر مخلوق کے درمیان موجود ہوتے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ ہر لمحہ رب تعالیٰ کی طرف رُجوع رکھتے ہیں۔ اُن کا دل ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ اُن سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوتا جو کسی طرح بھی شرعی احکامات کے منافی ہو۔ وہ اللہ کے طے کردہ Parameters پر

بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں...... اس مقام پر وہ مراد کہلاتے ہیں۔

مرید اور مراد میں ایک فرق یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ جو معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ ﷺ کا ہے، وہ مرید اور مراد کا معاملہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تمام تر سلوک کوہِ طور پر ختم ہو جاتا ہے لیکن آپ ﷺ کی رسائی عرش اور لوحِ محفوظ تک تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مرید اور آپ ﷺ مراد ہیں۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ مرید اور مراد کے بارے میں صرف علم حاصل کر کے سر دُھننے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا رویہ مرید کا سا کر لیں۔ اپنی تمام توجہ اللہ پر مرکوز کر لیں۔ غیر اللہ سے کوئی توقع اور اُمید نہ رکھیں۔ امرِ الٰہی پر راضی رہیں۔ رب تعالیٰ کی طرف سے ہم پر جو کچھ نعمت، رحمت یا زحمت نازل ہو ہم اُسے بغیر کسی گلے شکوے کے ہنسی خوشی برداشت کر لیں۔ اپنی تمام تر تمنائیں ترک کر کے رب تعالیٰ کی آرزوؤں، ارادوں اور خواہشات میں داخل ہو جائیں۔

اِس راہ میں شروع میں ہمیں دقت پیش آئے گی۔ بظاہر دُنیاوی نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں "بظاہر" پر زور دے رہا ہوں کیونکہ ہمیں یہ سودا بظاہر تو گھاٹے کا لگتا ہے......لیکن درحقیقت یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہوتا...... بلکہ دُنیاوی و اُخروی دونوں لحاظ سے اِس سے فائدہ ہی ہوتا ہے۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے خلقِ خدا میں Popular ہو جاتے ہیں اور ہمیں عزت ملتی ہے۔ جس کا Ultimate فائدہ ہمیں بزنس میں کامیابی کی صورت ملتا ہے یا جاب میں ترقی اور اچھی تنخواہ کی شکل میں حاصل ہوتا ہے...... کیونکہ ہم میں سے ہر شخص کو وہی آدمی پسند آتا ہے جو اُسے آسانیاں فراہم کرے اور اُس کے لیے خود تکلیفیں اُٹھائے۔ یوں ہمیں دُنیاوی طور پر بھی اِس راہ میں فائدہ ہی ہوگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شروع میں بظاہر ہمیں یہ گھاٹے کا سودا لگے گا۔ اگر ہم اِس اُمید پر کہ اِس کا انعام ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی صورت میں حاصل ہوگا، اِن پریشانیوں اور دُکھوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے تو مراد کو پہنچ جائیں گے۔ اِس مقام پر پہنچنے کے بعد یہ دقتیں اور تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔ وہاں پھر رب تعالیٰ غیب سے رزق بھی فراہم کرتا ہے، مدد بھی آتی ہے اور انسان کی زندگی خاصی پُر آسائش اور آسان ہو جاتی ہے۔ لٰہذا اِن باتوں کو سن کر یہیں چھوڑ کر نہ چلے جائیں بلکہ ان پر ذرا سا عمل کر لیں۔ ہم اس میں پہلا قدم یہ لے لیں کہ جب تک ہمارے ارادے کی تکمیل نہیں ہوتی ہم ہائے ہائے کرنے کی بجائے یہ سوچ لیں کہ ہم تھوڑا سا انتظار کر لیں۔ ہوسکتا ہے اِس کا متوقع نتیجہ ہمارے لیے بہتری کی صورت میں نکلے۔ اِس سوچ کے بعد رب تعالیٰ یقینی طور پر ہمیں اِس کا انعام ہی عطا فرمائے گا۔

ہمارے ایک قریبی جاننے والے کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اُن کے سینئرز انھیں اُن کا حق دینے پر آمادہ نہ تھے لٰہذا اُن کی ترقی نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں اُن سے یہی کہتا کہ چھوڑیئے پروفیسر صاحب! ترقی میں کیا رکھا ہے؟ ایک دُنیاوی ترقی کے لیے کسی کے سامنے جا کر کیا ہاتھ پھیلانا...... ! بیٹھے رہیے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر چیز عطا فرما دے گا۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اُن پروفیسر صاحب کو ترقی ملی یا نہیں...... لیکن مجھے یہ ضرور معلوم

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں Unprecedented قسم کی عزت عطا فرمادی۔ ترقی کی صورت میں شاید اُنھیں ہزار دو ہزار ماہانہ فائدہ ہو جاتا لیکن وہ اس عزت کے مقابلے میں رتی برابر بھی نہیں ہوتی۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ اُن کی خودداری مشہور ہوگئی جو بذاتِ خود ایک بہت بڑی عزت ہے۔

لہٰذا جب ہماری خواہش پوری نہ ہو تو اگر ہم تھوڑا سا انتظار کرلیں اور شور نہ مچائیں کہ یہ کیا ہوگیا تو کچھ ہی عرصے میں معاملات کھل کر سامنے آجائیں گے اور ہم جان جائیں گے کہ اِس خواہش کا پورا ہونا ہمارے لیے نقصان دہ تھا یا پھر یہ پتا چل جائے گا کہ ہم تو بہت کم مانگ رہے تھے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بہت زیادہ عطا کرنا چاہتا تھا۔

مرید سے مراد تک کے سفر کا پہلا قدم یہ ہے کہ آج تہیہ کرلیں کہ کسی شخص سے ہمیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے...... کوئی شخص ہمارے خلاف کتنی ہی سازشیں کیوں نہ کرے...... کتنی ہی ہماری جڑیں کیوں نہ کاٹے یا کتنی ہی ہماری توہین کیوں نہ کرے...... ہم اُس شخص کے بارے میں اپنے دل میں کوئی میل نہ آنے دیں۔ یہ مرید کا وہ پہلا قدم ہے جو اُسے مراد تک لے جائے گا۔ اِس کے ساتھ ساتھ اگر آپ یہ کرسکیں کہ کوئی آدمی آپ کو جتنا نقصان پہنچا رہا ہے، بدنام کر رہا ہے، آپ کی جڑیں کاٹ رہا ہے اور آپ کے خلاف کام کر رہا ہے آپ اُس پر ظاہر کیے بغیر اُتنا ہی زیادہ اُس پر مہربان ہو جائیے۔

پہلے قدم پر آپ کو ایک اور چیز کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عہد کریں کہ ہم کسی شخص کا کوئی عیب اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ کوئی شخص ہمیں کتنی ہی اہم یا غیر اہم بات کیوں نہ بتائے ہم اُسے امانت سمجھ کر اپنے اندر دفن کرلیں گے اور کہیں بھی اُس بات کو Quote نہیں کریں گے اہلِ فقر اِس حد تک لوگوں کے رازوں کی حفاظت کرتے ہیں کہ باتوں کی روانی میں بھی کبھی یہ ذکر تک نہیں کرتے کہ فلاں دن فلاں شخص میرے پاس آیا تھا اور ہم نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔

یہ بات بظاہر تو ہمارے لیے بہت معمولی سی ہے لیکن اِس کی Implications بہت زیادہ ہیں۔ فرض کریں کہ ایک صاحب لاہور تشریف لائے اور سیدھا مجھ سے ملنے چلے آئے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے اِس ملاقات کا تذکرہ کر دیا۔ اب میرے اُن دوست کے بہن بھائیوں میں سے کسی کا تعلق اُن صاحب سے بہت قریبی ہے۔ اُنھیں جب اُن کی لاہور آمد کا پتا چلتا ہے تو اُن کا دل دُکھے گا کہ وہ ہم سے تو ملنے نہیں آئے...... شاہ صاحب سے ملنے چلے گئے۔

بظاہر چھوٹی سی نظر آنے والی یہ بات دلوں میں میل کا سبب بن سکتی ہے۔ جب تعلقات میں ہلکا سا کھچاؤ آیا تو اُس کا سبب کون ہوا؟ یقیناً وہ شخص جس نے یہ بتایا کہ فلاں شخص مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ فقیر تو یہاں تک احتیاط کرتا ہے کہ آپ یہاں تشریف لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جانے کے بعد آپ کے بہن بھائیوں یا خاندان میں سے کوئی آکر مجھے کہتا ہے کہ ابھی فلاں صاحب آپ کے پاس آئے ہوئے تھے اُنھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تو میں کہا کرتا ہوں مجھے نہیں معلوم، میں کسی کے بارے میں نہیں جانتا

کہ کوئی آیا تھا یا نہیں آیا تھا...... آپ اپنی بات کیجیے۔ تب وہ ضد کرنے لگتے ہیں کہ وہ میرے والد ہیں۔ میں بیٹا ہوں اُن کا۔ تب میں کہتا ہوں کہ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں ناں کہ آپ اُن کے بیٹے ہیں مجھے کیا معلوم کہ وہ واقعی آپ کے والد ہیں۔ یوں بعض اوقات لوگ Argument کرنے لگتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ فقیر رازداری کے اُصول پر سختی سے کاربند رہتا ہے۔

بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کا یہاں آنا میرے پاس امانت ہے...... لہٰذا اس کا کہیں ذکر نہیں کیا جائے گا۔ کوئی بھی فقیر کبھی Disclose نہیں کرے گا کہ فلاں شخص مجھے ملا، مجھے اُس کا فون یا خط آیا۔

لوگوں کو غلطی کرتے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا کیجیے کہ جیسے آپ نے دیکھا ہی نہیں۔ یوں آپ کو نہ اُن کی غلطی یاد رہے گی اور نہ ہی کہیں اُس کا ذکر ہو پائے گا۔ کسی کی اپنے ساتھ ہونے والی گفتگو کا کوئی حصہ...... خواہ وہ کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو...... کہیں Quote مت کیجیے۔ بس اپنی ذات تک رکھیے۔ کسی کے ساتھ آپ کا کیا لین دین ہے...... اُسے بھی اپنی ذات تک رکھیے۔ اِن باتوں پر عمل کر کے آپ مرید سے مراد تک کا سفر بڑی جلدی طے کر لیں گے۔ ہمارے اِس رویے کی بنا پر اللہ تعالیٰ مرید کے سفر میں آنے والی سختیوں اور ریاضتوں سے ہمیں نجات عطا فرما دیتا ہے کیونکہ اُسے اپنی مخلوق بے پناہ عزیز ہے۔ اِس پر عمل کرنے کی کوشش کر لیجیے۔ ان شاء اللہ دو ڈھائی سال بعد آپ مراد کے مقام کو پہنچ جائیں گے۔

سوال: رُوحانیت کی راہ تو بہت مشکل دکھائی دیتی ہے اِس پر کیسے چلا جائے؟

جواب: دُنیا میں کوئی ایسی مشکل نہیں جس پر انسان قابو نہ پا سکتا ہو۔ اگر انسان نے اللہ سے یہ دُعا مانگی ”اے اللہ تعالیٰ! میں اِس راہ پر چلنا چاہتا ہوں، تو مجھے توفیق عطا فرما اور میرے لیے اِس راہ کو آسان فرما دے!“ اللہ تعالیٰ اُس شخص کے لیے یہ راہ آسان کر دے گا۔ اگر انسان پختہ ارادے سے اِس راہ پر چلے تو پھر یہ مشکل نہیں رہتی۔ جب آپ ایک بار اِس راہ پر قدم رکھ دیتے ہیں تو یہ Nature کا حصہ بن جاتا ہے اور بغیر کسی شعوری کوشش کے انسان اِس پر عمل کرتا چلا جاتا ہے۔ شروع کے دس پندرہ دن تو انسان جھنجھلاتا ہے پھر سب ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔

سوال: اِس کائنات میں عجب بھید اور اسرار محسوس ہوتا ہے۔ اِس اسرار کو کیسے سمجھا اور جانا جا سکتا ہے؟

جواب: آپ نے جو شرٹ پہن رکھی ہے اِس کا کپڑا فیکٹری میں تیار ہو کر آپ کے پاس آیا ہے اور فیکٹری سے بھی پہلے اِس کپڑے کی تیاری کھیت میں کاٹن کی شکل میں ہوئی۔ اِس کپڑے کو آپ تک پہنچنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا، آپ اُن سے ناواقف ہیں تو وہ آپ کے لیے اسرار ہیں۔ اگر آپ کو ایک آدمی ٹیکسٹائل (Textile) مل میں لے جائے جہاں آپ کاٹن، اُس کی Combing پھر دھاگا بنتے اور کونوں کی صورت میں Weaving section میں جاتا دیکھتے ہیں۔ وہاں اُس کی Warping ہوتی ہے، اُس کا تانا بانا تیار ہوتا ہے پھر اُس کی بنائی ہو رہی ہوتی ہے جب آپ اِس سارے مرحلے سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو گویا قمیص کے بننے کے اسرار سے آگاہ ہو رہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح رب تعالیٰ کی اِس کائنات کا نظام بہت Implicit ہے۔ اُس کے فرشتے اُس کا حکم بجا لا رہے ہیں۔ ہمارے علاوہ بھی مخلوق ہے، بہت سے مقامات ہیں...... ستر ہزار جہانوں اور بیس ہزار عالموں میں چھپی چیزیں ہیں۔ یہ سب چونکہ ہمارے ذہن و عقل سے ماورا ہیں اور ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اِس لیے اسرار کہلاتی ہیں۔ رب تعالیٰ جب کسی شخص سے راضی ہو کر اُسے اپنے خواص اور حلقۂ دوستی میں شامل کرتا ہے تو اُس پر یوں کرم نوازی کرتا ہے کہ اپنے کارخانۂ قدرت میں سے اُسے تھوڑا سا حصہ دیکھنے کی اجازت دیتا ہے...... وہ رب تعالیٰ کے نزدیک تو تھوڑا سا حصہ ہوتا ہے لیکن ہمارے لیے گویا پوری کائنات ہوتی ہے۔

سوال: کیا اسرارِ کائنات کی آگہی سے رب تعالیٰ پر توکل بڑھ جاتا ہے؟

جواب: آپ جانتے ہیں پرائم منسٹر پاورفل آدمی ہے لیکن اگر آپ اُسے پرائم منسٹر ہاؤس یا پرائم منسٹر سیکرٹریٹ میں کام کرتا دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اُس کی ذمہ داریوں اور اختیارات کی وسعت کیا ہے۔ اس کے بعد آپ کا ذہن اُس کے بارے میں Clear ہو جائے گا۔

ہم رب تعالیٰ اور اُس کی ذات و صفات پر غائبانہ ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں اُس کے کارخانۂ قدرت کا تھوڑا سا حصہ بھی نظر آ جائے گا تو ہمیں رب تعالیٰ کی عظمت کا شدت سے احساس ہوگا کہ واقعی وہ کتنا بڑا ہے۔

سوال: کیا اِس دُنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد ارواح پر عالمِ بالا کے اسرار عیاں ہو جاتے ہیں؟

جواب: موت کے بعد ارواح پر عالمِ بالا کے اسرار نہیں کھلتے کیونکہ عالمِ بالا، عالمِ برزخ سے اُوپر ہے اور رُوحیں وہاں تک نہیں جا پاتیں۔ عالمِ برزخ کے دو حصے ہیں: علیین اور سجین...... علیین میں نیک لوگوں کی ارواح جب کہ سجین میں بدلوگوں کی ارواح ہوتی ہیں۔ عالمِ برزخ اور زمین کے درمیان کے معاملات تو ارواح کے علم میں ہوتے ہیں لیکن عالمِ برزخ سے اُوپر کے عالم کے معاملات سے ارواح واقف نہیں ہو پاتیں۔

سوال: کیا رُوح کو کسی شے کا ادراک ہوتا ہے؟

جواب: رُوح ایک مکمل چیز ہے اور اُسے ویسے ہی ادراک ہوتا ہے جیسے ہمیں اس عالمِ اسباب میں ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر ہمارے جسم میں سوئی چبھ جائے تو ہمیں تکلیف کا احساس ہوگا لیکن رُوح کو سوئی چبھو کر تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے حواسِ خمسہ جسم سے متعلق ہیں...... رُوح میں یہ نہیں ہوتے لیکن اِس کے باوجود رُوح کو ہر شے کا اِدراک ہوتا ہے۔

سوال: جب کوئی تکلیف دے تو کیا اُس شخص کے خلاف کوئی ایکشن لینا چاہیے؟

جواب: اِس کے دو پہلو ہیں: اگر ایک شخص نے مجھے ذاتی طور پر دکھ یا تکلیف پہنچائی تو معاف کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آئے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ خود معاف فرمانے والا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں بحیثیت جماعت نقصان پہنچاتا ہے تو ہمیں اُس کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے اور اُس کے ظلم سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔

سوال: اگر کوئی شخص ہماری جائداد پر قبضہ کرلیتا ہے یا مختلف طریقوں سے نقصان پہنچاتا ہے، ایسے میں ہم کیا کریں؟

جواب: مجھے سر ظفر اللہ خان کا ایک واقعہ یاد آ گیا (اُنھیں ہم اُن کے عقائد سے ہٹ کر بحیثیت انسان دیکھ لیں) ایک انٹرویو میں اُن سے سوال کیا گیا کہ مسلم قوم زوال پذیر کیوں ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا Tolerance کی وجہ سے۔ "انٹرویو لینے والے نے پوچھا" اسلام کی تو بنیاد ہی Tolerance پر ہے۔ "جس پر اُنھوں نے جواب دیا" اسلام انفرادی سطح پر Tolerance کی تلقین کرتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر Tolerance کی اجازت نہیں دیتا۔ "اگر ہم اپنے آپ کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اگر پڑوسی میرے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ پھینکتا ہے یا اُس کے گھر کے پرنالے کا پانی کسی Technical fault کی وجہ سے میرے گھر میں گرنے لگتا ہے تو میں دنگا فساد پر اُتر آؤں گا۔ لیکن اگر میں کسی کو ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کرتے دیکھتا ہوں تو منہ دوسری طرف کر لیتا ہوں۔

ہم لوگ اسلام کو سمجھنے کے بارے میں بھی تھوڑے سے Selective ہو گئے ہیں۔ اگر میں اپنے مسلمان بھائی سے لڑائی جھگڑا نہ کروں اور اُس کی زیادتی کو درگزر کر جاؤں تو یہی اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔

یہ جائداد مادی چیز ہے...... آج ہے، کل نہیں ہوگی...... میں دُنیا سے چلا جاؤں تو یہ جائداد میرے ساتھ تو جائے گی نہیں۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں زیادتی کرنے والے شخص کو اللہ کے نام پر معاف کر دوں اور اِس جھگڑے کو یہیں دفن کر دوں۔ یوں مجھے اللہ سے اُس کا بے پناہ اجر مل جائے گا۔

مجھے یہ خدشہ رہتا ہے کہ میرے بھائی نے جائداد میں سے مجھے حصہ نہیں دیا یا مکان پر قبضہ کر لیا۔ اگر میں سوچ لوں کہ میرا بھائی جائداد کی وجہ سے میرے ساتھ تعلقات خراب کر رہا ہے تو بہتر ہے کہ میں جائداد قربان کر دوں اور تعلقات بچا لوں...... یہ کہتے ہوئے کہ بھائی میں جائداد میں سے اپنا حصہ رضا کارانہ طور پر اپنی خوشی سے آپ کے حق میں Surrender کر رہا ہوں۔ آپ میری طرف سے یہ بطور تحفہ قبول کر لیں......
چونکہ آپ کی نیت تعلق بچانے اور صلہ رحمی کی ہے اِس لیے اللہ کی نظر میں آپ کا یہ عمل بہت پسندیدہ ٹھہرے گا۔

سوال: جس طرح الیکٹرک میگنٹ ٹرین نے سفر کا دورانیہ کئی گنا کم کر دیا ہے۔ کیا اِس طرح موجودہ دور میں رُوحانیت کا سفر تیزی سے طے نہیں کیا جا سکتا؟

جواب: دیکھیے! الیکٹرک میگنٹ (Electric Magnet) ٹرین نے تین گھنٹے کا سفر ایک گھنٹے میں کر دیا ہے۔
عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مرید سے مراد تک کا سفر 35 سال میں طے ہوتا ہے جب کہ میں نے ابھی گزارش کی تھی کہ آپ اگر اِس راہ میں محنت کرتے ہیں تو یہ سفر ڈھائی سال میں طے کر لیں گے۔ میں نے تو الیکٹرک میگنٹ ٹرین سے کہیں Fast ہو کر یہ سفر 16 گنا کم کر دیا ہے۔

سوال: نیک کام کس نیت سے کیا جائے؟

جواب: اگر ہم نیک کام اجر کی نیت سے کریں تو اُس کا اجر ملتے ملتے زمانہ لگ جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے یہ سوچ

کر نیک کام کیا کہ میرا رب یہ پسند کرتا ہے...... وہ مجھے اُس کا ثواب دے یا نہ دے، یہ اُس کی صوابدید ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس صورت میں اجر بہت تیزی سے ملتا ہے اور ہتھیلی پر سرسوں جمنے لگتی ہے۔

ایک بار لوگوں نے دیکھا کہ حضرت رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہا ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے میں آگ لیے دوڑی چلی جارہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا "بی بی! کہاں کا قصد ہے؟" اُنھوں نے فرمایا کہ "میں اُس جنت کو آگ لگانے جارہی ہوں جس کے لالچ میں لوگ عبادت کرتے ہیں اور اُس جہنم کو بجھانے جارہی ہوں جس کے خوف سے لوگ رب کو یاد کرتے ہیں۔"

میں ہمیشہ یہ گزارش کرتا ہوں کہ عبادت کے چار درجوں میں سے اعلیٰ ترین درجے کی عبادت کریں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کسی کام کے لالچ میں عبادت کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ جنت کے لالچ یا جہنم کے خوف سے عبادت کرے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ یہ سوچ کر عبادت کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو لائق عبادت سمجھ کر اُس کی عبادت کی جائے، وہ رحیم و کریم ہے۔ یہ اُس کی عنایت ہے کہ اگر وہ جنت میں جگہ دے دے لیکن اگر وہ اُس عبادت کے صلے میں جہنم میں بھی ڈالتا ہے تو وہ مالک اور آقا ہے جو چاہے فیصلہ کرے...... مجھے اُس کا ہر فیصلہ ہنسی خوشی قبول ہے۔ یہ عبادت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے!

میں کہا کرتا ہوں کہ آپ خلق خدا کے ساتھ مہربان ہو جائیے...... رب تعالیٰ آپ پر مہربان ہو جائے گا کیونکہ اگر میں دوسروں کی غلطیوں، کوتاہیوں کو یہ سوچ کر درگزر کر دیتا ہوں کہ وہ میرے رب تعالیٰ کا بندہ ہے تو اِس کا اجر مجھے رب سے مل جائے گا۔ اگر مجھے اجر حاصل کرنے کا کوئی انتظار نہیں تو یقین کیجیے وہ اجر بڑی جلدی مل جاتا ہے۔

اگر آپ نے کوئی نیکی کی ہے تو اُس کے اجر اور انعام کی توقع مت کریں بلکہ دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرتے ہوئے صرف یہ سوچا کریں کہ یہ میرے رب کا بندہ ہے اور مجھے اپنے ہی جیسے دوسرے بندے کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا ہے...... اِس کا اجر پلک جھپکنے میں ملتا ہے اور یہ اجر ہزار گنا بڑھا کر رب عطا فرماتا ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص میری جائداد پر قبضہ کر لیتا ہے تو میں اُسے کیسے معاف کردوں؟

جواب: اللہ نے آپ کو دو Choices دی ہیں: ایک Choice یہ ہے کہ جس نے آپ کی جائداد پر قبضہ کیا ہے، آپ اُس سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے لڑیئے۔ اِس میں کوئی بُرائی نہیں...... لیکن اگر آپ نے یہ سوچ لیا کہ یہ میرا مسلمان بھائی ہے، اس سے انجانے میں میرے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے۔ (حالاں کہ اُس نے جان بوجھ کر آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن آپ اُسے Allowance دے رہے ہیں۔) اگر وہ میری کسی Material (مادی) چیز پر قبضہ کر کے راضی ہوگیا ہے تو کوئی بات نہیں جب آپ یہ سوچ لیں گے تو اللہ آپ کو آپ کی سوچ کا بے پناہ اجر عطا کرے گا۔ اب دونوں Choices آپ کے پاس ہیں، جو جی چاہے اختیار کرلیں۔

سوال: جب کوئی ہمارا قریبی عزیز ہماری جائداد پر قبضہ کرلے پھر دل تو دُکھتا ہے۔ ایسے میں ہم کیا کریں؟

جواب: مجھے یہ بتایئے کہ انسانی زندگی کیا صرف جائداد کے گرد گھومتی ہے۔ دیکھیے جائداد کے چھن جانے کا یقینی طور پر بہت دُکھ ہوتا ہوگا۔ میں چونکہ صاحب جائداد نہیں اِس لیے مجھے اِس کا ذائقہ اور چسکا بھی معلوم نہیں...... اِس لیے اِس کے مل جانے کی خوشی اور چھن جانے کی تکلیف کا بھی ادراک نہیں۔ البتہ مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جائداد کے چھن جانے سے زیادہ تکلیف تہمت لگنے کی ہوتی ہے۔ جب انسان پر کیچڑ اُچھال دیا جائے تو اُس کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔

بیس سال پرانی بات ہے...... میرے ایک جاننے والے کی ایک بڑی فیکٹری تھی۔ ایک صاحب نے اُن سے جان پہچان کی بنیاد پر ڈیلر شپ حاصل کرنے کے لیے سکیورٹی جمع کروائی تھی۔ بعد میں کاروباری اختلافات کی وجہ سے اُنھوں نے سکیورٹی واپس لینا چاہی تو وہ واپس نہیں مل رہی تھی۔ کسی طرح اُن صاحب کو یہ پتا چل گیا کہ وہ فیکٹری مالک (Owner) میرے جاننے والے ہیں سو میرے پاس آ کر کہنے لگے کہ آپ فیکٹری اونر سے سفارش کر دیں۔ (اب اُن صاحب نے مجھے 30 لاکھ سکیورٹی بتائی تھی لیکن دراصل اُن کی 60 لاکھ روپے کی رقم تھی) میں نے اپنے دوست سے کہا کہ انھیں تیس لاکھ روپے واپس کر دو۔ اُنھوں نے فوراً کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے وہ رقم واپس کر دی۔ بعد میں اُن صاحب کو پتا چلا کہ اُن کا کمیشن کا 30 لاکھ روپیہ مزید ہے...... لہٰذا وہ پھر میرے پاس چلے آئے کہ بقایا 30 لاکھ روپے بھی لے کر دیں۔ مجھے دوبارہ سفارش کرتے شرم آتی تھی لہٰذا میں نے کہا کہ آپ براہِ راست اپنے کاروباری معاملات طے کر لیجیے۔ مجھے اِن میں نہ گھسیٹیں لیکن وہ باز نہ آئے۔ ایک روز وہ صبح سویرے میرے پاس آ کر اِس بات پر اصرار کرنے لگے۔ تب میں نے کہا کہ فرض کریں ''اگر آپ کو بقایا 30 لاکھ مل جائیں اور راستے میں گر جائیں، کوئی چھین لے یا کسی اور طریقے سے ضائع ہو جائیں پھر آپ کیا کریں گے؟ یہاں تو اُمید ہے کہ آپ کی 30 لاکھ کی رقم آج نہیں تو کل مل ہی جائے گی۔'' میری بات سمجھے بغیر بولے ''کوئی بات نہیں شاہ صاحب! آپ وہ رقم ضائع ہونے دیں لیکن مجھے لے دیں۔'' میں نے اپنے دوست کو فون کر کے رقم لوٹانے کی سفارش کی۔ اُس نے رقم کا بندوبست کر دیا۔ چھ مہینے بعد وہ صاحب مجھے آ کر کہنے لگے ''شاہ صاحب آپ کی FIA میں کوئی جان پہچان ہے؟'' میرے استفسار پر بولے میں اُن 30 لاکھ سے ایک بزنس کرنا چاہتا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے Favour کرتے ہوئے تیس لاکھ کا Overdraft دے دیا۔ کاروبار میں پیسے ضائع ہو گئے اور اُس بینک منیجر پر 30 لاکھ کا Unauthorised اوورڈرافٹ دینے پر Audit objection لگ گیا ہے جس کی وجہ سے FIA کو رپورٹ ہو گئی ہے۔ اِس اوورڈرافٹ کی وجہ سے منیجر کے ساتھ ساتھ میں بھی پھنس گیا ہوں۔'' تب میں نے انھیں یاد دلایا کہ بابا! میں نے تم سے کیا کہا تھا کہ ضد مت کرو۔ اگر یہ پیسے تم سے ضائع ہو گئے تو کیا کرو گے۔ اب دیکھو کہ نہ صرف تمھارا اپنا 30 لاکھ ضائع ہو گیا بلکہ مزید 30 لاکھ روپے کے تم مقروض ہو گئے ہو۔ بعد ازاں

FIA کا لمبا چوڑا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اُس کے دوست ہی اُس کے کام آئے، رقم Arrange کر کے اُس کی جان چھڑائی۔ یہ اور بات کہ وہ پیسے آج تک اُن دوستوں کو واپس نہیں ملے۔ معاملات کو دیکھنے کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔

کسی شخص نے پوچھا کہ باپ اور مرشد میں کیا فرق ہے؟ میں نے عرض کی کہ باپ Biological father ہے......اس میں آپ کی Choice کا دخل نہیں لیکن مرشد By choice ہے۔ اگر آپ نے غلط مرشد چن لیا تو پھر آپ کو اُسے بھگتنا پڑے گا کیونکہ آپ نے اُسے اپنی Free will پر چنا تھا...... جب کہ باپ کے سلسلے میں آپ مجبور تھے۔ اسی طرح ہمارے پاس دوسروں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے Options موجود ہیں لیکن ہم اپنی علمی استعداد اور Vision کی بنیاد پر Options کا انتخاب کرتے ہیں مثلاً ہندو کبھی Immediate benefit (فوری فائدہ) کو ترجیح نہیں دے گا۔ وہ کل کے فائدہ کے لیے آج نقصان کر لے گا۔ مسلمان ہمیشہ Immediate benefit پر جائے گا جب کہ انگریز ہمیشہ دو سو سال بعد کا سوچے گا۔

سوال: اگر بُرائی یا زیادتی کرنے والا مسلمان بھائی ہے تو اُس کے لیے دُعا بھی تو کی جا سکتی ہے ”یا اللہ! میں نے اِسے معاف کر دیا۔ تو بھی اِس پر رحم فرما اور اِسے بُرائی سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔“

جواب: یہ دُعا کرنے کے لیے بھی انسان کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں دُعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! ڈاکٹر تنویر کو توفیق عطا فرما کہ وہ آئندہ بُرائی نہ کریں تو اس کے لیے میرا ڈاکٹر تنویر سے بہتر ہونا ضروری ہے...... کیونکہ جب تک میں آپ سے بہتر نہیں ہوں گا...... میں آپ کی بہتری کے لیے دُعا نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں میری Judgment کا عمل دخل ہے۔ میں رائے تو دے سکتا ہوں لیکن Judgment پاس نہیں کر سکتا Judgment پاس کرنے کے لیے مجھے آپ سے Superior ہونا چاہیے چونکہ آپ کے اچھے بُرے اور غلط صحیح کا judge میں نہیں بلکہ رب ہے یا پھر زمانہ ہے......اور زمانے کے بارے میں رب نے فرمایا ”مجھے ابن آدم اذیت دیتا ہے کہ زمانہ کو گالی دیتا ہے حالانکہ زمانہ تو میرے دست قدرت میں ہے میں دن رات کو بدلتا ہوں۔“ (صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب من انتظر حتی تدفن حدیث 4826 جلد 6، صفحہ 130)

مجھے تو یہ تک نہیں پتا کہ میں اللہ کی نظر میں اچھا ہوں یا بُرا...... تو میں کسی کو بُرا کیسے کہہ سکتا ہوں۔ بہتر ہے کہ ہم کسی کے بارے میں Judgment پاس نہ کریں ہاں البتہ ہم Opinion (رائے) دے سکتے ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں شاید اُس نے کام ٹھیک نہیں کیا۔ لیکن میں یہ Judgment (فیصلہ) نہیں دے سکتا کہ اُس نے یہ کام غلط کیا۔

اوکسفرڈ یونیورسٹی میں ایک پروفیسر صاحب نے شیکسپیئر پر لیکچر دینے کے بعد طلبا سے پوچھا ”کیا آپ شیکسپیئر کے Works کو سمجھ گئے۔“ ایک کے سوا سب طلبا نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس واحد سٹوڈنٹ سے

پروفیسر نے فکر مندی سے پوچھا کہ شیکسپیئر کے حوالے سے کیا بات تمھیں سمجھ نہیں آئی......؟ تب اُس نوجوان نے بہت خوب صورت جواب دیا "بلاشبہ آپ کا لیکچر بہترین تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شیکسپیئر کے Works کو سمجھنے کے لیے شیکسپیئر سے بڑا ہونا ضروری ہے......اور وہ میں ہوں نہیں"

میرے لیے میو ہسپتال کے ایک کارڈیو سرجن کے بارے میں گھر بیٹھے یہ رائے دینا بہت آسان ہے کہ وہ ایک اچھا کارڈیو سرجن نہیں لیکن یہ رائے دینے کے لیے میرا اُس سے اچھا کارڈیو سرجن ہونا بہت ضروری ہے تاکہ میں فیصلہ کر سکوں۔

سوال: کیا ولایت میں مقصود کشف و کرامات کا حصول اور مستجاب الدعوات ہونا ہے؟

جواب: سلوک یا رُوحانیت ایک سفر ہے جس کی منزل پر آپ ﷺ کے سوا کوئی نہیں پہنچ پایا۔ باقی سبھی اس راہ کے مسافر ہیں......کوئی دو میل تو کوئی سو میل دُور ہے۔ اِس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ ٹرین کے ذریعے لاہور سے راولپنڈی جائیں تو راستے میں مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے مختلف مناظر آپ کو دکھائی دیتے ہیں...... گوجرانوالہ میں کھانے پینے کی بہت اچھی چیزیں ملتی ہیں......وزیر آباد میں سٹین لیس سٹیل کے برتن دستیاب ہیں۔ اگر آپ اپنی منزل اور ٹائم شیڈول کے بارے میں محتاط نہیں تو عین ممکن ہے کہ آپ راستے میں گوجرانوالہ لنچ (Lunch) کے لیے ٹھہر جائیں......وزیر آباد پہنچیں تو سٹین لیس سٹیل کی پراڈکٹس خریدنے میں مشغول ہو جائیں......جہلم پہنچ کر آپ کو دریا کنارے بنی مسجد اِس قدر بھا جائے کہ آپ وہیں بیٹھ جائیں......یوں آپ کی منزل آپ سے دُور ہوتی چلی جائے گی۔

رُوحانیت یا سلوک کی راہ پر جب انسان سفر کرتا ہے تو بہت Earlier stage پر اپنی رُوح کی لطافت کی وجہ سے وہ غیر مرئی مخلوق دیکھنے اور اُس سے گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اگر آپ کا گائیڈ، ڈائریکٹر یا سپروائزر زیادہ Proficient نہیں ہے تو آپ اُسی مقام کو ولایت کی اِنتہا سمجھ کر وہیں بیٹھ رہتے ہیں حالاں کہ وہ ولایت کی انتہا نہیں ہوتی۔ اُس سے اگلے مختلف مقامات کے بعد کشف و کرامات حاصل ہوتی ہیں تو کچھ لوگ اُنہی میں کھو جاتے ہیں اور خود کو غوث، قطب یا ابدال سمجھنے لگتے ہیں۔ آج کل لوگوں نے ایک معیار گھڑ لیا ہے کہ ہر صاحبِ کشف و کرامات اور مستجاب الدعوات شخص ولی اللہ ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ وہ ولی اللہ کیسے ہے......؟ کیونکہ کشف تو کتے، بلیوں اور پرندوں کو بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی آنے والی مصیبت کا ادراک پہلے سے کر لیتے ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنی مختلف حرکات سے کرتے ہیں۔

آپ مندر یا گرجا میں کھڑے ہو کر بھی رب کو پکاریں اور اُس سے دُعا کریں۔ وہ آپ کی دُعا قبول کر لے گا۔ کیا اللہ کسی پنڈت، سادھو یا پادری کی دُعا نہیں سنتا؟ اللہ تو سب کی سنتا ہے۔ اِس لحاظ سے تو وہ پنڈت، سادھو اور پادری بھی ولی اللہ ہونے چاہییں......!!!

لہٰذا یاد رکھیے کہ صاحبِ کشف و کرامات یا مستجاب الدعوات ہونا ولایت کی نشانی نہیں ہے۔

یہاں اِس محفل میں بھی دو تین ایسے آدمی اِس وقت موجود ہیں جو واقعتاً دو ڈھائی سال کے عرصے میں کشف و کرامات کے مقام پر پہنچے لیکن اُسے سنبھال نہ پائے اور ضائع کر دیا۔

یاد رہے کہ اِس راہ میں مقصود کشف و کرامات نہیں بلکہ رب کی دوستی اور اُس کے قرب کا حصول ہوتا ہے۔

انسان ساری عمر اِس راہ میں مختلف منازل طے کرتا رہتا ہے لیکن آخری منزل تک کبھی نہیں پہنچ پاتا...... وہاں صرف ایک ہی ہستی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہنچے ہیں۔

میں ناہیں سب توں

سوال: رب تعالیٰ سے قریب ہونے کا نسخہ بتا دیجیے۔

جواب: اگر راہِ سلوک کے بنیادی پروٹوکولز (Protocols) کو Observe کیا جائے اور اللہ کے بتائے ہوئے Dos اور Don'ts کے مطابق زندگی گزاری جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اللہ کا قرب حاصل نہ کر پائیں۔

ان Prerequisites اور Protocols کے بعد ہمیں دو بنیادی شرائط کی پابندی کرنا ہوتی ہے: ایک تو یہ کہ ہم اپنے آرام، خواہشات، ضروریات اور حقوق کو پس پشت ڈال کر دوسروں کے آرام، خواہشات، ضروریات اور حقوق کو مقدم سمجھیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص خواہ ہمیں کتنا ہی بُرا کیوں نہ سمجھے، ہمارے خلاف کتنا ہی پراپیگنڈا کیوں نہ کرے، ہماری جڑیں ہی کیوں نہ کاٹے ہم اپنے اُس مسلمان بھائی کے خلاف اپنے دل میں کسی قسم کا کوئی میل نہ آنے دیں اور بدستور پورے خلوص سے اُس سے ملتے رہیں۔

یہ باتیں Out of the blue نہیں بلکہ اِن میں سے پہلی شرط یہ حدیث ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ پاک بندہ کی مدد پر رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الذکر والد عاوالتوبۃ، حدیث 7028، صفحہ 71 جلد 8)

دوسری شرط کی بنیاد وہ حدیث ہے جس کا مفہوم ہے کہ بُرائی کے جواب میں اگر نیکی کی جائے تو دوسروں کا دل جیتا جا سکتا ہے۔''

اگر ہم اِن باتوں پر عمل کر لیں تو شروع میں اگرچہ کچھ دشواریاں پیش آئیں گی لیکن پھر زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔

آج ایک گزارش اور کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے گھر میں اگر ملک کا وزیراعظم یا صدر آئے تو اُس کے آنے سے پہلے ہم اپنے گھر کو سجاتے سنوارتے ہیں، اُس کے رنگ روغن اور صفائی ستھرائی پر توجہ دیتے ہیں۔ رب تعالیٰ ہمارے دل میں رہتا ہے۔ جہاں بادشاہوں کا بادشاہ، شہنشاہوں کا شہنشاہ اور مالک الملک رہتا ہے اُس جگہ کو تو بدرجہا صاف ستھرا ہونا چاہیے۔

جب تک ہمارا دل کینہ، بغض اور حسد سے صاف نہیں ہوگا وہاں رب تعالیٰ نہیں رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ رب تعالیٰ ہمارے دل میں بس جائے تو پھر ہمیں اِن تمام آلائشوں سے جان چھڑانا ہوگی اور ان آلائشوں سے بچنے کے لیے ہمیں ہر لحہ Conscious effort (شعوری کوشش) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں ہر لحہ محتاط رہنا ہوگا تاکہ شیطان ہمیں کسی بھی رنگ میں بہکا نہ سکے۔ شیطان کے بہکانے کے نت نئے ڈھنگ ہوتے ہیں......

پیرانِ پیر حضرت غوث الاعظم کا قصہ بہت مشہور ہے۔ غوثوں کے غوث کو بھی شیطان نے نہیں بخشا اور آخری عمر تک اُنھیں بہکانے کی کوشش میں لگا رہا۔ ایک بار فرشتے کے روپ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آکر کہنے لگا ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی عبادات، مجاہدوں اور ریاضتوں سے خوش ہو کر آپ کو نماز بخش دی ہے۔'' پیرانِ پیر اُس کی اِس بات پر خوش ہونے ہی لگے تھے کہ فوراً خیال آیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے لہٰذا فوراً لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر شیطان سے کہا کہ ''مردود، دُور ہو جا! نماز تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معاف نہیں ہوئی تو پھر مجھے کیسے ہو سکتی ہے......!'' تب شیطان ہنسا اور بولا ''شکر کریں آپ کو آپ کے علم نے بچا لیا ہے......'' آپ نے دوبارہ لاحول پڑھی اور کہا ''مجھے میرے علم نے نہیں بلکہ میرے رب تعالیٰ نے بچایا ہے۔'' یوں شیطان ایک کے بعد دوسرا وار کرنے سے باز نہیں آتا۔ ایسے موقع پر انسان لاحول پڑھ لے۔

ہمارے ہاں ایک تاثر قائم ہو گیا ہے کہ ہر وقت تسبیح پھیری جائے اور وظائف پڑھے جائیں تو انسان رب تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے! عبادات سے پارسائی ملتی ہے اور نیکی سے رب ملتا ہے۔ عبادت کے ذریعے ہم پارسا تو ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں اِس طرح اللہ کا قرب اور دوستی نہیں ملے گی۔ عبادات کو ہم نیکی تک پہنچنے کا زینہ تو سمجھیں لیکن منزل نہ سمجھیں۔ منزل نیکی ہے اور نیکی کے جواب میں رب تعالیٰ ملتا ہے۔

انسان کو نیک ہونے پر زور دینا چاہیے۔ میرے نزدیک نیکی کی مختصر ترین تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے حقوق اور Priviliges پر دوسروں کے حقوق اور Priviliges کو ترجیح دے۔ شیطان آپ کو ہر حال میں نیکی سے روکے گا...... اِس کو دُور رکھنے کے لیے آپ کو in a big way (بھرپور انداز میں) Conscious effort کرنا ہوگی۔ Half-hearted effort سے شیطان دور نہیں ہوتا۔

ہمارے معاشرے میں ایک عادت ہماری زندگی کا حصہ بن کر داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک بہت ہی ناپسندیدہ عادت ہے۔ لیکن ہم اب اِسے بُرائی ہی نہیں سمجھتے۔ یہ ہماری فطرتِ ثانیہ نہیں تو عادتِ ثانیہ ضرور بن چکی ہے۔ ہم ازراہِ تفنن یا ازراہِ مذاق دوسروں کے بارے میں ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو اُن کے سامنے شاید ہم بیان نہ کر سکیں حالاں کہ اِس کی بہت سخت مذمت موجود ہے کہ غیبت کرنے والا ایسا ہے کہ گویا اُس نے اپنے مردار بھائی کا گوشت کھایا ہو۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''اور تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ تم اُسے ناپسند کرتے ہو۔''

غیبت سے دُور رہیے۔ اور زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکالیے جس سے کسی کا عیب بیان ہوتا ہو، کسی کی عزت پر حرف آتا ہو، کسی کی بُرائی ظاہر ہوتی ہو، کسی کی توہین ہوتی ہو یا کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اگر آپ نے یہ احتیاط کر لی اور دوسروں کے لیے ایثار و قربانی سے کام لیا تو یقین جانیے کہ آپ کو بہت جلد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے گا...... اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے بتائے Dos اور Don'ts پر عمل بنیادی شرط ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم غیر اللہ کو چھوڑ کر اپنا تمام تر تعلق اللہ کے ساتھ جوڑ لیں اور ماسوائے رب تعالیٰ کے کسی سے کوئی اُمید، غرض یا آس وابستہ نہ کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اللہ کی عطا کردہ جسمانی قوت اور عقل و فہم کو بروئے کار لا کر ہر معاملے میں بھرپور کوشش اور محنت کریں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہماری عملی کوشش کا جو بھی نتیجہ برآمد ہو...... چاہے وہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہو یا اُن کے برعکس...... اُسے اِس ایمان کے ساتھ بہت کھلے دل سے قبول کر لیں کہ چونکہ یہ میرے رب تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے اِس لیے میرے لیے بہترین ہے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ ہماری تدابیر اور ارادے اگر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پائیں تو ہم اِس پر بھی سجدۂ شکر بجالائیں کہ رب تعالیٰ نے ہمیں کسی بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے کیونکہ رب میری ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے میری خواہش پوری کر کے جتنی خوشی اُسے ہوگی، کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔ اگر میری یہ خواہش، تدبیر اور ارادہ پورا نہیں ہوا تو اِس میں یقیناً میری بہتری پوشیدہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادے اور تدبیر کے بُرے انجام اور نقصان سے ہمیں بچا لیا اِس لیے ہم بجائے اِدھر اُدھر دوڑنے کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ اِس سے ہمارے اندر اللہ پر توکل اور اعتماد پیدا ہوگا۔

توکل اور اعتماد درحقیقت محبت کا پہلا زینہ ہے۔ توکل اور اعتماد رفتہ رفتہ رب تعالیٰ کے ساتھ محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں انسان نہ تو کوئی سوال پوچھتا ہے اور نہ قربانی کرتے ہوئے اُسے کوئی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

فرض کریں چھٹی کے وقت جب ہم تھکن سے چور ہوتے ہیں...... اُس وقت اگر ہمارا باس ہمیں بلا کر کوئی کام سرانجام دینے کو کہے تو ہم تھکن کی وجہ سے کام سے جان چھڑانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیں گے۔ حالاں کہ یہ وہ آفس ہے جہاں کام کرنے کے عوض ہمیں تنخواہ ملتی ہے اور یہ وہ باس ہے جس نے ہماری Annual confidential report لکھنی ہے اور ہماری ترقی کی Recommendations دینا ہیں۔ یوں جس جگہ سے ہمیں دُنیاوی مفاد حاصل ہوتا ہے وہاں ہم ایسی Hesitation کا اظہار کرتے ہیں۔

جب ہم رب تعالیٰ کا حکم ڈر اور خوف کے بجائے محبت سے مانیں گے تو یہ عمل ہمارے لیے باعث

راحت ہوگا۔ محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہم بہت Diligently اور Faithfully اُس کی ہر بات کی تعمیل کریں گے۔

ہم آفس سے گھر آئے ہیں، دروازے پر بیٹا ضد کرتا ہے کہ مجھے چیونگم دلا کر لائیں۔ ہم اپنی تھکن کی پرواہ کیے بغیر اُسے گود میں اُٹھاتے ہیں اور کارنر شاپ سے اُسے چیونگم کے علاوہ بھی دو تین چیزیں دلاتے ہیں۔ اُسے دھوپ سے بچانے کے لیے اپنا رومال اپنے سر کی بجائے اُس کے سر پر رکھتے ہیں۔ اور اِس تمام عمل میں بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔

وجہ کیا ہے؟ باس کے ساتھ رشتے میں خوف ہے جب کہ بیٹے کے ساتھ پیار کا رشتہ ہے اِس لیے باوجود تھکن کے بیٹے کی ضد اور خواہش مان کر بھی خوشی محسوس کریں گے۔

رب تعالیٰ کے احکامات کی خوف کے بجائے پیار سے تعمیل زیادہ افضل ہے کیونکہ اِسی صورت میں انسان تمام تر، باریکیوں اور خلوص کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

اگر ہم تمام اُمیدیں رب تعالیٰ سے وابستہ کر لیں گے تو اِس سے اللہ تعالیٰ پر توکل پیدا ہوگا۔ یہ توکل اعتماد کو فروغ دے گا اور یہ اعتماد بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت تک لے جائے گا۔

ایک زمانہ میں جب میں مرشد صاحب کے پاس بیٹھا کرتا تھا تو تب ابتدا میں مجھے رُوحانیت کے Protocols کا کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ مغربی تعلیم اور اچھی جاب کے نشے نے دماغ کو بہت Logical کر دیا تھا۔ ہم ہر بات کو اپنے محدود اور مختصر علم کی کسوٹی پر Logically پرکھا کرتے تھے۔

ایک روز کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اچانک قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ جوش میں آکر فرمانے لگے:

> "میاں! اِن منتوں کا کیا ہے...... یہ تو میلے کپڑوں کے ڈھیر سے بھی پوری ہو جاتی ہیں...... ابھی کوئی دُعا مانگ لو۔ دیکھنا! رب تعالیٰ ابھی پوری کر دے گا۔ تم یہ وظیفے کیوں پڑھو، صرف ہمارا نام ہی جپے جاؤ، وہی بہت ہے...... اور پھر تم ہمارا نام بھی کیوں جپو...... ! صرف ہم سے محبت ہی کرتے رہو تو منزل کو پہنچ جاؤ گے۔"

چونکہ اُس وقت مغربی تعلیم کا اثر ہونے کی وجہ سے ذہن بڑا Logicall تھا اِس لیے دل میں سوچا کہ بڑے شاہ صاحب یہ کیا شرک بول رہے ہیں...... کہاں وظائف کا پڑھنا اور کہاں غیر اللہ سے پیار کرنا...... ! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی...... اُٹھ کر گھر چلا آیا۔ عشاء کی نماز کے بعد حسبِ معمول تسبیح کر رہا تھا کہ ذہن یک لخت شاہ صاحب کی بات کی طرف چلا گیا کہ غیر اللہ کی محبت وظائف کا Substitute (متبادل) کیسے ہو سکتی ہے۔ بہت غور و فکر کیا لیکن بات سمجھ میں نہ آئی۔ پھر بڑے شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اِس کے بھی کوئی ایک ڈیڑھ سال بعد جناب سرکار علاؤ الدین علی احمد صابر صاحب اور اُن کے خلیفہ شمس الدین ترک پانی پتی صاحب کا ایک قصہ پڑھا تو معاملہ ایک دم سے کھل گیا اور یہ نکتہ سمجھ میں آ گیا کہ درحقیقت جب انسان کسی سے پیار کرتا

ہے تو لاشعوری طور پر اُس کی ساری عادات سے بھی پیار کرتا ہے اور اِس پیار کی وجہ سے اُن عادات کو غیر شعوری طور پر اپنانے لگتا ہے۔ یوں وہ اُس کے معمولات اور اخلاق سب کچھ اپنا لیتا ہے۔ اِس لیے جب آپ نے مرشد سے پیار کے نتیجے میں اس کو Copy (نقل) کیا تو Indirectly (بالواسطہ) آپ نے اللہ تعالیٰ کے Dos اور Don'ts کو Follow کرنا شروع کر دیا۔ جب امر ونہی کی پیروی کر لی تو آپ رب تک جا پہنچے...... یہ وہ نکتہ تھا جو بڑے شاہ صاحب نے چند مختصر جملوں میں کہا تھا جسے میں اُس وقت سمجھ نہ سکا۔

رب تعالیٰ کے ساتھ پیار پالنے کا ایک Benefit (فائدہ) یہ ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کے ہر فرمان کی پیروی کرتے ہوئے انسان خوشی محسوس کرتا ہے کہ میں نے ایک اور فرمان کی تعمیل کر لی۔ یوں انسان ایک ایک کر کے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات کی پیروی کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ رب تعالیٰ کو عزیز ہو جاتا ہے۔

سوال: آپ نے بڑے شاہ صاحب کی جو بات Quote کی ہے، کیا وہ ''محبت شیخ'' کے زمرے میں آتی ہے؟

جواب: بالکل! یہ محبت شیخ ہی ہے۔ کیونکہ جب تک آپ شیخ سے محبت نہیں کرتے، آپ اُس کی کہی ہوئی باتوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ شیخ کی باتوں پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری vocabulary سے پانچ ''ک'' کب، کیوں، کیسے، کیا اور کہاں نکل جائیں...... پھر ہم آنکھیں بند کر کے اپنے شیخ کے حکم پر عمل کریں گے کیونکہ جب انسان خوف کے تحت کسی حکم پر عمل کرتا ہے تو اُس میں Hesitation (ہچکچاہٹ) رہتی ہے اور کہیں نہ کہیں انسان اپنا ذہن Apply کر لیتا ہے۔ لیکن جب خوف کی جگہ محبت لے لیتی ہے تو پھر انسان بلا ہچکچاہٹ خوشی سے اُس کی ہر بات کو Follow کرتا ہے۔

اِس ضمن میں مجھے ایک سچا واقعہ یاد آ گیا۔ جب ایک مرید کو اپنے شیخ کے زیر تعلیم و تربیت 30,32 سال کا عرصہ ہو گیا تو ایک روز شیخ نے اپنے اُس مرید سے کہا ''کل میں تمھیں عصر کی نماز کے بعد اپنی تلوار عطا کروں گا۔'' ہر شخص نے اُس مرید کو اتنے بڑے اعزاز پر بہت مبارک باد دی۔ اگلے روز عصر کے وقت شیخ نے مرید کو حکم دیا کہ تمھاری کمر پر جو تلوار بندھی ہے اس کو اُتار کر زمین پر ڈال دو، اِس کی جگہ میں اپنی تلوار باندھ دیتا ہوں۔ اُس مرید نے اپنی تلوار اُتاری اور قریب کھڑی اپنی Wife کو پکڑا دی۔ تب مرشد نے Suddenly اپنی تلوار کھول کر دوبارہ اپنی ہی کمر پر باندھ لی اور فرمایا ''تم ابھی اِس قابل نہیں ہوئے کہ میں تمھیں اپنی تلوار سونپوں، تمھیں ابھی مزید ریاضت کی ضرورت ہے۔''

اب اِس واقعہ میں مرید نے شیخ کا حکم ماننے میں اپنا ذہن Apply کیا اور تلوار حکم کے مطابق زمین پر ڈالنے کے بجائے Wife کو پکڑا دی۔ مرید کو اپنا ذہن Apply نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انسان جب تک شیخ کی باتوں کو اِس طرح تسلیم نہ کرے کہ اُس میں کہیں اپنا ذہن Apply نہ کرے تب ہی وہ کچھ سیکھ پائے گا۔ راہِ سلوک میں محبتِ شیخ پر اِس لیے زور دیا جاتا ہے۔

سوال: Logic اور عشق کا کیا تعلق ہے؟

جواب: Logic اور عشق میں وہی تعلق ہے جو آگ اور پانی میں ہے کہ جہاں آگ ہے وہاں پانی نہیں ہو سکتا..... اور جہاں پانی ہے وہاں آگ نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب تک Logic انسان کے اندر رہتی ہے وہ Ryhme and reason کے چکر میں پڑا رہتا ہے اور جب وہ Logic سے نکل کر عشق میں داخل ہوتا ہے تو وہ اُن تمام چیزوں سے بالاتر ہو جاتا ہے..... تب وہ نتائج سے بے نیاز ہو کر عمل کرتا ہے۔

سوال: کیا غیبت کی کوئی Exceptions (مستثنیات) ہیں؟

جواب: غیبت صرف ایک صورت میں غیبت نہیں ہوگی کہ جب لوگوں کو اجتماعی طور پر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو..... اور آپ کے واضح کر دینے کے بعد لوگ نقصان سے بچ جائیں اور اُنھیں فائدہ ہو جائے۔ مثلاً کسی معاملے میں گواہی دینا آپ پر فرض ہے۔ اگر آپ نے کسی کو چوری کرتے دیکھا ہے اور مجسٹریٹ آپ کو گواہی کے لیے بلاتا ہے تو پھر اُس کو چھپانا گناہ ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اگر آپ Exceptions کے چکر میں پڑ جائیں گے تو پھر ہر لمحہ شیطان آپ کو اُکساتا ہی چلا جائے گا کہ یہ اجتماعی مفاد کا معاملہ ہے، اِس لیے فلاں شخص کی بُرائیاں بیان کر دو۔

سوال: کیا اولیاء اللہ چُنے ہوئے (Selected) لوگ ہوتے ہیں؟

جواب: ایک عطا ہے اور دوسرا کسب۔ جو چیز عطا سے آئے گی وہ چند ایک لوگوں کو ملے گی اور ایسے ہی لوگ پیدائشی ولی اللہ ہوتے ہیں..... یا پھر بعد میں اللہ تعالیٰ خوش ہو کر اُن پر یہ رحمت فرما دیتا ہے ورنہ عموماً ولی اللہ کا مقام ''کسب'' سے حاصل ہوتا ہے..... یہ کمانا پڑتا ہے۔

سوال: کسی تبلیغی جماعت یا Institution کو جوائن کرنے کی صورت میں انسان چوبیس گھنٹے اللہ کے حکم کی پیروی کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ یہ عمل اُس کی Second nature بن جاتا ہے۔ زبوں حالی کے موجودہ دور میں مسلمان اللہ سے کٹ گئے ہیں..... کیا ایسے حالات میں ایک مرشد اپنے مرید کی زندگی میں چوبیس گھنٹے کا یہ Change لا سکتا ہے؟

جواب: اچھی بات خواہ کسی Institution سے مل رہی ہو یا کسی فرد سے، اُسے حاصل کر لینا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُن کا اللہ کے ساتھ وہ رشتہ نہیں رہا جو ہونا چاہیے تھا..... اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ہم اللہ کے قریب ہونا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم نیکی کی طرف جائیں ..... اسی لیے میں نے عبادت اور نیکی کا فرق بیان کیا کہ عبادات سے صرف پارسائی آتی ہے جب کہ نیکی سے رب ملتا ہے..... اور نیکی یہ ہے کہ ہم دوسروں کے حقوق اور Privileges کو اپنے حقوق پر مقدم رکھیں..... دوسرے لفظوں میں ہم حقوق العباد پر توجہ دیں اور اپنی اُس زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں جس کا تعلق دوسروں سے ہے۔ جب ہم اُس زندگی یا حقوق العباد کے سلسلے میں ایثار و قربانی سے کام لینے لگتے ہیں تو رب تعالیٰ کی نظر میں نیک ٹھہرتے ہیں اور وہ ہمیں اپنے سایۂ رحمت میں لے لیتا ہے۔

بیعت کی صورت میں مرشد کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ بیعت یک طرفہ سودا نہیں کہ مرید نے تو خود کو مرشد کے حکم کا پابند کر لیا لیکن مرشد نے اپنا تعلیم و تربیت کا فرض ادا نہ کیا۔ مرشد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر حال میں مرید کو Guidance (راہنمائی) مہیا کرے (جو عموماً نہیں ہو پاتی......)

اسلام کو اگر ہم By parts دیکھیں گے تو یہ کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا اور نہ ہی اس پر By parts عمل کر کے وہ نتائج حاصل کیے جا سکیں گے جو رب تعالیٰ چاہتا ہے۔ اسلام کو ہمیں In total اپنانا پڑتا ہے اِس کے انفرادی و اجتماعی پہلو، عبادات، معاملات اور Penal code کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کو ڈھالنا پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں Selective minded ہو گئے ہیں اور ہمارا رویہ اسلام کے بارے میں وہی ہو گیا ہے جو چند اندھوں کے ہاتھ ہاتھی آ گیا تھا تو اُن میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے جس حصے کو Touch کیا تھا اُسی کے مطابق اُسے Describe (بیان) کیا...... یا ہمارا رویہ اسلام کے بارے میں یہ ہے کہ ہم اِس کا کوئی حصہ پکڑ کر شدت سے اُس پر عمل کرنے لگتے ہیں اور باقی سب احکامات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اپنا ایسا رویہ ترک کر کے پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں اور اس کے ہر پہلو پر عمل شروع کر دیں۔

علم الغیب اور صاحبان علم

اس بار مذاکرہ کا موضوع تھا "علم الغیب"......

ولایت تین چیزوں پر محیط ہے: علم لدنی، دُعا اور کشف و کرامات...... بدقسمتی سے ہمارے ہاں ولی اللہ کو ان تینوں چیزوں کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ولی اللہ کا استعمال یہ ہے کہ اُسے دُعا کی مشین بنا لیا جائے...... جہاں وہ ملے اُس سے دُعا کروالی جائے۔ جس ولی اللہ کو جتنی زیادہ کشف و کرامات حاصل ہیں، اُسے ہم اُتنا ہی بڑا ولی اللہ سمجھتے ہیں اور اُس کی علمی حیثیت کو ہم عموماً ایک کونے میں ڈال دیتے ہیں۔ انسانی نفسیات کے دو حصے ہیں: ایک جسم اور دوسرا رُوح۔ جسم حواسِ خمسہ کے ذریعے روشنی لیتا ہے (روشنی سے مراد Enlightenment) ہے۔ کسی بھی چیز کو ہم حواسِ خمسہ کے ذریعے جانتے ہیں۔

علم لدنی، جس میں علم غیب بھی شامل ہے، ایک ایسا علم ہے جس میں تمام علوم پوشیدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اولیائے کرام سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہر موضوع پر ایسی روانی اور مہارت سے بات کرتے ہیں کہ جیسے یہی اُن کی Field ہو مثلاً جب وہ مکینیکل انجینئرنگ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ جیسے وہ By training مکینیکل انجینئر ہوں۔ اگر وہ ایرونائیکل انجینئرنگ پر گفتگو کرنے لگیں تو لگتا ہے کہ جیسے وہ ایرونائیکل انجینئر ہوں......

بڑے شاہ صاحب کے زمانے میں میرے پاس 74 ماڈل کی مرسیڈیز ہوتی تھی...... چونکہ پرانی ہوگئی تھی اس لیے اُس کے ایئر کنڈیشنر کے Blower نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شاہنواز والوں نے کہا کہ ہم سے تو آپ کو بہت مہنگا ملے گا لیکن پشاور سے آپ کو مناسب قیمت پر دستیاب ہوگا کیونکہ وہاں کابل سے گاڑیاں آتی ہیں اور سنہری مسجد کے نیچے ایک ڈیلر اُن گاڑیوں کو توڑ کر By parts بیچ دیتا ہے۔ پشاور میں اپنے ایک دورے کے دوران جب میں اُس ڈیلر کے پاس گیا تو اُس نے گاڑی دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو نئے Blower کی ضرورت نہیں...... بس اس کی جو پلیٹ ٹوٹ جاتی ہے، آپ وہ لے جائیں۔ اُس نے مجھے محض پچاس روپے کی وہ پلیٹ دے دی۔ یہ پلیٹ 5 انچ لمبی اور 3 انچ چوڑی تھی اور آگے سے اُس کا ایک کارنر Cut کیا ہوا تھا۔ اُس نے اُس پلیٹ میں لگانے کے لیے مجھے ایک سوئچ بھی دیا۔

میں اور بڑے شاہ صاحب پشاور سے لاہور واپس آرہے تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے مجھے یک دم خیال

آیا کہ یہ پلیٹ فِٹ کیسے ہوگی۔ لگتا ہے اُس ڈیلر نے مجھے چکر دے دیا ہے۔ چونکہ میں گورنمنٹ جاب کے دوران انجینئرنگ یونٹ چلاتا رہا تھا...... جہاں سوفٹ انجینئرنگ مشینیں تیار ہوتی تھیں اِس لیے مجھے انجینئرنگ کی کچھ نہ کچھ سدھ بدھ تو تھی۔ اِس لیے ڈیش بورڈ سے وہ پلیٹ اُٹھا کر میں نے اُسے جانچا کہ یہ فِٹ کیسے ہو گی۔ تب بڑے شاہ نے ہاتھ بڑھا کر وہ پلیٹ پکڑ کر کہا ''وہ آدمی صحیح کہہ رہا تھا، چکر تو تم اپنے آپ کو دے رہے ہو۔'' پھر مجھے سمجھا کر کہنے لگے ''اِس پلیٹ میں اِس جگہ Screw لگیں گے اور یوں یہ فِٹ ہو جائے گی۔'' میں Convince تو نہیں ہوا لیکن چونکہ مرشد صاحب کا کہنا تھا اِس لیے مزید کوئی لفظ بولنا خلافِ ادب تھا۔

جب میں شاہنواز کے پاس گیا تو اُسے کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ یہ پلیٹ غلط آ گئی ہے۔ دیکھو! یہ کسی طرح فٹ ہو سکتی ہے؟ اُس نے پلیٹ دیکھ کر کہا نہیں! یہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ چائے پئیں، ابھی دو منٹ میں یہ کام ہو جائے گا۔'' میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس نے پلیٹ بالکل اُسی انداز میں فٹ کی تھی جس انداز میں بڑے شاہ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔

اِس سے پہلے کا واقعہ ہے کہ امریکہ نے ایک خلائی شٹل بھیجی جس میں کوئی Fault پیدا ہو گیا...... جس روز یہ واقعہ اخبارات میں آیا، اُس سے کوئی دو روز قبل ہم شاہ صاحب کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ اچانک بولے ''دیکھو! امریکہ نے جو Space shuttle بھیجی ہے، اُس میں Fault پیدا ہو جائے گا...... یہ فالٹ اگرچہ معمولی نوعیت کا ہوگا لیکن ماہرین سے یہ دُور نہیں ہو پائے گا۔'' بڑے شاہ صاحب کی یہ بات سن کر مغربی تعلیم کے زیرِ اثر میں نے دل میں کہا ''یہ کیا کہہ رہے ہیں شاہ صاحب! کہاں ناسا کی Technical expertise اور کہاں یہ فقیر آدمی......'' چند لمحوں بعد بڑے شاہ صاحب کہنے لگے ''لاؤ ذرا کاغذ پنسل مجھے دو!'' اُنھوں نے کاغذ پر شٹل کا Rough sketch بنایا...... پھر ایک جگہ نشان دہی کر کے کہنے لگے ''اِس جگہ پر Fault آئے گا لیکن ماہرین سے دُور نہیں ہو پائے گا۔''

اگلے چند دنوں میں اخبار میں خبر آ گئی کہ خلائی شٹل میں نقص آ گیا ہے لیکن ناسا Confident ہے کہ وہ گراؤنڈ اسٹیشن سے اِس فالٹ کو Remove کر لے گی۔ تب ہمیں دھچکا لگا کہ بڑے شاہ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ یہ فالٹ دُور نہیں ہو پائے گا جب کہ ناسا کے مطابق تو یہ گراؤنڈ اسٹیشن سے ہی دُور کر لیا جائے گا...... بعد ازاں یہ معاملہ اخبار میں آتا رہا حتیٰ کہ Finally پتا چلا کہ ناسا Defect کو Remove کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اِس خبر کے بعد ہنگامہ شروع ہو گیا کہ شٹل زمین پر گر کر تباہی لائے گی...... اُنھی دنوں ایک بار پھر بڑے شاہ صاحب نے فرمایا ''یہ بے وقوف ہیں...... اِنھیں معلوم نہیں کہ اِس کے تین حصے سمندر اور ایک حصہ ویرانے میں گرے گا اور ایک آدمی بھی اِس میں زخمی نہیں ہوگا۔''

واقعی بعد میں جب یہ خلائی شٹل تباہ ہوئی تو اُس کے تین حصے سمندر اور ایک حصہ ویران زمین پر گرا۔

یہ علم لدنی ہے جس کے تحت تمام علوم آ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں علم ہندسہ و نجوم پر بھی بہت بحث ہوتی ہے۔ بطور سائنسز اِن علوم کا وجود ہے لیکن یہ علوم کس حد تک درست اور مکمل ہیں یہ Debatable بات ہے۔

اِن کی Accuracy بھی Man to man (ہر فرد کے لحاظ سے) Vary کر جائے گی...... کیونکہ ان میں ذہن کا بہت عمل دخل ہے۔ کوئی آسٹرالوجسٹ جب ستاروں کا حساب لگا کر اُن کو Zodiac signs میں Place کرتا ہے، اُن کی ڈگری کو Calculate کرتا ہے تو اس میں انسانی ذہن Involve ہوتا ہے...... جہاں بھی انسانی دماغ اور Guess work ملوث ہوگا، وہاں غلطی کا امکان ضرور ہوگا۔

علاوہ ازیں آسٹرلوجسٹس جو اثرات Work out کرتے ہیں اُس میں بھی غلطی کا احتمال ہوتا ہے...... علم ہندسہ میں بھی انسانی دماغ استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے اُس میں بھی غلطی کا امکان رہتا ہے...... کوئی شخص اپنی Calculations میں کتنا Accurate ہے اس کا تعلق اُس کی Articulacy (گرہ بندی) سے ہے۔ اِس لیے رب تعالیٰ نے اِن چیزوں کے قریب جانے سے منع کیا ہے۔ جادو کا بھی وجود ہے لیکن اِس میں بھی انسانی دماغ کی Limitations (حدود)، مجبوریاں اور ذہنی استعداد آ جاتی ہے...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگ جادو فطرت (Nature) کے فیصلوں کو تبدیل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی قوت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا...... رب تعالیٰ اِن تمام قوتوں سے زیادہ طاقت ور ہے...... لہٰذا آپ جادو کو بطور سائنس جانیے۔ اِس پر یقین بھی کر لیں کہ اِس کا دُنیا میں وجود ہے لیکن اِس سے خوف زدہ مت ہوں کیونکہ بہرحال یہ ہمارے رب تعالیٰ کے ماتحت ہے، اُس کے حکم کا پابند ہے۔ قرآن پاک کی وہ آیات ہمیشہ ذہن میں رکھیے جن کا مفہوم ہے کہ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر اللہ نہ چاہے اور کوئی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔

جادو فطرت (Nature) میں Interfere (مداخلت) کرتا ہے...... وہ رب سے آگے نہیں ہے...... یہ بالکل ایسا ہے کہ اگر ایک بہت بڑی گاڑی کسی جگہ کھڑی ہو تو آپ Push کر کے اُسے محض ہلا تو لیں گے لیکن اپنی طاقت سے اُسے دوڑا نہیں سکیں گے۔

اگر جادو بہت طاقت ور ہے تو وقتی طور پر انسان کو بخار ہو جائے گا، جسم ٹوٹنے لگے گا، اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا...... اِس کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔

علم لدنی Mystic sciences اور دیگر تمام سائنسز پر محیط ہے۔ جس طرح دیگر دُنیاوی علوم کے حصول کے لیے انسان حواسِ خمسہ سے کام لیتا ہے، اُسی طرح علمِ لدنی کے حصول کے لیے رُوح سات حواسوں سے کام لیتی ہے...... جیسے نفس، قلب اور خفی و اخفا وغیرہ۔

حواسِ خمسہ جتنے تیز ہوں گے، دُنیاوی علوم سیکھنے کی رفتار بھی اُسی قدر تیز ہوگی۔ رُوح میں جتنی لطافت، پاکیزگی اور بالیدگی ہوگی، ہمارے ساتوں حواس اُتنے ہی Sensitive (حساس) اور Active ہوں گے اور جتنے یہ حواس Active ہوں گے اُتنی ہی تیزی سے ہم علم لدنی حاصل کریں گے۔

دل کی صفائی بھی اس حوالے سے بہت ضروری ہے۔ جیسے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ہمارے گھر میں کسی بادشاہ نے آنا ہو تو ہم اپنے گھر کو مزید سجاتے، سنوارتے ہیں، صاف ستھرا کرتے ہیں......

دل میں تو پھر رب تعالیٰ نے بسنا ہے۔ پھر اُس کی صفائی کا اہتمام کیوں نہ کیا جائے۔

جتنی جلدی ہمارا دل کینہ، حسد، بغض، انتقام اور ہر قسم کی بُرائی سے پاک ہو جائے گا، اُتنی جلدی رب تعالیٰ ہمارے دل میں بس جائے گا۔ کوئی مرید کامیاب ہو ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ نہ کرلے، آیندہ گناہوں سے بچنے کی بھرپور کوشش نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے Dos اور Don'ts پر عمل نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نہ چاہے۔ یہ سب ہو نہیں سکتا جب تک کہ ہم اپنے دل کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک نہ کرلیں۔ اگر مرید صحیح معنوں میں مرشد سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ تمام مقاصد کو ختم کر کے صرف ایک مقصد ذہن میں رکھے اور وہ مقصد ہے "قربِ الٰہی کا حصول"۔ اگر آپ اِس مقصد کو ذہن میں رکھ کر مرشد سے ملیں گے تو آپ کو قربِ الٰہی حاصل ہو جائے گا...... لیکن اگر آپ دل میں یہ مقصد چھپا کر مرشد سے ملیں گے کہ میں اُن سے دُعا کرالوں کہ مجھے دُنیاوی ترقی حاصل ہو جائے اور اُن کے پاس بیٹھنے سے مجھے کشف و کرامات حاصل ہو جائیں، لوگ مجھے سلام کرنے لگیں اور میرے پاس غیر مرئی قوتیں آجانے سے لوگ مجھ سے ڈرنے لگیں۔

اگر یہ مقصد دل میں ہوگا تو آپ کہیں نہیں پہنچ پائیں گے۔ مرشد سے آپ کا تعلق صرف ایک بنیاد پر ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو سیدھا راستہ دکھادے...... آپ کو یوں گائیڈ کرے کہ آپ رب تعالیٰ تک جا پہنچیں۔

جب ہم نے کسی کو اپنا مرشد مان لیا، اُس کے قدموں میں جا بیٹھے، اپنے دل کو پاک صاف کرلیا، گزشتہ گناہوں سے توبہ کرلی، آیندہ گناہوں سے احتیاط کرنے لگے اور دل میں Single purpose (واحد مقصد) رکھا کہ ہمیں قربِ الٰہی حاصل ہو جائے تو گویا ہم نے ایک اچھا مرید بننے کے لیے کوالیفائی کرلیا۔

اب اِس سے آگے آداب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اِس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر ہم کسی شہنشاہ سے ملاقات کے لیے اُس کے دربار میں جانا چاہتے ہیں۔ اُس شہنشاہ کو ہم نے دیکھا نہیں بلکہ اُس کے بارے میں صرف سن اور پڑھ رکھا ہے۔ اگر ہم اُس شہنشاہ کے دربار کے آداب اور نشست و برخاست کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر دربار میں داخل ہو جائیں گے تو اِس بات کا قوی امکان ہے کہ شہنشاہ ہم سے برہم ہو جائے گا۔ اِس لیے اُس دربار میں جانے سے پہلے ہم اُس دربار میں حاضر ہونے والے لوگوں سے مل کر طور طریقے معلوم کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اگر میں وہاں ملاقات کے لیے جاؤں گا تو کہاں بیٹھوں گا......؟ اگر ہم تمام معلومات سے لیس ہو کر دربار میں حاضر ہوں گے تو Properly behave کریں گے اور اُس شہنشاہ کے قریب ہو جائیں گے کیونکہ عام انسان ہو، ولی اللہ ہو، پیغمبر ہو حتیٰ کہ رب تعالیٰ کو بھی Well-manneed، respectful اور صاف ستھرا انسان پسند آتا ہے۔ جب آپ معلومات سے پوری طرح Equipped ہو کر تمام protocols کے مطابق دربار میں حاضری دیتے ہیں تو شہنشاہ آپ کو اپنے قریب کرلے گا۔

اِسی طرح رب تعالیٰ کے قریب ہونے کے لیے ہمیں معلومات درکار ہوتی ہیں جو ہمیں وہی شخص

Provide (فراہم) کرسکتا ہے جو اُس دربار میں پہلے سے حاضری دیتا ہے اور مقربین میں سے ہے۔ وہ آپ کا مرشد ہے۔ ہمیں اُس سے یہ علم حاصل کرنا ہے اور طور طریقے سیکھنے ہیں۔ دربار میں گفتگو کا انداز اور قرینہ معلوم کرنا ہے۔

یاد رکھیے! کسی سے کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے ہمیں نیچا ہونا پڑتا ہے۔ اگر آپ جگ سے پانی لینا چاہتے ہیں تو جگ کو اُوپر اور گلاس کو نیچے رکھنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جگ کو نیچے اور گلاس کو اُوپر رکھ کر آپ پانی حاصل کرلیں۔

کسی چیز کے حصول کے لیے چونکہ اپنے آپ کو نیچا کرنا پڑتا ہے اس لیے ہمیں مرشد کے قدموں میں بیٹھنا ہے، اپنے آپ کو کمتر اور مرشد کو برتر سمجھنا ہے...... بحثیت انسان تو وہ آپ کے برابر کا ہے لیکن علمی حیثیت میں وہ آپ سے برتر ہے۔

ہم سے ایک غلطی اکثر ہو جاتی ہے کہ جب ہم مرشد کے پاس جاتے ہیں تو اُسے کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھ لیتے ہیں جس کے پاس Supernatural powers ہیں۔ دوسرا ہم اُسے معصوم سمجھ لیتے ہیں اور یہیں ٹھوکر کھاتے ہیں۔

آپ مرشد کو مرشد مانیے، اُسے مافوق الفطرت قوتوں کا مالک نہ سمجھیے۔ جب ہم پرائمری کلاسز میں داخلہ لیتے ہیں تو ٹیچر کو بہت Superior تو سمجھتے ہیں لیکن Supernatural نہیں جانتے۔ اِسی طرح آپ مرشد کو بڑا جانیے، بطور صاحبِ علم اُس کا احترام کیجیے لیکن اُسے ماروائی قوتوں کا مالک نہ سمجھیے۔ وہ بھی عام انسان ہے۔ اُسے معصوم بھی مت گردانیے کیونکہ اگر آپ اُسے مافوق الفطرت قوتوں کا مالک اور معصوم سمجھنے لگیں گے تو اُس کی ایک ہلکی سی لغزش، ذرا سی کوتاہی آپ کے دل میں میل پیدا کردے گی۔ لیکن اگر اُسے ہم نے اپنے جیسا انسان گردانا تو ہم اُس سے غلطی کی توقع رکھیں گے، اُس کی کسی لغزش اور کوتاہی پر درگزر سے کام لیں گے...... بالکل اُسی طرح کہ جب ہمارے اُستاد سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو اُسے دیکھ کر ہمارے دل میں موجود اُستاد کے احترام میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مرشد کو نہ تو مافوق الفطرت قوتوں کا مالک مانیے، نہ معصوم گردانیے...... اُس سے غلطی کی توقع رکھیے اُس کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہم اُس سے کوئی خلافِ شرع کام سرزد ہوتا دیکھیں تو بہت Respectfully (ادب سے) لیکن In a very roundabout way اُس سے اس کی وضاحت مانگ لیں۔

چار چیزیں ہیں: گمان، جھوٹ، سچ اور حقیقت...... گمان کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ''دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بدگمانی ہے۔'' لہٰذا بدگمانی تو بذاتِ خود جھوٹ ہے خواہ وہ کتنا بڑا سچ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ دلوں میں شک لاتا اور اُن کو دور کرتا ہے۔

جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے...... مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں سچ اور حقیقت کے درمیان بات آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو سچ ہو وہ حقیقت بھی ہو لیکن حقیقت ہمیشہ سچ ہوتی ہے۔ اس کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ فرض

کریں آپ کسی شخص کو بہت پرہیز گار، نیک اور پارسا سمجھتے ہیں۔ایک روز آپ اُس کے گھر جاتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ شراب پی رہا ہے۔آپ کو دھچکا لگتا ہے۔آپ لوگوں سے جا کر کہتے ہیں کہ میں ساری عمر اس شخص کو نیک سمجھتا رہا لیکن وہ تو شرابی نکلا۔اب آپ کہہ تو سچ رہے ہیں کیونکہ آپ نے واقعتاً اُسے شراب پیتے دیکھا ہے۔لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ لوگوں میں تشہیر سے قبل آپ اُس سے پوچھ لیں کہ آپ تو شراب سے پرہیز کرتے تھے پھر کس وجہ سے یہ پینے پر مجبور ہوئے؟ ہوسکتا ہے آپ کے سوال کے جواب میں وہ بتائے کہ ''صاحب! سردی کی وجہ سے میرے جوڑوں میں شدید درد ہے۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر میں وقتی طور پر ایک محدود مقدار میں شراب نہیں پیوں گا تو میرے جوڑ Stiff ہو جائیں گے اور میں زندگی بھر چل پھر نہیں سکوں گا۔''

اب حقیقت یہ ہے کہ وہ شراب کو شراب نہیں بلکہ دوا سمجھ کر پی رہا ہے۔جس کی مجبوری کی حالت میں رب تعالیٰ بھی اجازت دیتا ہے۔اگر آپ مرشد کو کبھی خلاف شرع کام کرتے دیکھ بھی لیں تو بہت Indirect way میں انتہائی ادب واحترام سے اِس کام کی وضاحت (Explanation) مانگ لیں۔اگر وہ اِس کی Favour میں کوئی دلیل نہ بھی دے سکے تو اُس کے عیب سے صرفِ نظر کر لیجیے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک آپ کسی شخص کی عزت نہیں کریں گے اور اُس کو بڑا نہیں جانیں گے تب تک اُس سے علم نہیں لے سکیں گے......خود کو سمجھایئے کہ مرشد بھی انسان ہے۔اُس سے ایک گناہ ہو گیا۔مجھے یقین ہے کہ میں جب دوبارہ اُس کے پاس جاؤں گا تو وہ اِس گناہ کی دلدل سے باہر نکل چکا ہو گا...... اور کسی دوسری کیفیت میں اُس کی Transformation ہو چکی ہو گی۔کیونکہ ولی اللہ اپنے چولے بدلتا رہتا ہے......اُس پر کیفیات آتی جاتی رہتی ہیں۔اگر کسی وقت وہ شیطان کے غلبے میں آ گیا ہے جس کی وجہ سے اُس سے بھول یا کوتاہی ہو گئی ہے تو وہ اللہ کے قریب ہونے کی وجہ سے بہت جلد اِس شیطانی غلبے سے چھٹکارا پالے گا۔اِسی طرح وہ ولایت کے ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے تک جاتا رہتا ہے۔رب تعالیٰ اُس کی حالت بدلتا رہتا ہے۔ولایت کا ایک خرقہ اُتار کر دوسرا خرقہ پہنتے اُسے زیادہ دیر نہیں لگتی۔اِس لیے مرشد کے بارے میں خوش اعتقادی رکھیے کہ میں جب دوبارہ اُس کے پاس جاؤں گا تو وہ اِس گناہ سے نکل چکا ہو گا۔اپنے مرشد کی غلطیاں، خامیاں اور عیوب لوگوں کے سامنے مت بیان کیجیے۔

ایک بات یاد رکھیے کہ اپنے ظاہری طرزِ عمل سے مرشد کی مخالفت اور Negation کرنے والا کبھی پھل نہیں پاتا اور دل میں مرشد کی مخالفت کرنے والا اپنی تباہی کو آواز دیتا ہے۔مرشد کی بات اور حکم آنکھیں بند کر کے تسلیم کیجیے۔اگر آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو اپنی ڈکشنری سے، کب، کیوں، کیسے، کیا، کہاں جیسے الفاظ نکال دیجیے......ورنہ آپ کہیں نہیں پہنچ پائیں گے۔

سوال: اگر ایک شخص کہیں بیعت تھا پھر اُس کے مرشد وفات پا گئے۔وہ اُن کے گدی نشین سے دوبارہ بیعت نہیں ہوا۔کیا ایسی صورت میں وہ کسی اور جگہ سے بیعت ہو سکتا ہے؟

جواب: یاد رکھیے کہ ولی اللہ اور صاحبِ علم کے ہاتھ پر جب ہم بیعت کرتے ہیں تو اُس کے نام کی لسٹ میں

ہمارا نام لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ نام اُس وقت تک نہیں کٹتا جب تک بیعت کرنے والا آپ کو خود اُس بیعت سے آزاد نہ کر دے...... یہ بیعت قائم رہتی ہے۔

اگر آپ کے مرشد کا انتقال ہو گیا اور اُن کے خلیفہ مجاز اُن کی جگہ آئے تو درحقیقت وہ آپ کے پیر بھائی بھی ہیں۔ یوں آپ دونوں کا مقام تقریباً ایک جیسا ہے۔ سوائے اِس کے کہ مرشد صاحب نے اُنھیں خلافت عطا فرمادی اور اجازت دے دی کہ وہ لوگوں کو بیعت بھی کر سکتے ہیں اور اُن کے لیے دُعا بھی کر سکتے ہیں۔ اِسی لیے اُنھیں خلیفہ مجاز کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ خلیفہ مجاز سے بیعت کی تجدید ضروری نہیں۔ لوگ عموماً اپنی وفاداری کی Assurance کے لیے بیعت Renew کر لیتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں۔

اگر مرشد کے انتقال کے بعد آپ کہیں اور بیعت ہونا چاہتے ہیں تو عام حالات میں اِس کی اجازت نہیں۔ تاوقتیکہ آپ کے مرشد خود آپ کو اِس کی اجازت نہ دے دیں کہ آپ فلاں کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ جب تک آپ کے مرشد اجازت نہ دے دیں آپ کسی اور کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتے۔

بیعت کی بات تو درکنار، اگر آپ نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو لازم ہے کہ آپ کسی اور سلسلے میں جا کر کسی بزرگ سے کسی بھی قسم کی مدد نہ مانگیں۔ اِس مقصد کے لیے اپنے ہی مرشد کے پاس جائیں۔ مدد سے مراد یہ ہے کہ اپنے مرشد کے علاوہ کسی سے کسی قسم کا علم حاصل کرنا یا دُعا کے لیے کہنا، البتہ آپ صاحب علم کو سلام کیجیے، اُن کی عزت کیجیے، اُن کی خاطر مدارات کیجیے، اُنھیں Look after کریں...... اِس کا بڑا اجر و ثواب ہے...... لیکن اپنے مرشد کے علاوہ کسی دوسرے صاحبِ علم سے دُعا کے لیے مت کہیے۔

میں کسی کو بیعت نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود جو لوگ میرے پاس تشریف لاتے ہیں، اگر کشف کے ذریعے مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کسی اور سلسلے میں بیعت ہیں، تو میں اُن سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے مرشد کے پاس جا کر اُن سے دُعا کرائیے۔ مجھے دُعا کرنے میں کوئی اعتراض نہیں...... کیونکہ میں دُعا نہ کر کے اللہ کے حضور بخیل نہیں کہلانا چاہتا...... لیکن یہ مناسب نہیں کہ آپ اپنے مرشد کے علاوہ کسی اور سے دُعا کرائیں۔

سوال: مرشد کی تلاش کیسے ممکن ہے؟

جواب: حق کی تلاش اور جستجو ہم پر فرض ہے۔ ہاں Certain cases میں یہ ہو جاتا ہے کہ آپ سرِ راہ اتفاقاً اُن صاحب علم کے سامنے آ گئے جن کے پاس آپ کا حصہ ہے اور جنھیں آپ کا چہرہ دکھا دیا گیا ہوتا ہے۔ اِس لیے وہ آپ کو دیکھتے ہی روک کر کہیں گے "میاں! تم کدھر پھر رہے ہو؟ تمھارا علم کا حصہ میرے پاس ہے۔" لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اتفاق روز روز نہیں ہوا کرتے۔

حق کی جستجو اور تلاش ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ اگر ہماری دُنیاوی مصروفیات ہمیں اِس جستجو کی اجازت نہیں دیتیں تو یہ ہماری بدنصیبی ہے۔ ہمیں اِس تلاش میں رہنا چاہیے کہ کہیں سے ہمیں وہ علم اور روشنی مل جائے کہ جس کی بدولت ہم اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جائیں۔

سوال: تقلید اور بیعت میں کیا فرق ہے؟

جواب: تقلید کرنے کے لیے آپ آزاد ہیں۔ آپ کسی شخص سے متاثر ہو کر اُس کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ Selective ہونا آپ کا حق ہے...... جہاں چاہیں اُس کی تقلید کریں اور جہاں چاہیں ایسا نہ کریں۔

بیعت میں معاملہ فروخت کا سا ہے۔ بیعت عربی لفظ ''بیع'' سے ہے جس کا مطلب ہی ''فروخت کرنا'' ہے۔ جہاں آپ بیعت ہوتے ہیں وہاں گویا اپنے آپ کو فروخت کر دیتے ہیں۔ آپ مرشد کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ وہاں آپ کے پاس کوئی چوائس نہیں ہوتی جب کہ تقلید میں Choice رہتی ہے۔

سوال: روزِ قیامت عذاب رُوح کو ہوگا یا جسم کو؟

جواب: روزِ قیامت صورِ اسرافیل سے مردوں کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ رُوح تو غیر مرئی ہوتی ہے۔ سوتی ہے نہ جاگتی ہے۔ انسانوں کو مجسم حالت میں قبروں سے اُٹھایا جائے گا۔ حساب کتاب کے بعد نامۂ اعمال اُن کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور مجسم حالت ہی میں اُنھیں عذاب دیا جائے گا۔

سوال: حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ جن کے پاس علم لدنی ہو اُنھیں قرآن کے صفحات کھولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: شاعری میں کئی جگہ چہرے کو قرآن اور عورت کو حور کہا جاتا ہے۔ جس عورت کو حور کہا جائے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ واقعی جنت کی حور ہے۔

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے اِس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ علم لدنی چونکہ تمام علوم پر محیط ہے اِس لیے صاحب علم جب گفتگو شروع کرتا ہے تو اُس کے ذہن میں خود بخود خیالات آنے لگتے ہیں اور وہ روانی سے اُنھیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ صاحب علم کو یہ خیال غیب سے آتے ہیں۔ اِسے شاعری میں آمد کہا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری دیکھ لیجیے۔ یہ فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ اِس کے دو حصے ہیں۔ شاعری کا ایک حصہ وہ ہے جو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر حاضری سے پہلے کہا گیا۔ یہ شاعری بادہ و جام کے گرد گھومتی ہے۔ شاعری کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اُنھوں نے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو مرشد مان لینے کے بعد لکھی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی حالت اور Nationalism (قوم پرستی) کا ذکر ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ جیسی شاعری ہے۔ یہ ساری شاعری فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ آمد ہے۔

ایک بار علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پانچ اولیائے کرام تشریف لائے اور فرمایا ''آپ نے ولایت تو حاصل کر لی۔ اب آپ منبر بھی سنبھال لیجیے اور مسلمان قوم کو تعلیم دینا شروع کر دیجیے۔'' علامہ اقبال نے اِس پر Agree (اتفاق) نہیں کیا جس پر اُن بزرگوں نے فرمایا ''اگر آپ منبر پر نہیں چڑھتے تو آپ کا یہ کلام منبر پر چڑھ جائے گا۔''

آپ دیکھ لیجیے کہ کبھی علما حضرات علامہ اقبال کو کافر کہتے تھے...... اب کسی خطیب کا وعظ مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ علامہ اقبال کی شاعری اُس میں شامل نہ کر لے۔ یوں رب تعالیٰ نے اُن کی شاعری کو منبر چڑھایا۔

اسی طرح صاحب علم جب گفتگو کرتا ہے تو قرآن کو Consult نہیں کرتا...... وہ قرآن سے بات شروع کرتا ہے اور آمد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ ان خیالات اور علم کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اُسے قرآن کے صفحات پلٹنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سوال: علم لدنی عطا ہے یا محض دین؟

جواب: علم لدنی کے حصول کے دو طریقے ہیں...... ایک تو بذریعہ عطا ملتا ہے کہ رب تعالیٰ بندے کی کسی ادا سے اِتنا خوش ہوا کہ اُس کی رحمت جوش میں آ گئی اور اُس نے علم عطا فرما دیا...... یہ رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہے۔ ایک عطا صاحب علم کی طرف سے ہوتی ہے کہ آپ صاحب علم کی خدمت کرتے رہے اور اُس نے آپ کی خدمت اور طور طریقوں سے خوش ہو کر اپنے علم کا ایک حصہ آپ کو عطا کر دیا۔

رب کی طرف سے جو علم عطا ہوتا ہے، وہ جاری و ساری رہتا ہے لیکن جو مرشد یا کسی اور ولی اللہ سے عطا ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہونے لگتا ہے۔

اِس کے علاوہ کسبِ علم کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ریاضت کے ذریعے اپنے اعمال کو درست کر کے آگے بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ رب آپ سے راضی ہو جاتا ہے اور آپ کو علم عطا کر دیتا ہے۔ اس راہ میں جوں جوں آپ ریاضت کرتے چلے جاتے ہیں، آپ کا مرتبہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر مرتبے کے ساتھ علم کا Level بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ریاضت والے لوگ زیادہ اور عطا والے کم ہیں۔

سوال: کچھ اولیائے کرام پیشین گوئیاں کرتے ہیں جیسے نعمت شاہ ولی وغیرہ۔ اُن پیشین گوئیوں کا مطلب کچھ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ پیشین گوئیوں کو ایک خاص Pattern میں بیان کرنے کی کیا وجہ ہوتی ہے؟

جواب: جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا جاتا۔ جس انسان کے پاس جتنا زیادہ علم ہے وہ اپنے Expression میں اُتنا ہی Clear ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کشف کے ذریعے کوئی چیز دیکھی...... چونکہ وہ علم کے زیادہ اونچے مقام پر نہیں اس لیے اُس کی Clarity of expression بھی کم ہو گی۔

پھر اِس خوف سے کہ اُس بات کو غلط استعمال نہ کر لیا جائے، اِس میں ابہام رکھ دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر وقت کا تعین نہیں کیا جاتا کہ فلاں سال کے فلاں مہینے کے فلاں دن میں یہ کام ہو جائے گا۔ ایسی Predictions یا Foretellings میں آپ کو کبھی وقت کا تعین نظر نہیں آئے گا کیونکہ یہ بہکا دینے والی بات ہے...... حتیٰ کہ آپ ﷺ کہ جن کے پاس اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ علم ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر Maximum بھید عیاں کر دیے۔ آپ ﷺ نے بھی قیامت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ Link کرتے ہوئے Sequence ضرور بتایا، لیکن وقت کا تعین نہیں کیا۔ پھر بھی وہ تمام نشانیاں بہت Definite اور Clear ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے جو باتیں بیان فرمائیں، وہ بھی بہت Clear ہیں۔ عموماً اولیاء اللہ Foretellings اور Predictions سے گریز کرتے ہیں لیکن جہاں اُن کی زبان سے کوئی بات ادا ہو گئی تو بہت Clear ہونے کے باوجود اُس میں وقت تعین نہیں ہو گا۔

مرشد ضروری کیوں / آداب مرشد

سوال: مرشد کے آداب کیا ہیں؟

جواب: مرید پر لازم ہے کہ اپنے مرشد کے بارے میں کبھی بُرا خیال دل میں نہ لائے اور یہ عقیدہ رکھے کہ وہ انسان ہیں اور اُن سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اُن میں کوئی بُرائی دیکھ کر وہ سمجھے کہ مرشد کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے اِس لیے وہ اپنی اِس انسانی لغزش اور کوتاہی کو جلدی درست کرلیں گے۔ جب اگلی بار میری اُن سے ملاقات ہوگی تو وہ اِس غلطی سے پاک ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا مرید اپنے مرشد کے بارے میں کوئی اُلٹا سیدھا خیال دل میں نہ لائے۔

آپ مرشد کو کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں بلکہ انسان سمجھیں کیونکہ مافوق الفطرت سمجھنے کی صورت میں ہم اُس سے غلطی اور کوتاہی کی توقع نہیں رکھیں گے۔ لیکن ہے تو بہر حال وہ انسان ہی...... خطا کا پتلا۔ اگر ہم نے اُسے مافوق الفطرت سمجھ لیا تو اُس سے خطا سرزد ہوتے دیکھ کر ہمیں صدمہ پہنچے گا اور ہمارے دل میں اُس کے لیے جو عزت و احترام ہے، اُس میں فرق آجائے گا۔

یاد رکھیے! ہم جس انسان سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اُس کا Wholeheartedly (پوری طرح) احترام کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر ہم اُس کا احترام نہیں کریں گے تو اُس سے کچھ سیکھ نہیں سکیں گے۔ ہم سیکھتے اُسی سے ہیں جسے خود سے Superior (برتر) جانتے ہیں اور جس کو Superior (برتر) جانتے ہیں اس کا ادب و احترام ضرور کرتے ہیں۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ 'ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں'

اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ مرشد کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اِس کا جواب شاید آج آپ کو مل جائے۔ دُنیا میں چند ایک کے سوا تقریباً تمام اولیا کے مرشد ضرور تھے...... جن کے مرشد نہیں تھے وہ بھی ولایت کے بلند مقام پر پہنچے جیسے حضرت اویس قرنیؓ...... لیکن یہ Exceptions ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے، اُن کو اپنی رحمت کے صدقے علم بھی عطا کرتا ہے اور شیطان کے مختلف ہتھکنڈوں سے بھی بچائے رکھتا ہے۔

عام طور پر مرشد کا ہونا اِس لیے ضروری ہے کہ وہ مرید کی تربیت بھی کرتا ہے اور اُسے بُرے بھلے کی

پہچان بھی کراتا ہے۔ جہاں جہاں مرید کا پاؤں پھسلنے لگتا ہے، مرشد اُسے ٹوک دیتا ہے اور واپس Track پر لے آتا ہے۔

مرید پر لازم ہے کہ جب وہ ایک بار بیعت کر لے، گزشتہ گناہوں سے توبہ اور آیندہ گناہوں سے بچنے کا عہد کر لے تو پھر حتی المقدور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے اور خلاف شرع کام نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں اُس کی ارادت فسخ ہو جائے گی۔ ارادت فسخ ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ نے بیعت کے وقت اپنے مرشد سے جو Commitment کی تھی آپ نے اُس کے الفاظ Swallow back کر لیے۔

بیعت میں چونکہ مرید اپنے آپ کو مرشد کے ہاتھوں لفظاً فروخت کر دیتا ہے...... جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف وہ کریں گے جو آپ کا مرشد آپ سے کہے گا۔ اور مرشد یقیناً صحیح کاموں کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا جہاں آپ نے مرشد کے حکم کی خلاف ورزی کی، وہاں آپ نے اپنی اِس Commitment کو Swallow back کر لیا۔

یہاں ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم یاد رکھیں کہ اگر کوئی شخص کسی کو کوئی چیز ہبہ کرنے کے بعد واپس لے لے تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کتے نے قے کر کے اُسے کھا لیا۔ اپنے مرشد کے بتائے ہوئے راستے کی خلاف ورزی کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ اِس کا نقصان کیا ہوگا۔

- اِسی طرح جب آپ مرشد کی محفل میں بیٹھیں تو اپنے آپ کوئی بات نہ کریں...... اپنے خیالات کا اظہار مت کریں بلکہ مرشد کی سنیں۔
- اگر مرشد کے سامنے کوئی ایسا سوال رکھا جائے جس پر وہ غور و فکر میں ڈوب جائے اور مرید کو اُس سوال کا جواب آتا ہو تو اُس پر لازم ہے کہ وہ مرشد کے سامنے اپنی قابلیت کا اظہار نہ کرے...... یہ سوئے ادب ہے۔
- اگر کسی وقت ایسا ہو کہ مرشد کوئی غلط بات کہہ رہا ہے...... مرید کا علم زیادہ ہے اور وہ جانتا ہے کہ میرا مرشد غلط بات کہہ رہا ہے تو وہ اُس کی تردید نہ کرے بلکہ اُس کے غلط جواب کو درست مان کر اُس پر عمل کر لے۔
- جب آپ کسی کو مرشد مان لیں تو پھر کسی اور کی محفل میں جا کر نہ بیٹھیں۔ یاد رکھیں! تمام فقراء کی ارواح کی Composition ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ اپنی رُوح سے مطابقت رکھتی ہوئی پڑھائیاں پڑھ کر علم حاصل کرتے ہیں۔ اُن کا اُسلوب، اُن کی راہ اور طریقہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک فقیر کی کرامت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر فقیر کا طریقہ اور اُسلوب مختلف ہوتا ہے۔ جب آپ کسی اور کی محفل میں جا کر بیٹھیں گے تو وہ شیخ اپنے اُسلوب اور طریقے سے مرید کی تعلیم و تربیت کر رہے ہوں گے۔ آپ کے شیخ اپنے طریقے سے یہ تربیت کر رہے ہوں گے...... فرق دیکھ کر آپ Confuse ہو جائیں گے۔ اس سے بچنے کے لیے لازم ہے کہ آپ اپنے شیخ کی محفل میں رہیے اور اُن سے سیکھیے...... کسی دوسرے شیخ سے بات

کرنے سے پرہیز ہی کیجیے۔ البتہ اُن کا احترام کریں، اُنھیں سلام کیجیے۔ اگر اللہ نے توفیق دی ہے تو اُن کی خدمت کیجیے لیکن اُن سے علمی گفتگو قطعی طور پر مت کریں۔

- آپ اپنے شیخ یا اُن کے مہمانوں کے برابر کبھی نہ بیٹھیے۔ یہ خلاف ادب ہے...... تاوقتیکہ وہ خود حکم نہ دے دیں۔
- کچھ لوگ شیخ کے احترام میں بہت آگے چلے جاتے ہیں۔ یہ احترام بھی حدود میں رہنا چاہیے تاکہ معاملہ شرک میں نہ چلا جائے۔

ایک شیخ نے اپنے مرید کو اپنی چپلیں تحفے میں دیں۔ دو چار بار دیکھا کہ مرید نے وہ چپل پہنی نہیں۔ ایک روز پوچھا ''میں نے تمھیں پہننے کے لیے چپل دی تھی، کیا تمھیں پسند نہیں آئی؟'' مرید بولا ''یا شیخ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن احترام کا تقاضا یہ ہے کہ جو چپل آپ کے پاؤں میں رہی، اُس میں میں اپنا پاؤں نہ ڈالوں'' تب شیخ نے بہت مزے کی بات کہی ''اے بندۂ خدا! ذرا یہ بتاؤ کہ حکم پہلے ہے یا احترام'' اِسی احترام کا تقاضا ہے کہ حکم کو مان لیا جائے۔ حکم پہلے اور احترام بعد میں آئے گا۔ اب حکم چپل پہننے کا تھا لیکن مرید احترام کے مارے اُسے جیب میں ڈالے پھرتا تھا۔

جب آپ شیخ کے پاس ہوں تو اُس کا حکم احترام پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ جو حکم دے، آنکھیں بند کر کے مان لیجیے کیونکہ وہ کوئی خلاف شرع حکم نہیں دے گا۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ ماسوائے چند ایک کے تمام اولیاء اللہ کا کوئی مرشد یا اُستاد ضرور ہوتا ہے۔ (تصوف میں اُستاد کو شیخ کہتے ہیں۔)

یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ ایک سے دوسرے کو سکھاتا اور دیے سے دیا جلاتا ہے۔ اس میں مقام اور حالت کی تبدیلی کے نتیجے میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے...... بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک حالات میں ایک مقام پر ایک شخص اُستاد ہے...... مقام اور حالات بدلے تو وہی اُستاد شاگرد ہو گیا۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کروانے سے پہلے علم الاسماء عطا کر دیا، چیزوں کے نام سکھا دیے۔ پہلے تو فرشتوں نے عرض کی کہ یہ انسان تو زمین پر فساد پھیلا دے گا لیکن جب اُن پر حضرت آدم علیہ السلام کی علمی برتری ظاہر ہو گئی تو فرشتوں نے اُنھیں سجدہ کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے In applied sense فرشتوں کو وہ چیز بتائی جو پہلے فرشتے نہیں جانتے تھے۔ اُن فرشتوں میں بلند مقام رکھنے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی تھے۔ یوں حضرت آدم علیہ السلام اُس وقت اُستاد کے مقام پر تھے لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیے گئے تو یہ زمین اُن کے لیے بالکل نئی چیز تھی...... پھر زمین پر اُترتے ہی اُن میں بشری صفات پیدا ہو گئیں۔ بھوک بھی لگی، باطنی سوزش بھی ہوئی، علم کی بھوک بھی بڑھی، چیزوں کو جاننے کا تجسس بھی پیدا ہوا۔ جب پریشانی کے عالم میں زمین پر پھر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرائیل علیہ السلام زمین پر اُترے اور حضرت آدم علیہ السلام

کو کچھ گندم دے کر اُسے زمین میں بونے، کاشت کرنے، پیس کر آٹا بنانے اور روٹی تیار کرنے کا طریقہ بتایا۔ یوں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق روٹی پکائی گئی۔ اس طرح حضرت جبرائیل علیہ السلام جو آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کے شاگرد تھے، وہ زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کے اُستاد ہو گئے۔ اب صرف مقام اور حالات بدل جانے سے شاگرد، اُستاد کے مقام پر فائز ہو گیا۔

اسی طرح آپ ﷺ امام الانبیاء ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی لیکن دو مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو خانہ کعبہ کے قریب نماز پڑھائی اور نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا۔ یوں مقام اور حالات بدلنے سے اُستاد اور شاگرد کی پوزیشن میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مرید اپنے مرشد سے سبقت لے جاتا ہے۔ مرید کے لیے مرشد کے پاس اُس وقت تک رہنا لازم ہے جب تک رب تعالیٰ اُسے اُس مقام اور ولایت کی اُس سٹیج تک نہیں لے جاتا جہاں رب تعالیٰ خود اُس کی نگہداشت کرنے لگے۔ اُس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک وہ مرشد کے پاس رہے اور اُس کے سامنے سر نہ اُٹھائے۔ جہاں وہ اُس مقام کو پہنچے گا اور Independent (خود مختار) ہو جائے گا تو مرشد اُسے از خود جانے کی اجازت دے دے گا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں رب تعالیٰ خود براہِ راست بندے کی نگہداشت کرتا ہے اور اُس پر تمام احوال براہِ راست کھلنے لگتے ہیں۔ مرشد کی براہِ راست توجہ کے بغیر اُس کی حالت میں براہِ راست تغیر آنے لگتا ہے۔ اس مقام پر آ کر مرشد سے ملنا جلنا کم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ مقام بھی آتا ہے کہ مرشد سے ایسے شخص کا ملنا محاورتاً حرام ہو جاتا ہے۔ سوائے اِس کے کہ بلا ارادہ سرِ راہ یا سرِ محفل ملاقات ہو جائے...... لیکن وہاں بھی مرشد اپنے مرید پر نہ نظر ڈالتا ہے نہ توجہ کرتا ہے...... نہ ہی مرید اُس کی توقع رکھتا ہے۔ تب مرید Independent ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک مرید اُس مقام تک نہ آئے اُسے Independent ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

- اسی طرح جن سلاسل میں قوالی اور سماع جائز ہے...... جیسے سلسلہ چشتیہ وغیرہ...... محفل سماع میں مرشد بھی موجود ہوتے ہیں اور مرید بھی۔ اسی محفل میں مرید کا حال کھلنا خلاف ادب ہے تاوقتیکہ یہ حال شیخ کی توجہ سے ہو...... اور انسان کے اختیار سے باہر ہو جائے۔ اِسی طرح اُس محفلِ سماع میں اگر شیخ نے توجہ ڈالی اور مرشد حال کھیلنے لگا تو حال کے دوران اُس نے جو کچھ دیکھا اُس کا بیان کرنا بھی خلاف ادب ہے۔ اُسے یہ مشاہدہ یا واردات اپنی ذات تک محدود رکھنی چاہیے۔ اپنی کیفیات، احوال اور مشاہدات و واردات کو مرشد کی موجودگی میں لوگوں کے سامنے بیان کرنا خلاف ادب ہے۔
- مرید کو چاہیے کہ وہ اپنی کوئی خوبی اور اچھائی اپنے مرشد کے سامنے بیان نہ کرے۔

یہ وہ آداب ہیں جن کو اپنا لینے سے مرید فائدہ میں رہتا ہے البتہ اس سے شیخ کے مقام، درجے اور عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ان آداب کا مقصد یہ ہے کہ مرید اپنے آپ کو دل سے مرشد سے کم تر جانے کیونکہ صرف ایسی صورت میں ہی وہ مرشد سے کچھ سیکھ سکے گا۔

سوال: کیا مرشد کا احترام والدین سے زیادہ ہے؟

جواب: مرشد کا احترام تمام دُنیاوی رشتوں سے زیادہ ہے۔ ایک روز مرشد صاحب نے جوش میں آ کر فرمایا ''میاں! مرشد کو تو رب کا درجہ دینا چاہیے۔''

میں یہ بات سن کر چونکا کہ یہ تو انھوں نے بہت بڑا شرک بول دیا۔ بہت پریشان ہو کر ان کے پاس سے اُٹھ آیا۔ اِس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بہت عرصے بعد مجھے سمجھ آئی کہ اُنھوں نے بطور استعارہ یہ جملہ بولا تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ جس طرح آپ رب تعالیٰ کی کسی بات کو Question نہیں کرتے اِسی طرح مرشد کی کسی بات کو Question نہیں کیا جانا چاہیے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا پیار، محبت اور خوف آپ کے دل میں ہوتا ہے، اُسی طرح جب تک مرشد کا خوف، ڈر، محبت، پیار اور احترام دل میں نہیں ہوگا، آپ کچھ سیکھ نہیں سکیں گے۔ بقول بڑے شاہ صاحب ''مرشد کا احترام بے پناہ ہے۔''

سوال: مرید اور مرشد کے مقام اور درجے میں عموماً فرق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ درجہ میں فرق آنے سے کیا مرشد کے خیالات میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ کیونکہ مرید کبھی مرشد کے مقام تک نہیں پہنچ پاتا۔

جواب: یہ ضروری نہیں۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں مرید اپنے شیخ سے آگے بڑھ گئے۔ شیخ اگر ابدال کے درجے میں تھا تو مرید اپنے شیخ کی زندگی میں ہی قطب ہو گیا۔ ضروری نہیں کہ مرید اور مرشد کا فرق بڑھتا ہی رہے۔ یہ صرف اُسی صورت میں ہوگا اگر مرید بہت ہی نالائق اور Dull ہے...... کچھ سیکھتا ہی نہیں۔ اُس کی سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آتی۔ اب مرشد یا شیخ تو اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن مرید اگر سیکھ نہیں رہا تو ہر گزرتے دن میں پیچھے رہنے لگے گا۔ لیکن اگر مرید سمجھ دار، لائق اور ہونہار ہے تو پھر اپنے شیخ سے بھی آگے نکل جائے گا۔ اِس کی بے تحاشا مثالیں موجود ہیں۔

سوال: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''میرے قلب پر علم لدنی کے ستر دروازے کھول دیے گئے جن کی وسعت آسمان وزمین کے برابر ہے۔''

جواب: شیخ عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم ہیں۔ یہ مقام اُس وقت ملتا ہے جب انسان پر کم از کم دُنیا میں موجود چاروں اقطاب سے زیادہ علم لدنی وارد ہوتا ہے۔ جو غوثوں کے غوث ہیں اُن کے پاس موجود علم کی وسعت کیا ہوگی۔ اِس کو Explain کرنے کے لیے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ''میرے قلب پر علم لدنی کے ستر دروازے کھول دیے گئے جن کی وسعت آسمان وزمین کے برابر ہے۔'' میں نے ایک بار عرض کیا تھا کہ رُوحانیت کی راہ میں عام طور پر ابتدا میں زمین، پھر سمندر اور اُس کے بعد آسمان سے متعلق علم عطا ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ یہی ترتیب رہے۔ کچھ لوگوں کے معاملے میں یہ ترتیب بدل بھی جاتی ہے۔ جس شخص کو تمام چیزوں کا کشف عطا ہو گیا تو اُسے زمین و آسمان پر محیط علم عطا ہو گیا۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ نے ستر دروازوں سے مثال دے کر دراصل اپنے علم کی وسعت بیان فرمائی ہے۔

تقدیر، تدبیر اور جبر

یہ ہماری خیام خیالی ہے کہ انسان مجبور محض ہے، انسان تو صرف تقدیر کا محتاج ہے...... رب قادرِ مطلق ہے اور اُس نے انسان کو اپنا نائب بنا کر زمین پر اُتارا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے سسٹم میں بھی اعلیٰ افسر کا نمبر 2 یا جانشین کبھی کلیتہً بے اختیار نہیں ہوتا۔ ڈائریکٹر جنرل کے پاس کسی Department کے کلی اختیارات ہوتے ہیں اور اُس کے حکم کے مطابق ہی ڈیپارٹمنٹ چلتا ہے لیکن اس کے باوجود ڈائریکٹر جنرل اپنے نمبر 2 یعنی ڈائریکٹر کو بھی کچھ اختیارات تفویض کر دیتا ہے...... اور وہ اُن اختیارات کو Exercise کرنے میں آزاد ہوتا ہے لیکن جب DG یہ محسوس کرے کہ ڈائریکٹر اپنے فیصلے سے اپنا یا Department کا کوئی نقصان کر دے گا تو وہ فوری طور پر Intervene کرتا ہے اور ڈائریکٹر کے جاری کردہ احکامات کو کینسل کر کے اپنے احکامات کے ذریعے اُنھیں Overrule کر دیتا ہے...... یہ تو انسان کا بنایا ہوا سسٹم ہے۔ اللہ کا جو سسٹم ہے اُس میں وہ قادرِ مطلق ہے لیکن اُس نے اپنے نائب انسان کو بھی کافی حد تک اختیارات دیے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُس نے انسان کو Freedom of thought (سوچ کی آزادی) دی کہ وہ جو چاہے سوچتا رہے۔ پھر رب تعالیٰ نے اُسے Freedom of decision (فیصلے کی آزادی) عطا فرمائی۔ اگر کوئی انسان جلتی آگ میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کرتا ہے تو کوئی فرشتہ اُسے آ کر نہیں روکتا۔ تیسری آزادی جو انسان کو عطا فرمائی گئی وہ Freedom of action ہے۔ اگر ایک انسان کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا سوچتا ہے تو وہ اس سوچ میں آزاد ہے...... کوئی فرشتہ اُسے اُس کی اس سوچ سے نہیں روکے گا۔ اِس کے بعد اگر وہ ایک قدم اور آگے جا کر کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ فیصلے میں آزاد ہے...... کوئی فرشتہ اُسے آ کر نہیں روکے گا۔ اور پھر اگر وہ اپنے فیصلے کو Apply کرتا ہے اور کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا ہے تو اُس وقت بھی اُسے کوئی فرشتہ روکنے نہیں آئے گا۔ لیکن اُس کے بعد رب تعالیٰ کی ویٹو پاور شروع ہو جاتی ہے کہ اُس شخص کا چھلانگ لگانا اگر اللہ کی Overall scheme of matters میں کہیں fit ہو رہا ہے یا اُس شخص کا موت کا مقررہ وقت وہی ہے جس میں وہ چھلانگ لگا رہا ہے اور اُس کا طریقۂ موت چھلانگ ہی ہے اور مقامِ موت کنواں ہے تو اس چھلانگ کے نتیجے میں اُس کی موت واقع ہو جائے گی۔ ورنہ اُسے تقدیر بچا لے گی۔

اب تین جگہوں پر اُسے آزادی ہے...... چوتھی جگہ پر اللہ نے اپنی ویٹو پاور استعمال کر لی اور اُس کی اس

کوشش کو ناکام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنے نائب کو پہلے تو یہ تین اختیارات عطا فرمائے Freedom of thought، Freedom of decision اور Freedom of action لیکن اللہ نے نتیجہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔

یہ جو تقدیر کا معاملہ ہے اِس سارے معاملے میں تقدیر یقیناً موجود ہے اور یہ تقدیر انسان کی Destiny میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ تقدیر ہی ہے جو انسان کو Drive کر رہی ہوتی ہے...... اور نہ ہی ایسا ہے کہ تدبیر انسان کو Drive کر رہی ہوتی ہے۔ تقدیر اور تدبیر دونوں Side by side چلتی ہیں۔

تقدیر دو طرح کی ہے:

(1) تقدیر مبرم یا معین

(2) تقدیر معلق۔

تقدیر مبرم انسان کی ٹوٹل تقدیر کا پانچ سے دس فی صد ہے جب کہ باقی تقدیر معلق انسان کی تقدیر کا Mojor part ہے۔ تقدیرِ معلق انسان خود لکھتا ہے۔ یہ وہ تقدیر ہے جو دُعا سے بدل بھی جاتی ہے۔ تقدیر معلق کے سلسلے میں مختلف قوانین فطرت حرکت میں آتے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے ''انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔'' ذرا سوچیے کہ اگر انسان مجبورِ محض ہوتا اور تقدیر کے جبر کے تحت چل رہا ہوتا تو اِس آیت کا مطلب نہیں نکلتا تھا۔ اِس آیت کا مطلب اِسی لیے ہے کہ تقدیر معلق وہی ہے جو انسان اپنی کوشش اور محنت سے اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ اگر ایک شخص ایک اچھا چور بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ چوری میں کمال حاصل کر لے گا۔ لیکن اگر چور ہونا اُس کی Destiny نہیں ہے تو کچھ عرصہ تو وہ چوری کے ذریعے لوگوں کا ناطقہ بند کر دے گا۔ لیکن کسی Guided moment میں کسی واعظ کا کوئی لفظ اُس کے دل پر یوں اثر کر جائے گا کہ اُس کے دل کی حالت بدل جائے گی...... اور یوں وہ اپنی Destiny کی طرف چلا جائے گا۔ یہاں رب تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ تقدیر کا جبر Exercise ہوگا۔

کسی انسان کی کوشش کا انعام اُسے ضرور دیا جاتا ہے۔ اگر ایک انسان نیک بننا چاہتا ہے اور اِس کے لیے کوشش کرتا ہے تو وہ نیک ضرور بنے گا۔ اس کا ایک ثبوت رب تعالیٰ کا مقرر کردہ سزا اور جزا کا نظام ہے۔ اگر تقدیر کا جبر ہی سب کچھ ہوتا تو پھر رب تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ سزا و جزا کا نظام ناانصافی ہوتا کہ ایک شخص گناہ کرتا ہے...... اس کو دُنیا و آخرت میں سزا ملے گی۔

ایک شخص نیکی کی راہ پر چلتا ہے...... تکلیفیں اُٹھاتا ہے تو اُس کے لیے اِس دُنیا میں بھی انعام ہے اور اگلی دُنیا میں بھی انعام ہے۔ لیکن اگر یہ سب تقدیر کے جبر کے تحت ہے اور ایک شخص کی تقدیر میں لکھا ہے کہ وہ قاتل ہے اور تقدیر کے اِس جبر کے تحت وہ کسی کو قتل کر رہا ہے تو پھر اُس کو سزا کیسی؟ لیکن قاتل کے لیے رب کی طرف

سے حد مقرر ہے کہ خون کے بدلے خون یا قصاص قتل کی سزا ہے۔ اب سزا تو اُس عمل پر دی جاسکتی ہے جو انسان اپنی مرضی کے تحت کرے۔ تقدیر کے جبر کے تحت کیے گئے کام پر سزا نہیں دی جاسکتی۔ اگر تقدیر کا جبر ہی سب کچھ ہوتا تو سزا و جزا کا نظام ناانصافی ہوتا اور اللہ سے بڑھ کر انصاف کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ سے کسی بھی قیمت پر کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی۔

تدبیر انسان کی تقدیرِ معلق بناتی ہے۔ جیسی تدبیر اور کوشش ہوگی، انسان ویسا ہی ہو جائے گا۔ اور اُس کے اعمال کے مطابق اُسے جزا و سزا مل جائے گی۔ لیکن تقدیر مبرم کے سلسلے میں انسان مجبور ہے۔ یہاں ایک اور Factor بھی کارفرما ہے۔ یہ کائنات ایک بہت Delicate balance پر قائم ہے۔ جہاں کسی شخص کی کسی حرکت سے اِس Delicate balance میں فرق آنے کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں رب تعالیٰ اپنی ویٹو پاور استعمال کرتا ہے اور کسی انسان کو قوانین فطرت سے کھیلنے نہیں دیتا۔ تب ایسے عوامل حرکت میں آجاتے ہیں جو اُس شخص کو سزا بھی دیتے ہیں اور اُس حرکت سے روک بھی لیتے ہیں۔ لیکن یہ تقدیر کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں بھرپور کوشش کرنے کی تلقین کی ہے۔ بدقسمتی سے ہم رب تعالیٰ کی دکھائی گئی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور ہمارا سارا زور دعاؤں پر چلا گیا ہے...... جب کہ کوشش، محنت اور تدبیر پہلے ہے اور پھر دُعا رب تعالیٰ! تو نے مجھے جو ذہنی و جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، اُن سے بھرپور کام لے کر میں نے محنت کر لی۔ اب تو اِس کا بہترین نتیجہ مجھے عطا فرما دے اور میری اِس کوشش میں مجھے کامیاب فرما دے۔'' یہ ایک مومن کا طریقہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں ترتیب اُلٹ گئی۔ ہم پہلے دُعا کرنے والوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں، بعد میں کوشش کا سوچتے ہیں۔ اگر ہمیں کہیں سے یہ خبر مل جائے کہ فلاں جگہ پر دُعا والا آدمی بیٹھا ہے تو چاہے ہمیں کتنی ہی تکلیف اٹھانا پڑے اور محنت کرنی پڑے، ہم اُس تک پہنچ کے دُعا کراتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ صحیح سمت میں اِس سے آدھی کوشش ہی کر لیتے تو ہمارا کام اِس دُعا کے بغیر ہی ہو جاتا۔

یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت کمر کس کے رکھتے ہیں...... اور ہر وقت عمل اور جدوجہد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ ﷺ جو رب کے محبوب ہیں اور جن کے عشق میں رب تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی ہے۔ کیا آپ ﷺ کی ایک دُعا سے مسلمانوں کی ساری کی ساری تقدیر نہ بدل جاتی۔ کیا آپ ﷺ کی ایک دُعا سے سارے کے سارے کفار نیست و نابود نہ ہو جاتے۔ کیا آپ ﷺ کی ایک دُعا سے مسلمانوں کی سلطنت روم و فارس جیسی عظیم سپر پاورز کی نسبت پلک جھپکنے میں بڑھ نہیں سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ تو کبھی اپنے محبوب ﷺ کی بات رد ہی نہ کرتا۔ لیکن آپ ﷺ نے ایسی کوئی دُعا نہیں فرمائی۔ بلکہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کی حکومت اور Supermacy قائم کرنے اور اللہ کے دین کو پھیلانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ آپ ﷺ کی بارہ سالہ مکی زندگی دیکھ لیجیے...... یہ مشقت اور جدوجہد سے بھرپور زمانہ تھا۔ اُن بارہ سالوں میں آپ ﷺ نے دُنیا کی کوئی ایسی تکلیف نہیں جو اُٹھائی نہ ہو۔ کوئی ایسی مشقت نہیں جو برداشت نہ کی ہو۔ پھر دس سالہ مدنی دور کو دیکھ لیجیے۔ اُس میں آپ ﷺ کے

ابتدائی تین سال دن رات محنت کے ہیں...... کیونکہ اُن میں آپ ﷺ نے اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی اور اُنہی سالوں میں غزوۂ بدر اور غزوۂ احد پیش آئے۔ اِس کے بعد آپ ﷺ کی حیاتِ ظاہری کے آخری سات سال Consolidation کے ہیں۔ اِن سات سالوں میں آپ ﷺ نے اسلامی سلطنت کو مضبوط کیا۔

ذرا غور کیجیے کہ محبوبِ الٰہی ﷺ کا یہ عالم ہے کہ بے پناہ محنت کی، بے حد تکالیف اُٹھائیں...... ہم تو آپ ﷺ کے در کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے۔ پھر ہم کہاں اِس دُنیا میں آسانیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ بغیر کسی دقت اور مشکل کے ہمارے کام ہو جائیں۔ آپ ﷺ ہمارے لیے ایک نمونہ چھوڑ گئے ہیں۔ ہم اُس سے رُوگردانی کیسے کر سکتے ہیں؟

ہم میں سے ہر انسان یہ خواہش کرتا ہے کہ ہماری زندگی میں گرم ہوا کا ایک جھونکا تک نہ آئے۔ سب آسانیاں ہماری اور دقتیں دوسروں کے لیے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اپنی اولاد کے لیے پریشان پھرتے ہیں کہ بیٹی بیاہی ہے، اُسے اپنے گھر میں بہت تنگی کا سامنا ہے۔ ہم یہ شکایت کرنے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچ لیتے کہ شہنشاہِ دو عالم ﷺ کی لاڈلی صاحب زادیؓ کے ہاتھوں پر چکی چلاتے چلاتے چھالے پڑ گئے تھے...... اور پانی کی مشک اُٹھاتے اُٹھاتے کندھے پر Strap کا نشان بن گیا تھا۔ ذرا سوچیے! کیا ہماری بیٹی ایسی مشقت کر رہی ہے۔ کیا وہ ایسی تکلیف میں سے گزر رہی ہے؟ صرف اِس وجہ سے ہم دُعا کرنے والوں کے پاس دوڑے جاتے ہیں کہ ہماری اولاد کی مشکل زندگی ذرا آسان ہو جائے حالاں کہ بات صرف اِتنی سی ہے کہ ہماری بچی کی ساس کسی وقت اُسے کوئی طعنہ دے دیتی ہے یا اُس کا شوہر کبھی ذرا اُس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ بی بی صاحبہؓ سے زیادہ فاقے کس نے کیے ہیں؟

یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہم دعویٰ تو کرتے ہیں آپ ﷺ کے اُمتی ہونے کا لیکن ہم مانگتے آسان دُنیا ہیں۔ ہم دُنیا فرعون کی سی اور آخرت موسیٰ علیہ السلام کی سی چاہتے ہیں۔

زندگی میں آسانیاں حاصل کرنے کے لیے پہلے محنت، کوشش اور تدبیر کرنی چاہیے پھر اُس تدبیر کو دُعا سے Supplement کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے اِس Attitude کو بہتر کر کے مومن کا سا بنا لیا تو ہماری جان دُعا کرنے والوں سے چھوٹ جائے گی۔ پھر پیر صاحب کو روزی کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا ہوگا۔

تدبیر کی Value اپنی جگہ ہے لیکن ہمارا بہترین رویہ یہ ہوگا کہ ہم ایک سچے مومن کی طرح رب تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور کام لے کر پوری محنت کر لیں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ یاد رکھیں! اِس معاملہ میں ڈیوٹی کی ایک بہت Clear cut تقسیم (Division) موجود ہے۔ رب تعالیٰ نے انسان کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور عقل کو بروئے کار لا کر بھرپور کوشش کر لے تو وہاں انسان کا فرض پورا ہو گیا...... اور پھر رب تعالیٰ کی ذمہ داری شروع ہو گئی کہ وہ آپ کو آپ کی محنت کا انعام عطا فرما دے۔ رب تعالیٰ کبھی کسی کی محنت کا اجر اُدھار نہیں رکھتا بلکہ اُسے ضرور اُس کا اجر عطا فرماتا ہے۔

اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہماری کوشش کا نتیجہ ہماری خواہش کے برعکس نکلے تو ہم مایوس ہونے کی بجائے جان لیں کہ اس میں یقیناً اللہ نے ہمارے لیے کوئی بہتری رکھی ہے کیونکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے بڑھ کر مخلوق سے پیار کرنے والا اور اُس کا بھلا چاہنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے کوشش کا نتیجہ مرضی کے برعکس نکلنے پر ہمارا یقین ہونا چاہیے کہ یقیناً اس میں ہمارے لیے بہتری ہے۔ پھر ہم دل میں کسی بھی ملال کو جگہ دینے کے بجائے نئے سرے سے محنت کرنے میں مگن ہو جائیں۔ اگر ہم نے یہ رویہ اپنا لیا تو پھر کبھی نہ تو مایوسی ہمارے قریب پھٹکے گی...... نہ کبھی ہم پریشان نظر آئیں گے۔

تدبیر کا رول ہماری زندگی میں بہت اہم ہے۔ تقدیر مبرم (معین) اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ عزت، ذلت، زندگی اور موت، رزق اور اولاد سب تقدیر مبرم کا حصہ ہیں۔ یہ عزت اور ذلت کا معاملہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ اس دُنیا میں اکثر جھگڑے اس بات پر ہوتے ہیں کہ فلاں نے میری بڑی بے عزتی کر دی...... حالاں کہ ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں ہے کہ تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے۔ جب تمام عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے تو پھر گلہ کس بات کا۔

ایک عجیب بات ہے کہ انسان تین باتوں کی وجہ سے غلط کام پر مجبور ہوتا ہے:

- ہمیں کوئی گن پوائنٹ پر غلط کام پر آمادہ کرے تو ہم اپنی جان بچانے کے لیے وہ غلط کام کر گزریں گے۔
- ہم باس کا غلط حکم اس وجہ سے مان لیں گے کہ کہیں ہماری جاب نہ جاتی رہے اور ہمارا رزق بند نہ ہو جائے۔
- کوئی انسان ہمیں بے عزت کرنے کا ڈراوا دے کر ہم سے غلط کام کروالے۔

یہ وہ تین قسم کا جبر ہے جس کے تحت ہم غلط کام پر آمادہ ہو جاتے ہیں...... حالاں کہ ہم اپنے ایمان کے مطابق ان تینوں چیزوں یعنی موت، رزق اور عزت کو من جانب اللہ مانتے ہیں۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ رازق رب ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی رزق نہ دے سکتا ہے، نہ اُس کی مرضی کے بغیر کوئی ہم سے رزق چھین سکتا ہے۔ جب یہ ایمان ہے تو پھر باس کا خوف کیوں؟

اگر میرا وقت معیّن نہیں آیا تو کوئی لاکھ کوشش کرے، مجھے مار نہیں پائے گا۔ میرا رب مجھے بچالے گا۔ لیکن اگر وقت معیّن آن پہنچا ہے تو کسی کی مجال نہیں کہ مجھے بچالے۔ پھر موت کا خوف کیوں؟ مجھے کہنا چاہیے کہ میں غلط کام نہیں کروں گا۔ تم نے گولی مارنی ہے تو مار دو۔ اگر میری موت کا وقت نہیں آیا تو میرا رب مجھے بچالے گا۔ اور اگر وقت آ گیا ہے تو کوئی مجھے نہیں بچا سکے گا۔

تیسرا خوف یہ ہوتا ہے کہ بے عزت کرنے کی دھمکی دے کر کوئی شخص ہم سے غلط کام کروالیتا ہے حالانکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ عزت اور ذلت من جانب اللہ ہے۔

ہمارے قول وفعل کا یہ تضاد زندگی کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ ہم ہر چیز کے بارے میں ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے...... لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ڈرتے ہم لوگوں سے ہیں۔ ہمارا رویہ اس بات کو Indicate کرتا ہے کہ ہمارا ایمان محض زبان تک محدود ہے...... دل تک نہیں اُترا۔

ہم زبان سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے...... وہ عالم الغیب ہے...... دلوں کے بھید سے آگاہ ہے...... ازل سے ابد تک تمام معاملات جانتا ہے...... ظاہر و پوشیدہ سب اللہ کے علم میں ہے...... رب تعالیٰ ہماری والدہ سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے...... وہ بن مانگے ہماری ضرورت سے زیادہ ہمیں عطا فرماتا ہے...... وہ اُن کو بھی عطا فرماتا ہے جو اُسے برا بھلا کہتے ہیں...... جو اُسے مانتے ہی نہیں...... وہ اُن کو بھی رزق عطا فرماتا ہے جو شرک کرتے ہیں...... وہ اُن کا بھی رازق ہے جو مسلمان ہیں۔ ہم ان سب باتوں پر یقین رکھتے ہیں لیکن اِس کے باوجود رزق کی فراوانی کے لیے دُعا کرنے والے کے پاس بھاگے چلے جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ وہ کس سے دُعا کرے گا۔

ہمارے Employer (آجر) کی حیثیت ایک ڈاکیے سے زیادہ نہیں۔ میرا رازق رب اُوپر بیٹھا ہے جو ہر ماہ مجھے میرا رزق روانہ کرتا ہے اور میرا Employer ایک پوسٹ مین کی حیثیت سے ہر کیم کو مجھے وہ منی آرڈر دے دیتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ اگر آپ کے والد، بھائی یا بیٹا امریکہ میں ہیں تو وہ ہر مہینے ایک خاص رقم منی آرڈر کرتے ہیں۔ یہ رقم ڈاک خانہ میں آتی ہے وہاں سے ڈاکیا وہ رقم وصول کر کے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اِس میں آپ کو پوسٹ مین کا زیرِ احسان ہونے یا اُس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر پوسٹ مین آپ کو تنگ کر رہا ہے...... وقت پر منی آرڈر Deliver نہیں کرتا تو آپ امریکہ میں موجود اپنے رشتہ دار کو فون کر دیجیے کہ صاحب! آئندہ آپ مجھے رقم منی آرڈر کرنے کے بجائے بینک کے ذریعے ٹرانسفر کر دیجیے گا۔ یوں پوسٹ مین تبدیل ہو گیا۔ پیسہ رُکا نہیں بلکہ بینک کے ذریعے آپ کو ملنے لگا۔ پھر خوف کس بات کا......؟ ہاں Employer کو میں Due respect ضرور دوں گا لیکن میں اُس سے کسی قیمت پر خوف زدہ نہیں ہو سکتا...... کیونکہ میرے نزدیک Employer صرف ایک پوسٹ مین ہے جو میرے رازق رب کے ارسال کردہ میرے حصے کا رزق ہر کیم کو میرے حوالے کر دیتا ہے۔ پوسٹ مین تبدیل بھی ہو گیا تو بھی رزق آتا رہے گا۔ پھر رزق کے بند ہو جانے کے خوف سے ہم غلط کام کیسے کر لیتے ہیں......؟ اِسی طرح جان کے خوف کے تحت ہم غلط کام کرنے پر کیوں کر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ جب کہ ہمارا ایمان ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ موت کا طریقہ، وقت اور مقام بھی معین ہے۔ وہ رب جو بن مانگے ہماری ضرورت سے زائد ہمیں عطا کرتا ہے...... وہ رب جو ہماری والدہ سے ستر گنا زیادہ ہم پر مہربان ہے...... اُس رب کو آپ کسی صاحبِ دُعا کے ذریعے ایک Reminder دلانا چاہتے ہیں۔ حیثیت کیا ہے اُس دُعا کرنے والے کی۔ ہم یہ سب اِس لیے کرتے ہیں کیونکہ

We all believe in Allah but we don't trust Him.

اِس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جہاں ہم یہ Comparison کر رہے ہیں کہ رب ہماری ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے وہاں کبھی ہم نے بچپن سے لے کر اب تک کبھی ایک لمحے کے لیے بھی سوچا کہ ہم گھر جائیں گے تو ہماری والدہ ہمیں کھانا نہیں دیں گی...... ہمارا خیال نہیں رکھیں گی...... ہماری غیر موجودگی میں ہمیں

Defend نہیں کریں گی...... ہم گھر جائیں گے تو اُنھوں نے ہمارے لیے بستر ٹھیک کر کے نہیں رکھا ہوگا...... کھانا تیار نہیں کیا ہوگا۔ میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں سے کبھی کسی شخص نے پڑوس میں جا کر نہیں کہا ہوگا کہ آپ میری والدہ سے سفارش کر دیں کہ وہ مجھے کھانا دے دیں۔ جب ہم اپنی والدہ کی محبت، خیال اور توجہ کے حصول کے لیے کسی سے سفارش نہیں کرتے تو وہ ہستی جسے ہم اپنی والدہ سے ستر گنا زیادہ مہربان مانتے ہیں اُس کے لیے کسی صاحب دُعا کے پاس سفارش کرانے کیسے چلے جاتے ہیں۔ اِس شک میں مبتلا کیوں رہتے ہیں کہ پتا نہیں رب میرا یہ کام کرے گا یا نہیں مجھے رزق دے گا یا نہیں دے گا۔ (معاذ اللہ)

المیہ یہ ہے کہ

We trust our mothers but we don't trust Allah.

دل میں یہ Trust پیدا کر لیجیے کہ اللہ واقعی ایسا ہے جیسا ہم زبان سے کہتے ہیں...... پھر انسان کو کسی صاحب دُعا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایسے میں انسان کسی صاحب دُعا کے پاس اگر جائے گا تو دُعا کرانے نہیں بلکہ اُس سے علم اور روشنی لینے کے لیے...... کیونکہ جب علم اور روشنی حاصل ہو گئی تو پھر رب کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ جب قربِ الٰہی حاصل ہو گیا تو دل سے یہ خیال ہی نکل جائے گا کہ میرا کوئی کام ہوا یا نہیں۔ تب انسان اپنے سارے معاملات اور کام اللہ کے حوالے کر دیتا ہے...... یوں اُس کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر Trust (بھروسا) پیدا کرنے کا ایک بہت Effective (مؤثر) طریقہ ہے۔ جس جس نے اِس پر عمل کیا اِس کا رب پر بھروسا پوری طرح Develop ہو گیا۔ طریقہ یہ ہے کہ رات کو جب بھی فرصت ملے بستر پر لیٹے ہوئے یہ سوچیے کہ میں زندگی میں کب کب مایوس ہوا کہ میرا یہ کام نہیں ہو پائے گا لیکن رب نے وہ کام غیب سے کر دیا۔ میں کب کب مایوس ہوا کہ میری یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکے گی لیکن غیب سے وہ ضرورت پوری ہو گئی۔ کب کب میں نے یہ توقع رکھی کہ اِن Failures (ناکامیوں) میں میری Success (کامیابی) نہیں ہو سکے گی لیکن رب تعالیٰ نے غیر متوقع طور پر اِن Failures کو Success میں تبدیل کر دیا جب ہم بار بار اُن مہربانیوں کو سوچتے ہیں تو یقین آنے لگتا ہے کہ رب واقعی اُسی طرح مہربان ہے جس طرح ہم زبان سے اُس کی مہربانی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وہ بغیر یہ دیکھے کہ آیا ہم اُس کے سامنے ماتھا رگڑتے ہیں یا نہیں، ہمیں نوازتا اور عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ یقین آ جانے کے بعد ہمارا رب پر بھروسا پیدا ہو جائے گا تب ہم انسانوں کی محتاجی سے باہر نکل آئیں گے۔ اس کے بعد ہمیں کسی عامل کے پاس جا کر یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ مجھے کوئی ایسا تیر بہدف تعویذ دے دیجیے جس سے میرے دشمن کا بیڑا غرق ہو جائے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ الفاظ کہنے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے پہلے انسان کو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ رب پر بھروسا پیدا ہو جانے کے بعد ہمیں لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو مارنا نہیں پڑے گا اور ہم اپنی نظروں میں خود گرنے سے بچ جائیں گے۔ اگر آپ وافر مقدار میں رزق، عزت، آسانیاں اور سہولتیں حاصل

کرنا چاہتے ہیں تو میری ایک گزارش پر عمل کر کے دیکھ لیجیے......شاید رب تعالیٰ آپ کے دلوں کو پھیر دے......کیونکہ میرا ایمان یہ ہے کہ اس طریقے کا نتیجہ سو فی صد آتا ہے......کبھی اس میں Failure نہیں آتا۔

رب تعالیٰ سے کچھ لینے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے لیے کبھی کچھ نہ مانگیے۔ ہمیشہ اپنے دشمنوں کے لیے خیر، تندرستی، عزت اور وسیع رزق مانگیے۔ اُن کی بھلائی کی گڑگڑا کر دُعا مانگیے ''یا باری تعالیٰ! فلاں بندے پر تو مہربانی فرما! اگر اُس سے کوئی غلطی یا کوتاہی ہوگئی ہے تو تو اُسے معاف فرما دے۔ اُس پر مہربانی فرما اور اُس کے کام کر دے۔'' میں یہ تو نہیں جانتا کہ آپ کے دشمن کو یہ سب کچھ ملے گا یا نہیں لیکن آپ کو وہ سب کچھ ضرور مل جائے گا جو آپ نے اس کے لیے مانگا ہے۔

پچھلے دنوں معلوم نہیں کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ میرا وقت شاید کچھ زیادہ نہیں رہ گیا۔ ساتھ ہی دھیان آیا کہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ سوچتا رہا کہ ایسا کون سا عمل کیا جائے کہ میرے گناہوں کی سیاہی دُھل جائے۔ تب ایک ہی طریقہ سمجھ آیا کہ جب وہ میرا نامۂ اعمال دینے لگے تو میں ہاتھ جوڑ کر رب سے گزارش کروں گا ''یا باری تعالیٰ! تو مجھے یہ نامۂ اعمال نہ پکڑا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اِس نامۂ اعمال میں گناہوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہیں۔ تو دلوں کے بھید اچھی طرح جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں گناہ گار ہوں لیکن تو یہ بھی جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ سچے دل سے تجھے اپنا رب اور اپنے آپ کو تیرا ادنیٰ غلام جانا ہے...... بس اسی کے صدقے تو مجھے بخش دے۔''

میرا ایمان ہے کہ رب اتنا رحیم و کریم ہے کہ اِس کے صدقے مجھے بخش دے گا۔ یہ سب سوچ کر مجھے قدرے تسلی ہوئی کہ اب مر جانے میں کوئی حرج نہیں۔

بھائیو! تھوڑا اِس طریقے پر عمل کر کے دیکھ لیجیے کہ اپنے آپ کو بھول جائیے اور رب تعالیٰ سے اپنے دشمنوں کے لیے بہترین چیز مانگیے۔ خود بھوکے رہ لیجیے لیکن اپنے دشمنوں کو کھانا کھلا دیجیے۔ خود پھٹے کپڑے پہن لیجیے لیکن اپنے دشمنوں کو نیا لباس پہنا دیجیے۔ اپنے بچوں کی فیسیں بھلے نہ دیجیے اُن کا نام سکول سے کٹ لینے دیجیے لیکن دشمن کے بچوں کی فیس چپکے سے جا کر جمع کرا آیئے پھر دیکھیے کہ رب تعالیٰ آپ کو کیسے Look after کرتا ہے۔ آپ کا دل کیسے آئینے کی طرح چمکنے لگتا ہے اور رب تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں کس طرح آپ پر نازل ہونے لگتی ہیں۔

سوال: رب تعالیٰ کے غضب اور ناراضی سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر چھوٹے کتے پر بڑے سائز کا کتا حملہ کر دے تو وہ چھوٹا کتا فوراً زمین پر اُلٹا لیٹ جاتا ہے اور گردن جھکا کر پاؤں اُوپر کر لیتا ہے۔ اصل میں وہ اُس بڑے کتے کے سامنے اپنا throat آفر کر رہا ہوتا ہے۔ وہ Total submission میں جا کر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ میں نے Surrender کر دیا...... میں تمھارے ساتھ لڑائی نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ جونہی چھوٹا کتا بڑے کتے

کے حملے کے جواب میں اپنا Throat آفر کرتا ہے تو بڑا کتا وہیں رُک جاتا ہے اور اُسے کاٹتا نہیں۔

طاقت ور سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ One should offer one's throat کہ لو! پڑا ہوں......کردو ذبح۔

رب تعالیٰ کے غضب اور ناراضی سے بچنے کا بھی ایک طریقہ یہی ہے کہ بجائے اس کے کہ میں رب کے سامنے کوئی Argument (دلیل) دوں، نیکیوں کا حوالہ دوں...... میں اللہ کے سامنا اپنا Throat آفر کر دوں کہ لو۔ میں بے بس پڑا ہوں۔ کردو مجھے ذبح۔

"یا باری تعالیٰ! تو مجھ پر رحم فرما دے۔" اس جملے میں میں نے ایک Confession بھی کر لیا کہ میں نے بے پناہ گناہ اور قصور کیے ہیں...... میں تیرا مجرم ہوں کیونکہ مجرم ہی رحم مانگے گا۔ اپنے مجرم ہونے کے Confession کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی بے کسی اور بے بسی کا اقرار بھی کر لیا کہ یا باری تعالیٰ! میں نے بے پناہ گناہ تو کیے ہیں۔

But I have nothing to defend.

میں اپنے گناہوں کے دفاع میں رب کے سامنے کوئی Argument اور Justification پیش نہیں کر پاؤں گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ میں رب تعالیٰ کے سامنے اپنی بے کسی کا اظہار کر کے دراصل اپنے عاجز ہونے کا اقرار کر رہا ہوں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ میں رب تعالیٰ سے نہ اُس کا انصاف مانگ رہا ہوں نہ اُسے دلیل دے رہا ہوں کہ میری سزا اتنی بنتی ہے، اتنی دے دے۔ میں تو Simple کہہ رہا ہوں کہ تو مجھ پر رحم کر دے۔ یوں ایک جملے میں میں نے اپنی عاجزی، بے کسی، مجرم ہونے اور اس کی Justification نہ ہونے کا اقرار کر لیا۔

ایک بہت پرانا قصہ ہے جو میں آج تک نہیں بھول پایا۔ 76-1975ء میں گورنمنٹ Corolla امپورٹ کر کے سرکاری ملازمین کو دیتی تھی۔ میرے پاس بھی وہی گاڑی تھی۔ میں اُس گاڑی میں نہر کے کنارے کسی کام سے جا رہا تھا۔ اُس زمانے میں نہر کے کنارے ریلوے کراسنگ بہت زیادہ تھے۔ یہ ریلوے کراسنگ روڈ لیول سے قدرے اُونچے تھے۔ جب پھاٹک بند ہوتا تو ٹریفک بلاک ہو جاتی لیکن سائیکل سوار اپنے سائیکل کندھوں پر اُٹھا کر ریلوے لائن پار کر لیا کرتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں پھاٹک پر رُکا ہوا تھا۔ قریبی سکول میں بچوں کو چھٹی ہو جانے کی وجہ سے کافی زیادہ رش تھا۔ میری مخالف سمت میں ایک مولانا صاحب نے اپنی سائیکل اُٹھائی، پھاٹک کراس کیا اور سوار ہو کر چل دیے۔ اُونچے پھاٹک سے نشیبی سڑک کو Link کرنے کے لیے ڈھلان کافی زیادہ تھی۔ وہ صاحب تیزی سے اُس ڈھلان سے نیچے اُتر رہے تھے لیکن اُن کا دھیان آگے کے بجائے مسلسل پیچھے کی طرف تھا جہاں وہ کسی کو فوکس کیے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ہارن دینے کے باوجود اُن کی سائیکل خاصی سپیڈ کے ساتھ میری گاڑی سے آ ٹکرائی۔ میں چونکہ اپنی گاڑی میں بیٹھا کافی دیر سے اُن مولانا صاحب کو Observe کر رہا تھا اس لیے اس ساری سچویشن اور اُن

صاحب کی حد درجہ محویت پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ وہاں کھڑے پولیس مین نے جب دیکھا کہ سرکاری گاڑی ہے اور اُس میں بیٹھا بندہ ہنس رہا ہے تو اُس نے اُن صاحب کو پولیس لینگویج میں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اُن مولانا صاحب سے کہا کہ آپ سائیکل آگے کو چلا رہے تھے یا پیچھے کو جہاں آپ دیکھ رہے تھے۔ میں نے یہ کہا اور ہنس کر بات ٹال دی۔ اتنی دیر میں پھاٹک کھل گیا۔ میں نے اُسے کراس کیا اور دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ زیادہ ٹریفک کی وجہ سے میری گاڑی آہستہ آہستہ آگے کو رینگ رہی تھی۔ اُن دنوں چونکہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں کم ہوتی تھیں اس لیے میری گاڑی کے بھی نان ایئر کنڈیشنڈ ہونے کی وجہ سے شیشے نیچے تھے۔ اچانک میں دیکھتا ہوں کہ ونڈو سے ایک ہاتھ اندر آیا ...... میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر اُس شخص نے کہا ''باؤ جی! میرا چکا ونگا ہو گیا اے۔'' میں نے سر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دائیں سمت دیکھا تو یہ وہی سائیکل والے مولانا صاحب تھے۔ مجھے چونکہ پنجابی کی زیادہ سمجھ نہیں آتی لہٰذا اُس سے پوچھا کہ یہ چکا کیا ہوتا ہے؟ اُس نے کہا ''جیہدے تے ٹیر (Tyre) چڑھیا ہوندا اے۔'' میں نے کہا اچھا اچھا! رِم ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ وہ صاحب بولے ''باؤ جی! دس روپے دے دیو اوہ چکا سدھا کرانا ایں۔'' میں نے کہا ''حضور! ایک بات تو بتایئے یہ رِم آپ کی جس حرکت کے جواب میں ٹیڑھا ہوا ہے، اُس میں قصور میرا تھا یا آپ کا؟'' تب اُس نے ایک خوب صورت بات کہی جس کی وجہ سے یہ سارا واقعہ میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ کہنے لگا ''باؤ جی! چھڈو، قصور تہاڈا اسی یا میرا۔ میرا چکا ونگا ہو گیا، میں اوہنوں سدھا کرانا اے، تسی بس مینوں دس روپے دے دیو۔'' (باؤ جی! چھوڑیں کہ قصور آپ کا تھا یا میرا۔ بس میری سائیکل کا رِم ٹیڑھا ہو گیا ہے جسے میں نے سیدھا کرانا ہے، آپ مجھے دس روپے دے دیں۔) اُس کی اِس خوب صورت بات پر میں نے اپنے والٹ سے پچاس روپے نکال کر اُسے دیے اور کہا کہ آپ چکا سیدھا نہ کرائیں بلکہ نیا ڈلوالیں اور باقی پیسوں سے میری طرف سے مٹھائی کھا لیجیے گا۔

اُن صاحب کا یہ جملہ بہت کمال تھا کہ ''اس کو چھوڑیئے کہ قصور کس کا تھا ...... میرا یا آپ کا ...... میرا چکا ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ دس روپے دے دیں میں نے اُسے سیدھا کرانا ہے۔''

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس چکر میں پڑنے کی بجائے کہ قصور کس کا تھا ...... بس یہ کہا کریں کہ ''یا اللہ! رحم کر دے۔'' آپ تقدیر اور تدبیر کے چکر میں نہ پڑیں۔ بس اس فکر میں پڑیں کہ ہم سے جگہ جگہ کوتاہیاں اور گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم تقدیر اور تدبیر کے چکر میں پڑے رہے تو اللہ کے ہاتھوں پٹتے رہیں گے۔ بہتر ہے کہ ہم اللہ سے اُس کا رحم مانگ لیا کریں اور اگر ہمت ہو تو اِس سے اگلی ایک چیز بھی مانگ لیں کہ ''یا اللہ! تو ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرما دے۔''

In the first instance اللہ پاک رحم فرما کر ہمارے قصور معاف فرما دے گا۔ جب قصور معاف ہو گئے تو پھر اُس سے اُس کی رحمت مانگ لیجیے۔

میرے خیال میں اگر اُس نے ہم پر رحم فرما دیا اور پھر اپنی رحمتیں بھی نازل فرما دیں تو بیڑا پار ہے۔

سوال: آپ نماز کے بعد عموماً کیا دُعا مانگتے ہیں؟

جواب: اگر میں باجماعت نماز پڑھوں اور امامت میرے ذمہ ہو تو میں نماز کے بعد بڑی مختصر دُعا مانگتا ہوں "یا اللہ! تو ہم پر رحم فرما۔ یا اللہ! ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرما دے!" اگر تنہائی میں نماز پڑھوں تو اِس کے بعد یہ دُعا مانگا کرتا ہوں "یا باری تعالیٰ! مجھے نہیں معلوم کہ کون میرا مخالف یا حاسد ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص ہے تو تو اُس کے حال پر رحم فرما۔ اُس کے لیے بہتری کا سامان پیدا کر اور اُس کی زندگی آسان کر دے۔"

اسلام اور ہماری ترجیحات

ابھی تک Practically (عملی طور پر) یہ ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والا تو ذمہ داریوں کے بوجھ تلے آجاتا ہے لیکن بیعت لینے والے کی Duties کبھی کسی نے Define (بیان) نہیں کیں اور نہ ہی اُن ذمہ داریوں کو کماحقہٗ Discharge کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں بیعت لینے والے کی ذمہ داریوں پر بات کروں، میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ اُن چھوٹے چھوٹے Points پر بات کرنا زیادہ Productive (سودمند) ہے جن کو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ ہماری رُوحانی ترقی میں بہت بڑی رُکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں ہماری Sense of priorties (ترجیحات طے کرنے کی حس) بہت محدود ہے۔ کسی چیز کو کتنی اہمیت دینی ہے؟ یا اسلام میں کسی عمل کو اہمیت دینے کی وجہ کیا ہے؟ یہ سب ہم نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی سمجھنا چاہتے ہیں۔ نتیجتاً ہم بہت ساری چیزوں کو یا تو مطلوبہ اہمیت دیتے ہی نہیں یا پھر بعض اوقات اتنی زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں کہ اُن کی اصل رُوح چھپ جاتی ہے۔ اور اس کے بارے میں ایک ایسا تصور قائم ہو جاتا ہے جو ہم نے اپنے ذہن میں خود قائم کیا ہوتا ہے...... یوں کسی بھی شے کی اصل رُوح سے ہم محروم ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم اکثر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! میں تو انصاف سے چلتا ہوں...... انصاف کی بات کرتا ہوں۔ یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ ایک مسلمان معاشرے اور مومن کے لیے Dealings (معاملات) کا جو ادنیٰ ترین معیار ہے، ہم اُسے فخر کا باعث بنا لیتے ہیں۔ اسلام میں مومن کے لیے Fair dealings (درست معاملات) کی جو کم سے کم Requirement ہے وہ یہ ہے کہ انسان انصاف سے چلے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس ادنیٰ ترین معیار کو معراج سمجھ بیٹھے ہیں...... حالاں کہ مومن کے لیے مستحسن اور قابل تعریف معیار قربانی اور احسان کا ہے۔ جو سنت رب بھی ہے کیونکہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ احسان کا سلوک کرتا ہے اور ان دونوں یعنی ادنیٰ ترین معیار (انصاف) اور مستحسن قدم (قربانی و احسان) کے درمیان ''ایثار'' کی Dealing ہے۔ اِس کی مثال یوں ہے کہ کسی شخص کے ساتھ میرا معاہدہ ہوا کہ ہم مل کر کام کریں گے اور منافع ففٹی ففٹی ہوگا۔ جب منافع آتا ہے تو میں پوری دیانت داری سے حساب

کتاب کرتا ہوں۔ سو روپے منافع میں سے پچاس روپے میں اپنے پارٹنر کو دے دیتا ہوں اور پچاس خود رکھ لیتا ہوں..... یہ انصاف ہے۔ یہ وہ Minimum requirement ہے جو رب تعالیٰ ہم سے چاہتا ہے۔ لیکن اگر میں دیکھوں کہ میرے پارٹنر کو زائد رقم کی ضرورت ہے اور میرا گزارہ تو تیس (30) روپے میں بھی ہو جائے گا۔ میں اُسے اُس کا حق دینے کے ساتھ ساتھ بیس (20) روپے زائد دے دوں کہ بھائی! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے بڑا خوش ہوں، مجھے آپ سے لگاؤ ہے اِس لیے ستر روپے آپ رکھ لیجیے میرے لیے تیس روپے ہی کافی ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت مجھے خود بھی رقم کی ضرورت ہے لیکن اپنے پارٹنر کو شرمندگی سے بچانے کے لیے میں یہ کہانی بیان کرتا ہوں۔ یوں حق سے زیادہ ادا کرنا ''ایثار'' ہے۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ میرے پارٹنر کو اِس سے بھی زیادہ رقم کی ضرورت ہے تو میں اپنی ضرورت پس پشت ڈال کر اُسے نوے روپے دے دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کوئی بات نہیں میں کسی طرح گزارہ کرلوں گا..... دو کی بجائے ایک وقت کھانا کھالوں گا۔ یہ ''قربانی'' ہے۔ ''احسان'' کا سلوک ہے کہ اپنے ساتھی کی ضروریات کا احساس کر کے میں نے اپنا حق چھوڑ دیا۔ یہ سنتِ رب ہے۔ ایک مومن کو Dealings (معاملات) کے اسی معیار پر فائز ہونا چاہیے۔

اِس لیے میں کہہ رہا تھا کہ ہم بہت سے معاملات کے اصل معیار اور رُوح کو نہیں سمجھتے اور لاعلمی میں بہت سی اچھائیوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ایک اور Point یہ ہے کہ ہمارے ہاں رب تعالیٰ کی فرماں برداری اور اطاعت کے تصور کو عبادات تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک شخص ساری عمر نوکری اور دُنیاوی اُمور میں مصروف رہتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آخرت کی فکر کرتا ہے اور باجماعت نماز پر زور دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز دین کا ستون ہے، اولین عبادت ہے، قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے بارے میں پرسش ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نماز کی اہمیت تو سمجھتے ہیں لیکن اُس کی اصل رُوح سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہم نے کبھی بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ اُسے اِس قدر اہم قرار دینے کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ اگر ہم اُس حکمت کو جان لیں تو پھر ہم نماز پڑھیں گے نہیں بلکہ ادا کریں گے۔ ہم سبھی جانتے ہیں (لیکن سمجھتے نہیں) کہ نماز بُرائیوں سے روکتی ہے۔ یہی حکمت اِس میں پوشیدہ ہے۔ کہ جس نے نماز ادا کرنا شروع کی وہ برائی سے رک گیا۔ ایک بار صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یارسول اللہ ﷺ! ہمیں کس طرح پتا چلے کہ ہماری نماز رب تعالیٰ کے حضور قبول ہو رہی ہے یا نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر یہ تمھیں بُرائیوں سے روک رہی ہے تو قبول ہو رہی ہے..... ورنہ نہیں۔''

ہماری نظر صرف نماز پڑھنے پر ہے..... اس پر نہیں کہ وہ ادا یا قبول بھی ہو رہی ہے یا نہیں۔ کیونکہ نماز کی ادائیگی اور قبولیت کا معیار یہی ہے کہ وہ ہمیں بُرائیوں سے روک دیتی ہے۔ یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف نماز پڑھنے میں نہیں ہے۔ اگر صرف پانچ مخصوص اوقات میں نماز پڑھنا ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو پھر ہم یہ کیوں نہیں کرتے کہ ہم ہر وقت نماز ادا کریں۔ سورج طلوع ہوتے وقت ہم نماز کیوں نہیں

پڑھتے۔ نصف النہار یا غروبِ آفتاب کے وقت ہم نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ نماز جو اتنی اہم عبادت ہے یہ بھی ہم اُس وقت ادا کرتے ہیں جب اُس کو ادا کرنے کا حکم ہے اور اُس وقت نماز نہیں پڑھتے جن اوقات میں سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر عبادت کیا ہے؟ نماز؟ یا اللہ کے حکم کی تعمیل؟ اللہ کا حکم صرف نماز ہی تو نہیں ہے۔ روزے کی اتنی فضیلت اللہ تعالیٰ نے بیان کی کہ کسی اور عبادت کے بارے میں سوائے روزے کے یہ نہیں کہا کہ اس کا اجر میں خود دوں گا۔ لیکن اس قدر اہمیت کے باوجود عید کے روز ہم روزہ نہیں رکھتے کیونکہ رب نے اِس سے منع کیا ہے۔ پھر عبادت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا۔ یا دو چار احکامات کی پیروی کر کے باقی میں اپنی مرضی کرنا۔

Dos اور Don'ts کو Follow کرنا ہی اصل میں عبادت ہے۔ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا، اُس سے انسان رُک گیا اور جس کو کرنے کا رب تعالیٰ نے حکم، اُس کو کر لیا...... یہی عبادت ہے۔ اسی کے اندر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ آجائے گی۔ لیکن صرف یہ چار عبادات ہی تو عبادات نہیں۔ ان کے علاوہ جو اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں ہم عموماً اُن سے رُوگردانی کر جاتے ہیں کیونکہ اُن میں ہمیں قربانی کرنا پڑتی ہے۔

تصوف میں فرض عبادات پر تو زور دیا ہی جاتا ہے کیونکہ یہ پیغمبروں کو بھی معاف نہیں۔ تمام پیغمبر فرض عبادات کے پابند تھے اور آپ ﷺ سے زیادہ عبادت گزار کون ہو گا۔ فرض عبادات تو ہمیں کرنی ہی کرنی ہے...... لیکن یاد رکھیے کہ اِن عبادات کے ذریعے آپ کو پارسائی تو مل جائے گی لیکن رب نہیں ملے گا...... کیونکہ رب صرف نیکی سے ملے گا۔ عبادات سے صرف پارسائی جب کہ نیکی سے رب ملتا ہے۔ اور نیکی کی مختصر تعریف یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات، ضروریات، حقوق اور آرام کو پس پشت ڈال دے اور دوسروں کی خواہشات، ضروریات، حقوق اور آرام کو ترجیح دے۔ یہ ترجیح دینا ہی وہ نیکی ہے جس سے رب ملتا ہے۔

اگر آپ تصوف کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو عبادات کے ساتھ نیکی کی راہ بھی پکڑ لیجیے۔ دوسروں کے لیے اپنے آپ کو قربان کرنا شروع کر دیجیے...... اِس سے رب کا قرب اور دوستی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اگر آپ دوسروں کے لیے کچھ کرتے ہیں تو اُس میں اوّلین شرط رازداری کی ہے۔ ایسی تمام Dealings (معاملات) کو اپنے اندر دفن کر دیں۔ اُن کا ذکر کبھی ہماری زبان پر نہ آنے پائے۔ ہماری کسی حرکت حتیٰ کہ آنکھ کے تاثر تک سے اُس کا اظہار نہ ہونے پائے۔

اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے فرض عبادات سو فی صد پوری کرنی ہیں اور اُس کے ساتھ نیکی پر Major emphasis رکھنا ہے۔ پھر رب آپ کا ہے۔ لیکن اگر میں نیکی پر Major emphasis (خاص زور) نہیں دے سکتا تو پھر مجھے تصوف کی راہ سے ہٹ جانا چاہیے۔

ایک بار ایک کانفرنس کے سلسلے میں مجھے پشاور جانا تھا۔ قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''جہاز پر جاؤ گے یا گاڑی پر؟'' میں نے عرض کیا ''کار پر جاؤں گا۔'' فرمانے لگے ''میں بھی چلتا ہوں۔'' پشاور میں ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ فجر کی نماز کے بعد میں مرشد صاحب کے کمرے میں گیا تاکہ جان سکوں کہ

وہ رات بھر Comfortable تو رہے۔ اس دوران وہ اپنے حوالے سے کچھ بتانے لگے۔ پھر اچانک گفتگو روک کر مجھے مخاطب کیا" آج میں تمھیں ایک نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا ظاہر ہمیشہ ایسا بنائے رکھنا کہ لوگوں کو کبھی تمھارے باطن کی خبر نہ ہونے پائے اور لوگ تمھیں بُرا بھلا ہی کہتے رہیں۔"

سوچنے کی بات ہے کہ وہ لوگوں سے مجھے بُرا کہلوا کر خوش تو نہیں ہو سکتے تھے۔ اُن کی اس نصیحت میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ لوگوں کو میرے باطن کی اس لیے خبر نہ ہوتا کہ وہ مجھے جھک جھک کر سلام نہ کریں اور یوں میرا نفس پھلنے پھولنے سے بچ جائے اور میں تکبر سے محفوظ رہوں۔

چونکہ اُن دنوں مجھے نیا نیا علم ملا تھا اور اُس کا بہت زور تھا۔ ایک روز میں اسلام آباد منسٹری میں میٹنگ کے لیے جا رہا تھا۔ تب گوجرانوالہ سے ذرا پہلے لیفٹ کو راولپنڈی بائی پاس نئی نئی بنی تھی لیکن ابھی اُس کا افتتاح نہ ہونے کی وجہ سے اُس پر ٹریفک نہ تھی...... میں نے اُس سڑک سے اسلام آباد جانے کا ارادہ کیا۔ راستے میں دُور دُور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ایک ویرانے کے پاس پہنچ کر میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور کھیتوں میں موجود آدمیوں کے پاس جا کر کہا کہ مجھے یہاں گہرائی میں دو کنال زمین چاہیے۔ وہ حیران ہوئے کہ محض دو کنال زمین پر کاشت کاری تو ممکن نہیں پھر میں اِتنی سی زمین لے کر کیا کروں گا۔ مزید یہ کہ برلب سڑک زمین لینے کی بجائے میں آگے گہرائی میں زمین کیوں لینا چاہتا ہوں۔ میں نے مدعا عرض کیا کہ یہاں ویرانے میں دو کمرے اور چار دیواری بنا کر میں ہفتہ دس دن کے لیے یہاں آیا کروں گا اور اللہ اللہ کیا کروں گا۔ میری یہ خواہش جان کر اُنھوں نے کہا کہ آپ زمین کا مطلوبہ ٹکڑا تحفتاً مفت میں لے لیجیے تاکہ ہمیں بھی ثواب مل جائے۔

اسلام آباد سے واپسی پر میں مرشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑی خوشی سے کہا" حضور! لاہور سے تقریباً 45 کلومیٹر دور مجھے ویرانے میں دو کنال جگہ مل گئی ہے۔ آپ بھی چلیے۔ وہاں جا کر رہتے ہیں۔ زندگی گزارتے اور اللہ اللہ کرتے ہیں۔" میری یہ بات سن کر وہ بگڑ کر کہنے لگے" تم زندگی کی آسان راہیں ڈھونڈتے ہو؟ یہ کیا کمال ہے کہ تم دُنیا کو چھوڑ کر ایک کونے میں جا کر اللہ اللہ کرو۔ یہ تو بہت دُنیا کر لیتی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں رہتے ہوئے تم بھرپور دینی اور دُنیاوی زندگی گزارو۔ یاد رکھو! دین اور دُنیا کو بیک وقت ساتھ لے کر چلنا ہی کمال ہے۔"

یہ بھی وہ Point (نکتہ) ہے جسے ہم جانتے ضرور ہیں لیکن اس کی رُوح کو سمجھتے نہیں۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہم سب کو ازبر ہے...... لیکن ہم نے کبھی اُسے اِس زاویہ سے نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ سے بڑھ کر نیک اور اللہ تعالیٰ سے قریب کون ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ ﷺ نے دُنیاوی زندگی گزاری، رشتہ داریاں اور دوستیاں نبھائیں، حکومت کی، جنگیں لڑیں، تجارت کی۔ یہودیوں سے قرض لیا اور واپس کیا۔ کون سا دُنیاوی کام ہے جو آپ ﷺ نے نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دُنیا کو بھی نبھایا اور کیا خوب نبھایا۔

ذرا غور کیجیے۔ سنت کیا ہے......؟ افضل کیا ہے......؟ ہماری اپنی سوچ کے تحت کیے جانے والے کام یا وہ عمل جو آپ ﷺ نے کیا۔ یقیناً آپ ﷺ کا عمل افضل ہے اس لیے ہم اُس کی آنکھیں بند کر کے پیروی کر لیں۔ بھرپور دُنیاوی زندگی گزارتے ہوئے رب تعالیٰ کی راہ پر چلنا ہی کمال ہے۔ اس میں بلاشبہ بہت دشواریاں ہیں لیکن اِن دشواریوں کے باوجود آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہی کمال ہے۔

ہمارے دانش ور اور لیڈرز جب محفلوں میں بیٹھتے ہیں تو حضرت عمرؓ کے دور کو بہترین اور سنہرا قرار دیتے ہیں لیکن کیا ہم میں سے کبھی کسی نے اس پر غور کیا کہ اُس کے سنہرا ہونے کی وجہ کیا تھی؟ جب حضرت عمر فاروقؓ نے حکومت Take over کی تو مسلمانوں میں کوئی زکوٰۃ دینے والا نہیں تھا اور جب حضرت عمرؓ نے شہادت پائی تو اُس وقت زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ ٹرانسفارمیشن 180 ڈگری Opposite گئی ہے۔ اِتنے تھوڑے عرصے میں اتنی بڑی ٹرانسفارمیشن کیسے ہوگئی یہ ہم نے کبھی نہیں سوچا......!

اگر ہم حضرت عمر فاروقؓ کے دور کو Examine کریں تو ایک حیران کن بات سامنے آتی ہے کہ حضرت عمرؓ اور اُن کے بعد آنے والے تمام حکمرانوں میں فرق یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کا ایک بنیادی اُصول پوری قوت کے ساتھ Implement کیا۔ اُس میں کوئی ہلکا سا جھول یا Relaxation نہیں آنے دی۔ کسی کی بھی غلطی، کوتاہی یا گناہ کو Unpunished نہیں رہنے دیا...... بغیر یہ دیکھے کہ غلطی کرنے والا بیٹا ہے، پرانا ساتھی یا معتبر صحابی ہے...... سب کے لیے مواخذہ کا یکساں معیار رکھا اور جب بھی کسی نے اچھا کام کیا خواہ وہ دشمن ہی تھا تو اُسے reward ضرور دیا۔

یہ Management کا ایک Simple principle (سادہ اُصول) ہے...... جسے ہم بھی پڑھتے ہیں لیکن exercise نہیں کرتے۔ یہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن پر واہ واہ کرنے کے بجائے اگر ہم اِن کی اصل رُوح کو سمجھ کر اِن کو Implement کریں تو مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ پھر ہم نظر رکھیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں اس کا اصل مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ مثلاً ہم اللہ کا حکم سمجھ کر تمام پروٹوکولز کے ساتھ نماز ادا کریں لیکن ساتھ اس پر بھی نظر رکھیں کہ آیا نماز ہمیں بُرائی سے روک رہی ہے یا نہیں؟ ہمیں نیکی کی طرف لے جا رہی ہے یا نہیں؟ اگر ہم نیکی کی طرف نہیں جا رہے تو نماز کا قصور نہیں بلکہ ہمارا ہے کہ ہم نماز صحیح انداز میں ادا نہیں کر رہے۔

اِسی طرح یہ مت سمجھ لیجیے کہ فرض عبادات کی ادائیگی کے بعد شاید ہم نے اللہ کے احکامات کی پوری طرح اطاعت کر لی۔ یاد رکھیے! اسلام کو ہم By parts نہیں لے سکتے۔ گزشتہ 25 برس سے Banking system in Islam زیرِ بحث ہے۔ ایک School of thought یہ بھی ہے کہ اسلام میں کوئی فنانشل سسٹم ہے ہی نہیں۔ پرابلم صرف ایک جگہ آتی ہے کہ ہم زندگی میں Pick and choose کے عادی ہو گئے ہیں۔ مذہب میں بھی ہم Selective ہو گئے اور جو احکامات ہمیں Suit کرتے ہیں اُن کو فوراً اپنا لیتے ہیں اور جو Suit نہیں کرتے اُن کے لیے دلیل ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

ہم اسلام کے جتنے حصے کو سمجھتے ہیں، اُس کو اسلام کہتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو in toto نہیں سمجھیں گے...... برقعے کی طرح خود پر اوڑھیں گے نہیں، اس کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کے تمام Systems (نظام) Well-integrated اور Independent (خود مختار) ہیں۔ اسلام میں پینل کوڈ اِسی لیے سب سے آخر میں آیا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دُنیا کا مختصر ترین پینل کوڈ ہے۔ اس سے مختصر سزائیں کسی پینل کوڈ میں ہیں ہی نہیں۔ آپ اُنگلیوں پر انھیں گن لیجیے۔

اسلام کی بنیاد انسان کے قلب کی تبدیلی پر رکھی گئی ہے۔ اسلام پہلے انسان کے قلب اور Thinking (سوچ) کو تبدیل کرتا ہے۔ گناہ اور غلط کاموں کے خلاف انسان کے اپنے اندر پولیس مین بیٹھتا ہے۔ جب کہ ہم اسلام کو Implement کرتے ہوئے پینل کوڈ پہلے لے آتے ہیں۔

دُنیا کا کوئی قانون مجھے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جھوٹ چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسلام جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے تو کیا آپ جھوٹ بولنے والے کے خلاف ایک Ordinance (قانون) بنائیں گے کہ میں گھر میں بچوں کے ساتھ جھوٹ نہ بولوں، کہ بیٹا! جب کوئی ملاقاتی آئے تو کہنا کہ ابو تو گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن جب اندر سے قلب تبدیل ہو جائے گا تو ماں باپ سے اچھا سلوک کرا دے گا، پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھنے پر مجبور کر دے گا، جھوٹ بولنے سے منع کرا دے گا۔

قلب اُسی وقت تبدیل ہو گا جب اسلام سمجھ میں آ جائے گا۔ جب اسلام کی سمجھ آ جانے کے بعد ساری کی ساری Thinking (سوچ) تبدیل ہو جاتی ہے تو مختصر ترین پینل کوڈ ہی کافی ہو جاتا ہے۔ پھر اندر بیٹھا پولیس مین ہمیں ہر وقت روکتا رہتا اور سزا دیتا رہتا ہے۔

آپ خواہ ہر روز یا پھر ہفتہ بھر میں صرف ایک لفظ سیکھیے...... لیکن اُس سیکھے ہوئے لفظ کو Implement کیجیے، فلاح پا جائیں گے۔ اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو پھر وہی ہو گا جو آج کل آپ ہر طرف دیکھتے ہیں کہ گلی گلی، محلّہ محلّہ درس و تدریس کے ادارے کھلے ہیں...... جگہ جگہ تفسیر و حدیث کا درس ہو رہا ہے ...... لیکن اِس کے باوجود معاشرہ میں برائی اور منفی رویوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم یہ بطور فیشن سیکھتے ہیں تاکہ بھری محفل میں اپنے علم سے لوگوں کو مرعوب کر سکیں۔ ہم عمل کرنے کے لیے علم نہیں سیکھتے۔

سوال: موجودہ پُرفتن دور میں انسان کس طرح مذہب اور نیکی پر قائم رہ سکتا ہے اور کیسے لوگوں کو نیکی کی ہدایت کر سکتا ہے؟

جواب: دیکھیے! یہ معاشرہ اور حالات اُس وقت تک ایسے ہی رہیں گے جب تک ہم خراب معاشرے کا رونا روتے رہیں گے۔ اگر میں نے اپنے آپ کو معاشرے سے کاٹ لیا اور سوچ لیا کہ دوسروں کے عمل کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے...... بس میں اپنے آپ کو درست کر لوں...... کیونکہ میں اپنے اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہوں۔ اگر سولہ کروڑ عوام کی یہ سوچ ہو گئی تو یہ معاشرہ پانچ منٹ میں سدھر جائے گا۔

لیکن اگر ہم یہ سوچتے رہے کہ میں اپنے آپ کو ٹھیک کیوں کروں کیونکہ دوسرے بھی تو غلط ہیں تو یہ معاشرہ بگڑتا چلا جائے گا۔ یاد رکھیے! ہمیں صرف اپنے اُوپر نظر رکھنا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم دل میں بٹھا

لیں کہ سب لوگ اچھے ہیں، ایک میں ہی بُرا ہوں اور مجھے خود کو اچھا بنانا ہے...... پھر معاشرہ میں بھلائی آ جائے گی۔

سوال: جو شخص نیکی کرتا ہے اُسے لوگ بھلا ہی سمجھیں گے۔ ایسا شخص نیکی کی طرف زیادہ مائل رہنے کے لیے کیا کرے؟

جواب: رب تعالیٰ احسان کرنے کی تلقین فرماتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ اگر تم کسی کے ساتھ نیک سلوک کرو تو اُسے چھپاؤ۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے جتا دے تو میں اُس کی نیکی اُس کے منہ پر دے مارتا ہوں۔ یہ ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس کے ساتھ نیکی کی جائے اُسے چاہیے کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ فلاں شخص نے میرے ساتھ نیک سلوک کیا۔ جب ہم نیکی کرنے کے بعد اپنے آپ کو یوں Portray کرتے ہیں کہ میں ایک بڑا آدمی ہوں تو رب تعالیٰ اُس نیکی کی خوشبو چاروں طرف پھیلا دیتا ہے اور یوں وہ نیکی کئی گنا زیادہ ہو کر پھیل بھی جاتی ہے...... اور آپ بھی تکبر سے بچ جاتے ہیں۔

نیکی اور تکبر میں بال برابر فرق ہوتا ہے۔ جب تک انسان کو یہ احساس نہ ہو کہ میں نیکی کر رہا ہوں تب تک وہ نیکی ہے اور جہاں دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں نیکی کر رہا ہوں تو وہ نیکی نہ رہی، تکبر ہو گیا...... اور سب غرق ہو گیا۔ جب تک انسان خود کو جوتے مارتا رہتا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ میں نے کیا اچھا کام کرنا ہے تو وہ نیکی کی طرف دوڑتا رہتا ہے۔ اِس لیے میں کہہ رہا تھا کہ اپنے آپ کو بُرا بنا کر رکھیے تاکہ آپ زیادہ سے زیادہ نیکی طرف مائل رہیں۔

سوال: سائنسی تعلیم شک کرنا سکھاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے حامل افراد جعلی پیروں فقیروں کی موجودگی میں صحیح مرشد کو کیسے Identify (شناخت) کر سکتے ہیں؟

جواب: کوئی شخص اندر سے کیا ہے...... وہ تو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ علم کے کسی بھی مقام پر فائز ہو کسی کے اندر کی ساری چیزیں نہیں جان سکے گا...... کیونکہ بہرحال اُس کا علم محدود ہے۔ لیکن ہم پہلے سے موجود مستند اولیاء اور فقراء کے اقوال سے روشنی لے سکتے ہیں۔

فقیر کی جانچ کے لیے دو Test ہیں:

ایک Litmus اور دوسرا Long-term test (طویل المیعاد پرکھ) ہے۔ لٹمس ٹیسٹ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی صاحبِ علم ہے تو اُس سے مل کر آپ کو کشش محسوس ہوگی اور آپ دوبارہ اُس سے ملنا چاہیں گے دوسرے اُس سے مل کر آپ کو اطمینان اور سکون حاصل ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صاحب علم رب تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے جس سے دلوں کو سکون ملتا ہے...... وہ کشش بھی دراصل ذکر الٰہی کی ہے۔ یہ لٹمس ٹیسٹ ہے۔

دوسرا ٹیسٹ تھوڑا زیادہ عرصہ لیتا ہے۔ فقیر کسی سے نہیں کہے گا کہ تم نماز پڑھو...... روزہ رکھا کرو...... فلاں نیکی کا کام کرو...... بلکہ وہ تو اتنی احتیاط کرتا ہے کہ خاموشی سے نماز پڑھ لے گا تاکہ نماز نہ پڑھنے والا شرمندہ نہ

ہو۔ لیکن آپ یہ حیران کن بات دیکھیں گے کہ اُس صاحب علم کے پاس جانے والے خود بخود شراب اور دیگر غیر اخلاقی کام چھوڑ دیتے ہیں اور نمازی ہو جاتے ہیں۔

یہ فقیر کے دو ٹیسٹ ہیں۔ اِس کے برعکس ہم نے جو ٹیسٹ بنا لیے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو سے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہندوازم کے اثرات ہمارے ذہن پر بہت پختہ ہیں۔ اگر کوئی شخص دور ویرانے میں ایک غار میں بیس برس سے تنہا زندگی گزار رہا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو بہت پہنچا ہوا شخص ہے اگر ہم اس کسوٹی کو درست تسلیم کر لیں تو پھر پیغمبروں، صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین نے جو دُنیاوی زندگی گزاری اُس کے بارے میں ہم کیا کہیں گے؟

جو دُنیا سے کٹ کر زندگی گزارتا ہے، وہ سادھو کا تصور اپناتا ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اِسی طرح ہم اُس آدمی کی طرف بہت جلد Attract ہوتے ہیں جو لایعنی گفتگو کرتا اور فحش گالیاں دیتا ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی شخص تو اللہ تعالیٰ کی طرف اُس وقت جائے گا جب وہ اُس کے احکامات کی پیروی کرے گا اللہ تو فحش گوئی سے منع کرتا ہے وہ پاکیزہ اور باوقار گفتگو کی تلقین کرتا ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے والا فحش گو اور بے وقار ہو جائے۔ لیکن ہم ہر اس شخص کو پہنچا ہوا مانتے ہیں جو لایعنی گفتگو اور فحش گوئی کرنے لگے۔

اِسی طرح اسلام صفائی اور پاکیزگی پر بہت زور دیتا ہے...... لیکن ہم اُس شخص کو پہنچا ہوا ولی اللہ مانتے ہیں جو ننگ دھڑنگ پھرتا ہے اور جس کے جسم پر آدھا آدھا انچ میل چڑھی ہے اور رال ٹپک رہی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اِس حلیے میں کوئی رب تعالیٰ کے قریب چلا جائے۔ رب تعالیٰ تو بڑا پاک صاف اور باوقار ہے اُس کا دوست ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے......؟

آپ کسی بھی شخص کے یہ دو ٹیسٹ کر لیجیے۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ وہ Genuine فقیر ہے یا نہیں۔ باقی رہ گئی شک کی بات تو صاحب! Positive sense میں شک کرنا علم کو آگے بڑھاتا ہے۔ آپ کسی چیز کے بارے میں شک کریں گے تو تحقیق کریں گے جس کے نتیجے میں حقائق سامنے آئیں گے اور علم بڑھے گا۔ سائنس کی تو بنیاد ہی شک پر ہے اِس لیے شک Positive sense میں بہت قابلِ تعریف ہے۔

سوال: کیا مجذوب کو کوئی استثنا حاصل ہوتا ہے؟

جواب: جس طرح پاکستان پینل کوڈ میں قتل کی سزا دفعہ 302 کے تحت دی جاتی ہے...... یہ پاکستان کے سولہ کروڑ عوام پر لاگو ہوتی ہے لیکن اگر کوئی پاگل قتل کر دے تو اُس پر PPC لاگو نہیں ہوتا...... بلکہ میڈیکل چیک اپ کے بعد جب اُس کے پاگل ہونے کی Confirmation ہو جاتی ہے تو عدالت اُسے پاگل خانے میں علاج کے لیے داخل کرنے کا حکم دے دیتی ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص عشقِ الٰہی میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تو وہ Exception میں چلا جائے گا اور Exception کو کبھی Quote نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی لیے عقل مند اور سمجھدار اولیاء اپنے شاگردوں کو مجذوبوں کے قریب جانے سے منع کرتے ہیں۔

اسرارِ تصوف

سوال: (i) چونکہ آپ کسی کو بیعت نہیں کرتے تو کیا آپ کے پاس جو علم ہے وہ آپ کے ساتھ ہی چلا جائے گا؟

(ii) ممتاز مفتی نے فرمایا تھا کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ دُنیا میں ایک وقت میں ایک ہی شخص کے پاس ہوتا ہے۔

جواب: جب آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو یہ آپ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ آپ اُس وقت تک اپنے مرشد کی بات مانیں گے جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں جو رب تعالیٰ کے حکم سے ٹکراتی ہو۔

ادب اور فرماں برداری کا یہ اہتمام اِس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ جب تک کسی کو خود سے Superior نہیں مانیں گے اور اُس کا ادب نہیں کریں گے...... آپ اُس سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ یوں آپ کے مرشد آپ کو صحیح راستے پر چلانے لگتے ہیں۔ جہاں آپ کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں یا آپ بہکنے لگتے ہیں وہاں آپ کے مرشد آپ کو Point out کرتے ہیں کہ آپ سے فلاں غلطی ہونے لگی ہے، اُس کو ٹھیک کر لیں۔

قصہ اِس بیعت میں بھی دراصل علم ہی کا ہے لیکن اِس میں آپ خود کو باندھ کر علم لیتے ہیں جب کہ میں ہر ایک سے یہ عرض کرتا ہوں کہ بھائی! رب تعالیٰ نے مجھے جو دو لفظ عطا کیے ہیں، وہ کوئی آ کے لے جائے میں بھی نہیں روکوں گا۔

جب لوگ دُعا کرانے کے لیے میرے پاس آتے ہیں تو کوشش کرتا ہوں کہ دو چار لفظ اُن تک پہنچا دوں۔ اِس سے بہت سے مہربان ناراض بھی ہوتے ہوں گے کہ ہم تو اُس سے دُعا کرانے آئے تھے، یہ ہمیں کیا سکھا رہا ہے۔ وہ دراصل علم ہی کی بات ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہر اتوار کو آ کر کہتا ہے کہ میں سخت پریشان ہوں۔ میرا کتا بیمار ہے۔ اُس کو دو بار کھانسی آ چکی ہے۔ دُعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ میری پریشانی دُور کر دے...... میرا کتا ٹھیک ہو جائے۔ پھر ایک خاتون آ کر زار و قطار رونا شروع کر دیتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا ہوا بی بی؟ تو جواب آتا ہے ''جناب! میرا ایلسیشن گُم ہو گیا ہے۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' پھر ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ میرا گلاس ٹوٹ گیا، لگتا ہے کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔ سخت پریشانی ہے، دُعا کر دیں۔

عام طور پر لوگوں کی ایسی دُعائیں ہوتی ہیں۔ تب میں اُن سے کہتا ہوں کہ بھائی! کس چیز کے پیچھے لگے ہو......؟ اللہ کے پیچھے ہی لگ جاؤ۔ لوگوں کو عام طور پر یہ باتیں پسند نہیں آتیں۔ میرے پاس جو تھوڑا بہت علم ہے، وہ میں اُنھیں پیش کر دیتا ہوں...... اپنے ساتھ وہ علم لے جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں پیری مریدی سے بڑا گھبراتا ہوں۔ میرے لیے Almost یہ نا قابلِ برداشت ہوتا ہے کہ کوئی میرے ہاتھ چومے، میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے یا مجھے جھک کر سلام کرے یا پھر جب تک میں نہ کہوں، لوگ محفل میں نہ بیٹھیں۔ میں درحقیقت اندر سے اِن باتوں سے چڑتا ہوں۔ مجھے تو سیدھی سادی زندگی چاہیے۔ اِس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں نے بچپن میں پڑھا تھا کہ جب آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کی محفل میں تشریف لاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ کے لیے کوئی دو چار فٹ اُونچا ڈائس بنایا گیا تھا جہاں آپ ﷺ تشریف فرما ہوتے۔ آپ ﷺ کبھی جلوس کی صورت نہ چلتے تھے۔ نہ تب ہٹو، بچو کی صدائیں آتی تھیں، نہ صحابہ کرامؓ زمین پر لیٹ کر آپ ﷺ کے پاؤں چومتے تھے۔ جب سنت میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی تو میں اس کو کیسے گوارا کر سکتا ہوں......! اِس لیے مجھے محفل میں نمایاں ہو کر بیٹھنا گوارا نہیں کہ یہ سنت نہیں ہے...... نہ ہی میں جلوس کی صورت چل سکتا ہوں۔ اِس لیے میں پیری مریدی سے بہت دُور بھاگتا ہوں کہ اگر ایک بار بیعت کرنا شروع کر دی تو سلسلہ جلوس کا سا بن جائے گا...... جو خلافِ سنت ہے۔

باقی رہ گئی بات کہ ممتاز مفتی نے جو فرمایا تھا...... میں اپنے بارے میں یہ بات نہیں کرتا...... نہ مجھے یہ دعویٰ یا زعم ہے۔ اِس بات کا بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ حکیم سعید الٰہی کے فرسٹ کزن تھے حکیم رحمت الٰہی صاحب...... بہت اچھے انسان تھے...... اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ایک صفت یہ عطا کر رکھی تھی کہ وہ جس شخص سے ملتے شروع میں اُس کے دل میں اُتر جاتے لیکن چونکہ طبیعت میں شرارت تھی اِس لیے اس شرارت کی وجہ سے اُتنی ہی جلدی دل سے اُتر بھی جاتے تھے۔ ایک روز وہ میری وائف کے ایک رشتہ دار کے ذریعے مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ سنا ہے کہ آپ ایک بزرگ کے پاس جاتے ہیں، مجھے بھی اُن سے ملوا دیجیے......! بڑے شاہ صاحب سے اجازت لینے کے بعد میں اُنھیں وہاں لے گیا۔ بڑے شاہ صاحب چونکہ خود بھی اہلِ زبان تھے اس لیے حکیم رحمت الٰہی اپنے اہلِ زبان ہونے اور دل میں گھر کر جانے والی خوبی کی وجہ سے قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب سے بہت قریب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب جب بھی اُن کے پاس تشریف لے جاتے تو بڑے شاہ صاحب اُنھیں کوئی Calculations سکھایا کرتے تھے۔ میں بیٹھ کر بس دیکھتا رہتا تھا۔ تھوڑے عرصے میں یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ بڑے شاہ صاحب اُنھیں ایک خاص علم سکھا رہے تھے۔ یہ جان کر کچی بات ہے میرے دل میں خیال آیا کہ بڑے شاہ صاحب نے میرے ساتھ تین تین رشتے جوڑے ہیں لیکن یہ علم مجھے تو نہیں سکھایا......!

میرا بڑے شاہ صاحب (سید یعقوب علی شاہ) کے پاس جانے کا قصہ بھی عجیب تھا۔ ناگپور میں ایک بزرگ دفن ہیں بابا تاج الدین اولیاء...... بہت کمال کے بزرگ ہیں...... اُن کا حکم آج بھی دُنیا میں جاری

ہے۔ ایک بار میرا کوئی کام پھنسا ہوا تھا۔ میں عشاء کی نماز اور تسبیحات سے فارغ ہو کر جانماز پر بیٹھا تھا۔ رات کے ایک ڈیڑھ بجے کا وقت تھا کہ بابا تاج الدین اولیاء تشریف لے آئے۔ قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کی شکل دکھا کر کہنے لگے "اِن کے پاس چلے جاؤ!" میں نے سوچا کہ یہ تو فوراً ہی بگڑ جاتے ہیں...... میں تو نہیں جاتا اِن کے پاس۔ مغربی تعلیم اور سرکاری نوکری کا اثر تھا اس لیے اکڑ بھی تھی لہٰذا اُن کے پاس نہیں گیا۔ اگلے دن پھر بابا تاج الدین اولیاء تشریف لے آئے اور کہنے لگے "اِن کے پاس چلے جاؤ، تمھارا کام ہو جائے گا۔" میں پھر نہیں گیا۔ تیسرے روز پھر وہ تشریف لے آئے اور خاصی تفصیل سے مجھ سے بات کی اور مرشد صاحب کی شکل دکھا کر کہنے لگے "اِن کے پاس جا کر دُعا کے لیے کہو۔ اگر یہ دُعا کر دیں گے تو تمھارا کام ہو جائے گا۔"

دراصل میں بڑے شاہ صاحب کے پاس پہلے بھی دو تین مہینے جاتا رہا تھا...... پھر کسی بات پر اکڑ گیا اور جانا ترک کر دیا۔ لیکن اس بار بابا تاج الدین اولیاء کی ہدایت پر چھ سات ماہ کے وقفے سے جب گیا تو مجھے دیکھ کر بڑے شاہ صاحب کہنے لگے "کہو! کیسے آئے ہو؟" میں نے کہا "یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا کہ سلام کرتا جاؤں۔" کہنے لگے "کر لیا سلام۔" میں نے کہا "جی۔" بولے "جاؤ اب۔" میں نے دل میں کہا کہ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پاگل ہے یہ آدمی۔ دو تین روز گزرے تو پھر میں اُن کے پاس چلا گیا۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور پوچھا "کیسے آئے ہو؟" میں نے کہا "دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ایک کپ چائے پی جائے۔" کہنے لگے "بیٹھو! ابھی پلاتا ہوں۔" جب میں نے چائے پی کر کپ رکھا تو بولے "چائے پی لی تم نے اب جاؤ۔" چونکہ کام بہت ضروری تھا اور مجھے اس سلسلے میں بے چینی بھی تھی۔ اِس لیے دو چار دن بعد میں پھر اُن کے پاس چلا گیا۔ اس بار وہ خود ہی پوچھنے لگے "میاں! تم بار بار آ رہے ہو۔ کیا تمھیں کوئی کام ہے مجھ سے؟" میں نے کہا "جناب! میرا یہ کام ہے لیکن میں کبھی خود نہ آتا آپ کے پاس...... وہ تو بابا تاج الدین اولیاء نے آپ کی شکل دکھا کر آپ کے بارے میں کچھ اچھی باتیں مجھے بتائیں اور فرمایا کہ اِن کے پاس جا کر دُعا کے لیے کہو۔ یہ دُعا کر دیں گے تو تمھارا کام ہو جائے گا۔" میری یہ بات سن کر بڑے شاہ صاحب کی آنکھیں غصے سے اُبل پڑیں اور وہ کہنے لگے "وہ کون ہوتا ہے لوگوں کے بھید کھولنے والا......! اُسے تو آج رات میں سیدھا کروں گا۔" پھر مجھے کہنے لگے "میاں! تم فلاں تاریخ کو ٹھیک چھ بجے آ جانا، وقت کی پابندی کا خیال رکھنا...... ایک منٹ بھی اُوپر نہ ہو۔" میں مقررہ تاریخ کو پونے چھ بجے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ اُنھوں نے گھڑی کلائی سے اُتار کر سامنے رکھ لی اور مجھ سے باتیں کرنے لگے لیکن اُن کی نظریں گھڑی پر تھیں۔ جیسے ہی شام کے ٹھیک چھ بجے تو وہ مجھے ایک حرف بتا کر کہنے لگے "یہ پڑھ لیا کرو۔" میں Upset ہو گیا کہ یہ اُنھوں نے مجھے کیا دے دیا پڑھنے کو......! صرف ایک حرف......! میں نے پوچھا بس یہ اتنا ہی ہے......؟" کہنے لگے "ہاں بہت ہے یہ......!" میں نے کہا "کیا اس کو پڑھنے سے کام ہو جائے گا......؟ کشف و کرامات حاصل ہو جائے گی......؟ ولایت مل جائے گی......؟" میرے ہر سوال کے جواب میں اُن کا ایک ہی جملہ تھا کہ "ہاں ہو جائے گا۔" میں نے سوچا یہ کیا

گیدڑ سنگھی اُنھوں نے مجھے دے دی ہے لیکن چونکہ مجھے اپنا کام ہو جانے کی لگن تھی اس لیے میں نے وہ حرف پڑھنا شروع کر دیا۔

یوں اُنھوں نے مجھے صرف ایک حرف عطا کیا تھا جب کہ حکیم رحمت الٰہی صاحب کو وہ لمبی چوڑی Calculations سکھا رہے تھے جسے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ میرے ساتھ بڑے شاہ صاحب نے تین تین رشتے قائم کیے ہیں لیکن مجھے تو یہ علم نہیں سکھایا۔ جب دوسری اور پھر تیسری بار بھی میں نے اِسی انداز میں سوچا تو حکیم صاحب کے رُخصت ہو جانے کے بعد بڑے شاہ صاحب مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے ''دیکھو میاں! ہم ہیں فقیر، ہمارے پاس جو جس نیت سے آتا ہے ہم اُس کو وہی چیز عطا کرتے ہیں۔ تمھاری شکل بہت عرصہ پہلے دکھا کر مجھے بتا دیا گیا تھا کہ تمھارا حصہ میرے پاس ہے لیکن تم نے آنے میں بہت دیر کر دی...... لیکن جب تم میرے پاس آئے تو میں نے تمھیں تمھارا حصہ فوراً دے دیا۔ حکیم صاحب میرے پاس ایسا علم لینے آئے تھے جس سے لوگوں کے سوالات کا صحیح جواب دے کر وہ چار پیسے کما سکیں۔ اِس لیے میں نے اُنھیں ستاروں کا علم دیا ہے جب کہ تمھیں میں نے ایسا علم دیا ہے جو ایک وقت میں پوری دُنیا میں ایک ہی شخص کے پاس ہوتا ہے۔ کبھی دو کے پاس یہ علم نہیں ہوا۔ حکیم صاحب تو Calculations کرتے ہیں لیکن تم صرف اُوپر نگاہ اُٹھاؤ گے تو دیکھ لیا کرو گے کہ کون سی چیز کہاں ہے؟'' اِس پر میں ہنسا اور کہا ''حضور! اب تو یہ علم دو آدمیوں کے پاس ہو گیا۔ ایک آپ کے اور دوسرا میرے پاس۔'' اِس پر وہ کہنے لگے ''یہ تمھاری غلط فہمی ہے۔ تمھارے پاس یہ علم اُس وقت مکمل ہو گا جب میں رُخصت ہوں گا اور تم مجھے دفن کر کے 72 قدم پیچھے آ کر دُعا کرو گے تو اُس وقت تم بھر دیے جاؤ گے۔'' اور واقعی اُن کے وصال کے بعد، اُنھیں دفن کر کے جب 72 قدم پیچھے آ کر میں نے فاتحہ پڑھی تو میں نے محسوس کیا کہ میں ایک نئی شخصیت بن گیا ہوں۔

ممتاز مفتی چونکہ رائٹر ہیں اِس لیے اُنھوں نے اِس سارے واقعہ کو بڑے ادبی انداز میں بیان کیا ہے۔ میں یہ علم اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا...... جو چاہے مجھ سے یہ علم لے لے۔ لیکن یہ علم کا ملنا اور نہ ملنا بھی تقدیر کا معاملہ ہے۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بھی جواب میں اُن سے اُتنا ہی پیار کرتے تھے۔ ایک روز اُنھوں نے سوچا کہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو علم عطا کر دیا جائے۔ اُن دنوں سند کی تصدیق کی ڈیوٹی پر حضرت نصیر الدین چراغِ دہلی مامور تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تھال میں کھانے کی کچھ چیزیں پیالیوں میں رکھیں...... اُس تھال کو ایک رومال سے ڈھانپ دیا اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ ''یہ تھال لے جا کر چراغ دہلی صاحب کو دے دو۔ وہ جواب میں جو کہیں آ کر مجھے من و عن بتاؤ۔'' حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے تھال چراغ دہلی کی خدمت میں پیش کیا۔ اُنھوں نے رومال اُٹھایا اور برتنوں میں موجود کھانا لے کر خالی پیالیاں دوبارہ تھال میں رکھ دیں اور تھال کو رومال سے ڈھانپ کر فرمایا کہ یہ خالی برتن واپس لے جاؤ! حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے واپس آ کر ساری بات حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو کہہ

سنائی۔ جس پر اُنھوں نے فرمایا ''خسرو! اب یہ آپ کی تقدیر ہے۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ان برتنوں میں کچھ بھر کر واپس کر دیتے تو میں آپ کو علم دے دیتا لیکن چونکہ وہاں سے منظوری نہیں ہوئی اس لیے میں تمھیں کچھ نہیں دے سکوں گا۔''

یوں حضرت امیر خسرو کو علم لدنی عطا نہ ہو سکا لیکن حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو چونکہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کی وجہ سے اُن سے بہت زیادہ پیار تھا...... اِس لیے اُنھیں سلام عطا کر دیا اور حکم دیا کہ جو شخص مجھ تک آنا چاہے وہ پہلے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو سلام کرے۔

بعض اوقات علم کے حصول میں تقدیر اِس طرح بھی کام دکھاتی ہے......لیکن علم کی تقسیم میں میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ اولیائے کرام میں میرے بارے میں مشہور ہے کہ میرے پاس جو کوئی آتا ہے میں اُسے اندھا دھند علم دے دیتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ ممکنہ مقدار ایک ہی وقت میں Pass on کر دیتا ہوں۔ اِس وقت بھی کچھ لوگ موجود ہیں جن کو میں نے علم دیا...... اُن کو اللہ نے کشف بھی عطا فرما دیا...... وہ کرامات تک بھی پہنچ گئے...... اُن کی زبان میں تاثیر بھی پیدا ہو گئی لیکن چونکہ اُن کی تربیت نہیں تھی۔ اس لیے اگرچہ علم نے تو کام دکھایا لیکن تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہک گئے، بھٹک گئے اور وہ علم اُن سے چھن گیا۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں بلکہ علم Pass on کرنے کی بات کر رہا ہوں کہ عام طور پر جو لوگ یہاں علم کے لیے آئے...... دو ڈھائی سال کے عرصے میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ صاحبانِ کشف و کرامات ہو گئے......لیکن تربیت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ شیطان انسان کو یوں بہکاتا ہے کہ تم تو خود ولی اللہ بن گئے ہو......تم پیر بن جاؤ اور لوگوں کے لیے دُعائیں کرو۔ جب خلقِ خدا کو اُس کی دُعاؤں سے فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتی ہے، ہاتھ چومتی ہے جس سے اُس کا نفس پھول کر کپا بن جاتا ہے...... وہ بھٹک جاتا ہے اور اُس کا علم چھن جاتا ہے!

سوال: کیا ''درود'' عربی کا لفظ ہے؟ کیا صرف درود ابراہیمی کی صورت ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا جا سکتا ہے یا پھر ہم کوئی سا بھی درود پاک پڑھ سکتے ہیں؟ کیا درود پاک بے وضو بھی پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب: ''درود'' عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ یہ فارسی زبان سے Derive ہوا ہے۔ فارس کے آتش پرست عبادت کے ایک خاص طریقے کو درود کہتے تھے۔ یہ لفظ وہاں سے Derive ہو کر فارسی ادب کا حصہ بنا۔ وہاں سے ہم نے اسے Import کر لیا۔ اس لیے اگر کسی عرب کے سامنے لفظ ''درود'' استعمال کیا جائے تو وہ اس کا مفہوم سمجھ نہیں پاتا۔

آپ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں...... درود بھیجنے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہم دورانِ نماز اپناتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز پڑھوائی تھی...... اور یہ واقعہ دو بار پیش آیا۔ اس طرح نماز میں درود ابراہیمی کی صورت سلام بھیجنے کا طریقہ موجود ہے۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جو آئمہ کرام، علماء اور اہلِ فقر نے Develop کیا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ فورسز میں جو یونیفارم سروسز ہیں، اُن میں سیلوٹ کیا جاتا ہے جس کی بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ سیلوٹ کرنے والا یہ بتا رہا

ہوتا ہے کہ میرا ہاتھ خالی ہے اور میرے پاس آپ کے لیے دوستی ہے۔ بری فوج کے آدمی کا سیلوٹ کرنے کا انداز قدرے مختلف ہوتا ہے جب کہ بحری فوج کا آدمی ذرا اور انداز میں سیلوٹ کرتا ہے۔ پیغام سب کا سلامتی اور خیر کا ہے کہ میرا ہاتھ خالی ہے۔

یہی معاملہ اُس درود و سلام کا ہے جو ہم آپ ﷺ پر بھیجتے ہیں۔ اِس درود و سلام کو مختلف انداز میں Derive کر لیا گیا ہے۔ آپ خواہ کوئی بھی درود پڑھ لیں...... اس میں کوئی حرج نہیں۔ اصل بات جذبے اور محبت کی ہے۔ آپ بے وضو بھی درود پاک پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ خلافِ ادب ہے۔ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ درودِ پاک باوضو ہو کر پڑھا جائے کیونکہ آپ ﷺ کے سلسلے میں ادب پہلی شرط ہے۔

سوال: قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں......" سوال یہ ہے کہ ہم تو اللہ کے آگے درود بھیجتے ہیں، اللہ کس کے آگے درود بھیجتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کسی کے آگے درود نہیں بھیج رہا...... بلکہ وہ اپنے محبوب ﷺ پر درود بھیج رہا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ تو "کن" کہتا ہے تو سب ہو جاتا ہے۔

جواب: یہ بھی تو "کُن فیکون" کا حصہ ہے کہ وہ سلامتی بھیج رہا ہے کیونکہ لفظ "کُن" تخلیق کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ "ہو جا......" لیکن یہاں "ہو جا" والا معاملہ نہیں بلکہ یہاں تو درود و سلام بھیجنے کی بات ہے اس لیے یہاں الفاظ تبدیل ہو جائیں گے۔

سوال: اہلِ فقر کون سا درود پڑھتے ہیں؟

جواب: تقریباً سبھی اہلِ فقر یہ درود پڑھتے ہیں:

اللھم صل علی سیدنا ومولنا محمد وعلی ال سیدنا و مولنا محمد و بارك وسلم علیه

اِس درود پاک کے اثرات بہت تیز ہیں، تھوڑے مختلف بھی ہیں، اور اس کا رزلٹ بہت Quick ہے۔

سوال: کیا "صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" بھی درود ہے؟

جواب: یہ درود پاک کی Abbreviated form ہے۔ اِس سے مقصد تو پورا ہو جاتا ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ مکمل درود پاک پڑھا جائے۔

سوال: شاہ صاحب! گزشتہ اتوار آپ سے ملاقات سے واپسی پر میں نے سوچا تھا کہ آپ سے خلافت اور علم کے بارے میں پوچھوں گا۔ آج آتے ہی آپ نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور اِس موضوع پر بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں اُٹھنے والے سوالوں کے جواب دے دیے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ آپ Generally تو سب کو علم دے ہی رہے ہیں لیکن آپ نے خاص طور پر کسی شخص کا نام نہیں لیا جس کو آپ خلافت یا علم عطا کریں گے۔

جواب: دیکھیے! خلافت As such کوئی انعام تو ہے نہیں البتہ آپ اِسے ایک اعزاز کہہ سکتے ہیں۔ اگر میں

کسی کو خلافت دوں گا تو یہ وہ شخص ہوگا کہ جو خود کو اُس کا اہل ثابت کرے گا...... خود کو اہل ثابت کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ دُنیا کی محبت اس کے دل سے نکل گئی ہو۔ اِسی لیے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے میرا سارا زور اِس بات پر ہوتا ہے کہ دُنیا کی محبت سے جان چھڑا لیجیے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دوسروں کے لیے قربانی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیجیے۔ یہ دو چیزیں ہر چیز کی بنیاد ہیں۔ جب کسی صاحب نے خود کو اس حد تک تیار کر لیا تو میں ضرور اُن کا نام آپ لوگوں کے سامنے بیان کر دوں گا۔

رُوحانیت اور ہمارے تصورات

ہمارے Concepts (تصورات) بہت سی چیزوں کے بارے میں زیادہ Clear نہیں ہیں۔ جب تک ہمارے Concepts کسی چیز کے بارے میں زیادہ Clear نہیں ہوتے ہم اُسے صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اپنا سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ایک یہ Concept پایا جاتا ہے کہ جو صاحبِ علم، ولی اللہ یا پہنچا ہوا شخص ہے اُسے دُنیا کی کسی چیز کا پتا نہیں ہوگا کہ ٹرین کیا ہوتی ہے، جہاز کیا ہوتا ہے یا بس کیا ہوتی ہے۔ سوائے مادری زبان کے اسے کوئی لفظ نہیں آتا ہوگا...... دُنیاوی علوم سے بالکل بے بہرہ ہوگا...... کسی اُجاڑ، بیابان جگہ پر بیٹھا ہوگا...... کپڑوں سے بے نیاز، داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے...... جسم پر ایک ایک انچ میل جمی ہوئی...... اُس کی زبان بے لگام اور غیر شائستہ ہوگی۔ جہاں ہمیں کوئی ایسا شخص ملتا ہے ہم اُسے صاحبِ علم اور ولی اللہ سمجھنے لگتے ہیں۔

صحیح صاحبِ علم اللہ سے قریب ہوتا ہے اور اللہ نے اُسے اپنی رحمت سے علم کی سمجھ عطا کی ہوتی ہے۔ جب رُوح کو زمین کی طرف روانہ کرتے وقت اپنے خالق سے رُجوع رکھنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو اگر وہ رُوح پوری طرح اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھتی ہے تو رب تعالیٰ انعام کے طور پر اُسے علم عطا فرما دیتا ہے۔ جسے علم عطا ہوتا ہے اُسے عقل عطا فرما دی جاتی ہے اور Essence of wisdom خود رب ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ صاحبِ علم رب تعالیٰ سے بہت قریب ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ صفائی کو بہت پسند کرتا ہے تو اللہ کے قریب ہونے والا صاحبِ علم پاکیزگی سے دُور کیسے ہوسکتا ہے؟ رب تعالیٰ بہت حیا والا ہے لہٰذا اُس سے قریب ہونے والا شخص ستر پوشی سے بے نیاز کیسے ہوسکتا ہے؟ اِسی طرح رب تعالیٰ ہم سے یہ کہتا ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو بن سنور کے، مزین ہو کر کھڑے ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص جس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوں اور اُس میں میل سے جٹائیں بنی ہوں، وہ رب کے قریب ہو؟ اِسی طرح رب تعالیٰ نے فحش گوئی کو بہت شدت سے Condemn کیا ہے۔ ذرا سوچیے کہ جس انسان کی زبان شائستہ نہیں وہ رب کے قریب کیسے ہوسکتا ہے؟

اِسی طرح ہمارا ایک اور Concept ہے کہ جب ہم ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں اور رب تعالیٰ اُسے قبول کر کے ہمیں انعام عطا فرماتا ہے تو درحقیقت ہماری رُوح کی لطافت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح زمین پر ہمارا

جسم مجازی ہے۔ اس طرح اُوپر عالم مثال میں ہمارا اعلیٰ جسم بھی ہے جسے جسم لطیف کہا جاتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ یا کلام پڑھتے ہیں جو ہماری رُوح سے مطابقت رکھتا ہو تو اُس سے ہمارا رُوحانی جسم پھلتا پھولتا ہے۔ جسم مجازی کے پھلنے پھولنے یا صحت مند ہونے سے اُس کے وزن اور جسامت میں اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ جسم لطیف کے پھلنے پھولنے سے اُس کی لطافت بڑھ جاتی ہے۔ جوں جوں یہ لطافت بڑھتی ہے توں توں رُوحانی جسم کی پرواز میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے...... اور اللہ تعالیٰ رُوح کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرانے لگتا ہے۔ رُوح کی پرواز انسان کے علم کے ساتھ Directly proportionate ہے۔ علم کے مقام کے حساب سے انسان کی رُوح کو سیر کرنے کی اجازت ملتی ہے۔

اس کے پہلے درجے کے طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب ہم لطافت کے ابتدائی مقام پر آتے ہیں تو وہاں ہمیں غیر مرئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں...... اور اُن سے ملاقات اور گفتگو ہونے لگتی ہے جنھیں عرف عام میں ہم جنات یا بھوت وغیرہ کہتے ہیں۔ جوں جوں رُوحانی مقام بڑھتا چلا جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے عجائباتِ عالم اور آسمانوں کی سیر شروع ہو جاتی ہے۔ اِس سب کا انحصار ہماری رُوح کی لطافت کے مقام اور پرواز پر ہے لیکن چونکہ ہمارے Concepts (تصورات) Clear نہیں ہیں تو جونہی ہماری رُوح کو ذرا سی پرواز عطا ہوتی ہے ہم اُس دھوکے میں آجاتے ہیں کہ شاید ہم علم اور ولایت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو گئے ہیں...... حالانکہ وہ تو ہم سے کوسوں دُور ہے...... ایک لمبا فاصلہ طے کر کے ابھی ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے۔ یہ تو محض ابتدا ہے۔

7 جولائی 1966ء کو میں نے اپنی پروفیشنل لائف کا آغاز کیا تھا۔ میری پہلی نوکری سوئی گیس آفس میں تھی۔ مجھے Appoint کر کے ملتان بھیج دیا گیا۔ تب میری عمر 22 سال اور 25 دن تھی۔ آج کا ملتان تو بہت ترقی یافتہ اور خاصا وسیع ہے لیکن تب یہ ایک ٹاؤن کی مانند تھا۔ میں نے وہاں گلبرگ کی طرز کے ایک علاقے گل گشت کالونی میں کرایہ پر ایک گھر لیا جس میں میں تنہا رہتا تھا۔ تب مرشد صاحب سے تو ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اِس لیے اپنی مرضی سے 40,42 وظائف صبح و شام پڑھا کرتا تھا...... اُس گھر میں مختلف قسم کے واقعات پیش آنے لگے۔ میں جب بھی تنہا اور خاموش ہوتا تو ہوا میں لکھی ہوئی ایک آیت دکھائی دیتی یا پھر میں بے خیالی میں کسی دیوار پر نظر جماتا تو وہاں وہ آیت لکھی نظر آنے لگتی۔ وہ آیت سب سے پہلے سورۃ البقرۃ میں آئی ہے ''ان اللہ علی کل شی قدیر'' مجھے یہ آیت پسند بھی بہت ہے۔ یہ آیت جب بھی لکھی نظر آتی ساتھ یہ ہدایت بھی ہوتی کہ اِسے پڑھو...... لیکن اچھی بات یہ تھی کہ میں نے اُسے کبھی پڑھا نہیں۔ ایک روز پڑوسی میرے پاس آکر کہنے لگے ''یا تو آپ مکان چھوڑ کر چلے جاؤ یا پھر پڑھائیاں بند کر دو۔'' میں نے کہا صاحب! آپ کو میرے عبادت کرنے سے کیا نقصان ہے؟'' کہنے لگے ''آپ تو آفس چلے جاتے ہیں...... گھر کو تالا لگا ہوتا ہے لیکن اس میں بہت سے لوگ ہمیں دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں جن سے ہماری Families خوف زدہ ہوتی ہیں۔'' اِسی طرح کے اور بہت سے واقعات پیش آتے تھے۔ ایک رات میں عبادت کے بعد اپنے بیڈ روم سے باہر صحن میں نکلا۔ گرمیوں کا موسم تھا، ایئر کنڈیشنر کا نہ تو رواج تھا نہ افورڈ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں جو

لوگ Temporary duty یا ٹرانسفر پر ملتان آتے اور جب اُنھیں وہاں کوئی مکان نہ ملتا تو میرے پاس ڈیرے ڈال لیتے۔ اُن دنوں بھی پانچ چھ لوگ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اور سب کے بیڈ صحن میں ساتھ ساتھ لگے تھے......اور وہ بیٹھ کر گپیں لگا رہے تھے۔ میرا بیڈ کچن کے قریب تھا...... میں اُس پر لیٹ کر آرام سے اپنی پڑھائی کر رہا تھا۔ اِتنی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کی آٹھ فٹ اُونچی عقبی دیوار ایک شخص نے باہر سے اس طرح پھلانگی جیسے ہم اینٹ کے اُوپر سے پاؤں رکھ کر گزر تے ہیں۔ دیوار پھلانگ کر وہ کوریڈور (Corridor) میں گیا اور پھر اگلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ گپیں لگاتے اُن پانچ چھ لوگوں نے جب یہ سب دیکھا تو ڈر کے مارے میری طرف لپکے اور خوف زدہ آواز میں مجھے کہنے لگے ''اسے بھگاؤ!'' میں نے'' کہا میں بھگا تو دوں گا لیکن میں تو آپ لوگوں کے نیچے دبا ہوا ہوں۔ مجھے باہر تو نکلنے دو۔'' (مسکراتے ہوئے) اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے اور میں اِن چیزوں سے تنگ آیا ہوا تھا۔ ایک روز گرمی کے موسم میں جب میں آفس سے اُٹھا تو ڈرائیور سے کہا کہ مجھے ملتان قلعہ پر ڈراپ کر دیں۔ وہاں ایک بڑے جید بزرگ ہیں شاہ رکن الدین عالم رحمتہ اللہ علیہ صاحب ......جس کمرے میں وہ آرام فرما ہیں اُس سے باہر بھی ایک کمرہ ہے۔ میں ابھی باہر والے کمرے میں داخل ہوا تھا کہ مجھ پر اِس قدر ہیبت طاری ہو گئی کہ میں ڈر کر واپس باہر نکل آیا۔ اگلے روز وہاں دوبارہ گیا تو اجازت مل گئی اور میں اندر داخل ہو گیا۔ میں نے اُن سے عرض کی کہ میرے کوئی مرشد نہیں جو مجھے گائیڈ کر دیں۔ آپ مہربانی فرمایئے کہ آپ میرے مرشد بن جایئے اور اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔ اُس وقت میں اِس مقام پر تو تھا نہیں کہ کشف القبور حاصل ہوتا اور تو جواب مل جاتا۔ لہٰذا میں دُعا کر کے واپس چلا آیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں میں نے دیکھا کہ یہ واقعات پیش آنا بند ہو گئے۔ وہ آیت جو لکھی ہوئی نظر آتی تھی وہ بھی نظر آنا بند ہو گئی۔ میں جب صبح و شام عبادت کیا کرتا تھا تو میرے بیڈ روم کے باہر کوئی پہرہ دیا کرتا تھا اور فوجی بوٹوں کی آواز نہ صرف مجھے بلکہ بہت سے دیگر لوگوں کو بھی سنائی دیتی تھی بوٹوں کی وہ آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

نومبر 1969ء میں میری پرنس آغا خان کے ادارے میں Appointment ہو گئی۔ یکم فروری 1970ء کو میں اُن کے لاہور آفس آ گیا۔ میرے وظائف ایک ایک کر کے کم ہونا شروع ہو گئے حتیٰ کہ بڑے شاہ صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔

ایک روز قبلہ مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب اور میں پشاور جا رہے تھے......تب راستے میں بہت سے واقعات پیش آئے۔ جب ہم واپس لاہور آ رہے تھے تو اُن واقعات کے ریفرنس سے میرا دھیان ماضی کے اُن واقعات کی طرف چلا گیا۔ میں نے مرشد صاحب سے اجازت چاہی کہ حضور کچھ علمی نکات وضاحت طلب ہیں اگر آپ کی اجازت ہو تو صرف سیکھنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں عرض کر دوں۔ وہ بولے ''ہاں کہو!'' تب میں نے اُنھیں آیت والا قصہ سنایا کہ کیسے اُٹھتے بیٹھتے مجھے وہ آیت ہوا میں، دیوار پر اور کبھی آسمان پر لکھی نظر آیا کرتی تھی اور ساتھ تاکید ہوتی کہ اسے پڑھو۔ جب مرشد صاحب نے اِس سارے قصے کی وضاحت کی

تو میں بڑا حیران ہوا۔ فرمانے لگے "اچھا کیا تم نے وہ آیت نہیں پڑھی...... ورنہ مجذوب ہو جاتے۔ دراصل وہ جنات تھے جو تمھیں وہ آیت دکھا کر پڑھنے پر اس لیے آمادہ کرتے تھے تاکہ تم ہوش وحواس کھو دو اور اس راہ سے ہٹ جاؤ۔"

آپ کو یہ سارا قصہ سنانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جن چیزوں کو ہم بہت بڑا اور باعث فخر سمجھتے ہیں درحقیقت وہ کچھ اور ہوتی ہیں۔ جیسے میرے پاس آ کر بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ صاحب! ہمیں خواب میں فلاں آیت پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جب انھیں سمجھانے کی کوشش کی جائے تو اگرچہ وہ اظہار تو نہیں کرتے لیکن دل ہی دل میں ناراض ہوتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ہمارا مرتبہ چھوٹا کر دیا یہ کہہ کر کہ اس خواب کو Ignore (نظر انداز) کر دو۔ حالانکہ ہم تو ولایت کے بلند مقام پر ہیں ہمیں اللہ خود خواب میں بتا رہا ہے کہ یہ آیت یا لفظ پڑھ لو اور شاہ صاحب ہیں کہ کہتے ہیں اسے نظر انداز کر دو۔

سچ تو یہ ہے کہ اس راہ کے حقائق کچھ اور ہیں۔ حقیقت اکثر وہ نہیں ہوتی جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ (اُمید ہے کہ آپ میرے اِن ذاتی واقعات سے بور نہیں ہو رہے ہوں گے۔ جب آپ بوریت محسوس کریں تو مجھے بتا دیجیے گا، میں موضوع بدل دوں گا۔)

تقریباً 34 سال پرانی بات ہے، دو بجے کے قریب مجھے خیال آیا کہ پاک پتن چلتے ہیں۔ چھوٹے بھائی کو ساتھ لیا، گاڑی نکالی اور پاک پتن پہنچ گئے۔ اُس وقت مجھے پاک پتن کے رسم و رواج اور ادب آداب کا زیادہ اندازہ نہ تھا۔ جب ہم دربار پر پہنچے تو پتا چلا کہ دروازے بند ہیں اور مزار کی دُھلائی ہو رہی ہے۔ بابا صاحب کی اولاد مزار کو Wash کر رہی تھی، اِس لیے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ میں نے بہت کہا کہ میں لاہور سے آیا ہوں اور مجھے ابھی واپس جانا ہے، اِس لیے مجھے اندر جانے دیجیے۔ تب ایک صاحب کو غالباً مجھ پر ترس آ گیا۔ کہنے لگے "آپ بیک سائیڈ پر موجود ایک مکان سے مزار کے احاطہ میں داخل ہو جائیں۔ آگے سیڑھیاں دکھائی دیں گی۔ اُن سیڑھیوں سے اُوپر چلے جائیں تو آپ مزار کے صحن میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ وہ راستہ ہے جو دیوان صاحب استعمال کرتے ہیں۔" ہچکچاہٹ تو ہوئی کہ کسی کے گھر میں کیسے داخل ہو جاؤں...... ! لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر جب صحن میں داخل ہوا تو تقریباً دو ڈھائی سو لوگ مزار کو غسل دے رہے تھے۔ میں دل میں درود پاک پڑھتے ہوئے اس انتظار میں کھڑا تھا کہ مجھے جگہ ملے تو میں آگے چلا جاؤں۔ اچانک میرے بائیں کندھے کے پیچھے سے آواز آئی "یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے اس کے جوتے چوری کر لیے ہیں۔" میں حیران ہوا کہ میرے کان میں یہ بات کون کہہ رہا ہے۔

پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک مجذوب تھا جس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا جس میں چاول بھرے تھے۔ میں نے سوچا یہ اس بہانے اب مجھ سے پیسے مانگے گا۔ (عادتاً میں اپنا پرس وغیرہ گاڑی میں چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ اُس وقت بھی میری جیب میں کچھ نہیں تھا۔) میں چپ رہا۔ لیکن وہ مجذوب مسلسل وہی ایک جملہ دہراتا رہا۔ اُس کی ایک ہی تکرار سے تنگ آ کر میں قدرے آگے کھسکتا چلا گیا حتیٰ کہ مزار کے پاس پہنچ گیا...... لیکن

اس کے باوجود وہ میرے پیچھے مسلسل میرے کان میں یہی کہتا رہا "یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے اس کے جوتے چوری کر لیے ہیں۔ یہ مجھے پولیس میں دے دے گا۔ پولیس نے مجھے کیا مارنا ہے۔ مجھے تو روز بابے سے مار پڑتی ہے۔ پولیس کی مار بابے کی مار سے سخت تھوڑی ہے۔"

میں نے دل میں جھنجلا کے کہا، یہ کیا مصیبت مجھے ٹکر گئی۔ یہ مجذوب تو مجھے پڑھنے بھی نہیں دے رہا۔ اتنے میں وہ اچانک آگے کو آیا...... میرا چہرہ غور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ "ٹھیک ہے۔ شاباش! ماں کی خدمت کیئے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ڈائریکٹر جنرل آف پاکستان بنا دینا ہے۔" میں نے پھر دل میں کہا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ جیب میں پیسے ہیں نہیں کہ دے کر جان چھڑا لینا۔ اِسی دوران اُس نے وہ حرکت کی جس سے مجھے سخت چڑ ہے۔ (مجھے سخت چڑ ہے کہ کوئی میرے جسم کو ہاتھ لگائے۔) اُس مجذوب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ آگے بڑھ کر میرا ماتھا، رگڑا۔ پھر میرا ماتھا دیکھ کر بولا "اللہ نے تجھے بڑی عزت دینی ہے...... تجھے ڈائریکٹر جنرل آف پاکستان بنانا ہے۔" اندر سے تو میں اُس کی اِس حرکت پر سخت چڑا ہوا تھا لیکن میں ضبط کرتے ہوئے دل ہی دل میں درود پاک پڑھتا رہا کیونکہ کچھ کہہ تو سکتا نہ تھا کہ وہ فقیر آدمی تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک اور حرکت کی۔ میرا نچلا ہونٹ ہاتھ سے پکڑ کر مسل دیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اُس نے چند لمحے میرے چہرے کی طرف دیکھا...... پھر میرے بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کو اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں پھنسا کر آسمان کی طرف چہرہ اُٹھا کر مجھے کہنے لگا "پڑھ! اللہ ہو، حق اللہ...... اللہ ہو، حق اللہ۔" لیکن میں اُس کی ہدایت نظر انداز کر کے مسلسل درود پاک پڑھتا رہا جس پر اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا! ٹھیک ہے "ٹھیک ہے شاباش! درود شریف پڑھے جا۔" میں نے دل میں اُسے کہا جاؤ جہنم میں تم باز نہیں آرہے ہو...... میں کیا کروں۔ اِسی اثنا میں اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا چاولوں کا پیالہ میرے آگے کر دیا او رکہنے لگا "لو! کھاؤ۔" میں نے آرام سے پیالہ ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا...... لیکن وہ دوبارہ سے پیالہ میری طرف بڑھا کر بولا "کھا لو! میری رُوح راضی ہو جائے گی۔" تب میں نے سوچا کہ صاحب! اگر میں انکار کرتا ہوں تو کہیں اللہ ناراض نہ ہو جائے کہ غریب آدمی مجھے کھانے کی دعوت دے رہا تھا اور میں نے اُس کے گندے حلیے اور کراہت کی وجہ سے دعوت کو رد کر دیا۔ کہیں اللہ سے مار ہی نہ پڑ جائے۔ اس خدشے کے تحت میں نے چٹکی میں دو چاول اُٹھائے اور منہ میں ڈال لیے۔ اس پر وہ مجذوب بہت خوش ہوا اور وہاں سے چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ دُھلے ہوئے فرش پر وہ مٹی سے بھرے پاؤں رکھتا ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اتنے میں دیوان صاحب (جو گدی نشین تھے) وہاں آ گئے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ میں لاہور سے آیا ہوں، مجھے واپس پہنچنا ہے۔ صرف فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں، آپ مجھے مزار تک جانے کی اجازت دے دیجیے۔ وہ کہنے لگے "تھوڑا سا انتظار کر لیں، دھلائی مکمل ہو جائے تو میں خود آپ کو مزار پر لے جاؤں گا۔" میں نے کہا "حضور! میرے تو پاؤں صاف ہیں۔ آپ اُس آدمی کو دیکھیے جو خود بڑے بڑے گندے پاؤں فرش پر لگا کر گیا ہے۔ آپ اُسے منع نہیں کرتے۔" وہ بولے "اُسے کون منع کرے......؟ وہ تو فقیر ہے۔" جیسے ہی دیوان صاحب نے یہ بات کہی مجھے اچانک ایک صاحب کی بات یاد آئی کہ دس محرم کو بابا صاحب کے ہاں ایک

مجذوب آتا ہے۔ اگر کبھی وہ نظر آجائے تو اُسے چھوڑنا نہیں۔ تب میں نے بے ساختہ کہا "ارے! یہ تو وہی مجذوب تھا۔ میں ابھی اُسے درخت کے نیچے جا پکڑتا ہوں لیکن جب وہاں دیکھا تو مجذوب غائب تھا۔

یہ واقعہ سننے کے بعد ہر ایک کہے گا کہ صاحب! واہ! وہ مجذوب پڑھا رہا تھا، آپ پڑھ لیتے تو ولایت مل جاتی۔

میں نے یہ واقعہ بھی بڑے شاہ صاحب سے عرض کیا، وہ کہنے لگے "تم بڑے خوش نصیب ہو۔ اگر خدانخواستہ اُس مجذوب کے ساتھ مل کر وہ الفاظ پڑھ لیتے تو تم بھی مجذوب ہو جاتے۔ وہ تو لوگوں کو پڑھا کر مجذوب کرتا تھا تم جس کی طرف بھی دیکھتے وہ مجذوب ہو جاتا!"

1966-67ء میں کئی ایسے واقعات میرے ساتھ پیش آتے رہے۔ یہ دو واقعات سنانے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جواب میں اگر آپ کو ایسے خواب دکھائی دینے لگیں تو آپ بھٹکیں نہیں بلکہ اپنے اندر بڑا پن پیدا کر لیجیے۔ جو کچھ دیکھیں، جو کچھ پیش آئے، اُسے پی جائیں۔ اپنے اندر Absorb (جذب) کر لیں۔ بڑے سے بڑے مشاہدے کو پی جائیں۔ کسی کو اُس کا احساس تک نہ ہونے دیں۔ جس قدر آپ کے اندر تحمل ہوگا اور جس قدر آپ کے اندر مشاہدے کو جذب کر لینے کی صلاحیت ہوگی اُسی قدر جلد آپ کی رُوحانی ترقی ہوگی۔ جتنا آپ یہ واویلا مچائیں گے کہ صاحب! میں نے فلاں چیز خواب میں دیکھی یا فلاں شے کا مشاہدہ کیا...... مجھے بتائیے یہ کیا ہے۔ اُتنا ہی آپ اپنی محنت کو ضائع کرتے چلے جائیں گے۔ اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے Concepts (تصورات) Clear نہیں ہیں اُنھیں Clear کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

سوال: کیا اپنے مرشد کے علاوہ کسی دوسرے صاحب علم سے بھی رُجوع کیا جا سکتا ہے؟

جواب: آپ کا اُستاد آپ کو Law پڑھاتا اور اُس کی Interpretation بتاتا ہے...... اُس کے تمام باریک نکات سمجھاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انجان شخص آپ کو یہ سب پڑھانے کی کوشش کرے تو آپ اُس سے پڑھیں گے نہ اُس کی بتائی گئی باتیں امتحان میں لکھیں گے۔

آپ صرف وہ کیجیے جو آپ کے مرشد آپ کو بتاتے ہیں...... جن کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی ہے۔ آپ ہر معاملے میں صرف اُن سے رجوع کریں...... کسی اور کے پاس مت جایئے خواہ وہ کسی بھی مقام پر فائز ہوں...... ہاں البتہ اگر آپ کے مرشد آپ کو Refer کر دیں تو پھر آپ کسی دوسرے صاحب علم کے پاس ضرور جایئے۔

سوال: کیسے پتا چلتا ہے کہ ہماری رُوح سے مطابقت رکھتے الفاظ کون سے ہیں؟

جواب: آپ ہر طرح کی Guidance (راہنمائی) کے لیے اپنے مرشد کے پاس جایئے آپ کے مرشد یقیناً صاحب علم ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ آپ کی روح سے مطابقت رکھتے الفاظ کون سے ہیں۔ اس

لیے آپ صرف وہ پڑھیئے جو آپ کے مرشد آپ کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کے کہنے پر کچھ مت پڑھیے۔

سوال: آپ نے فرمایا کہ جوں جوں رُوح کی لطافت بڑھتی ہے، رُوح سیر کرتی ہے...... یہ سیر جاگتے میں ہوتی ہے یا خواب میں؟

جواب: جو کچھ بھی خواب میں دیکھیں، خاموشی سے پی جائیں۔ جس کو خاموشی سے پی جائیں، اُس پر مثبت یا منفی کوئی عمل نہیں ہو پائے گا۔ آپ صرف وہی کیجیے جو آپ کے مرشد آپ کو کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ بڑی سادہ سی بات ہے۔

جو لوگ میرے پاس آتے ہیں اُن کی ضد ہوتی ہے کہ میں اُن کے خواب سن کر تعبیر دوں۔ وہ یہ بھی توقع کر رہے ہوتے ہیں کہ میں اُن سے کہوں کہ آپ تو بہت بلند مقام پر پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ آپ کا یہ خواب تو آپ کے ولایت کے اعلیٰ مقام پر ہونے کی نشانی ہے۔ آپ کو خواب میں بتایا جاتا ہے کہ فلاں وظیفہ ضرور پڑھیں یا فلاں جگہ پر ضرور جائیں۔ میں آپ کا یہ خواب سن کر عرض کرتا ہوں کہ آپ اِن چیزوں میں پڑنے کے بجائے اِنھیں نظر انداز کر دیں اور مرشد صاحب کی ڈائریکشن پر عمل کریں۔

سوال: رُوح انتہائی لطیف شے ہے۔ اگر یہ لطیف رُوح کسی ایسے کثیف جسم جو یہودی یا نصرانی ماحول میں بستا ہو، اُس میں آ جائے تو اس میں اُس لطیف رُوح کا کیا قصور۔ قصور تو ماحول کا ہے۔ انسان ایسے ماحول میں خود کو کیسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

جواب: فقر میں انسان کے نزدیک دوسرے سبھی لوگ بہت اچھے، نیک اور پرہیز گار ہیں...... وہ خود بُرا ہے۔ اس لیے آپ کسی یہودی، نصرانی کو بُرا نہ کہیں جب کہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے کہ اہلِ کتاب میں سے بھی کچھ لوگ صاحب علم ہیں۔

ہمیں کیا معلوم کہ جس کو ہم بُرا سمجھ رہے ہیں، وہ علم کے کس مقام پر ہے۔ وہ کثیف جسم اس لیے کثیف نہیں ہے کہ وہ کسی یہودی یا عیسائی کا ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ کثیف جسم میں لطیف رُوح داخل ہو جائے تو اُس کا جسم پر کیا اثر ہوگا؟ تو صاحب! اصل چیز تو رُوح ہے جسم کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر لطیف رُوح کثیف جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو وہ جسم آہستہ آہستہ خود بخود لطیف ہو جائے گا اور اس کی کثافتیں ڈھل جائیں گی کیونکہ رُوح انسان کو Drive کرتی ہے اور جسم Instrumental ہے رُوح کا۔ رُوح انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ میں کن بُری حرکتوں میں پڑا ہوا ہوں۔ اِس احساس کی بنا پر وہ نیکی کی طرف چلا جائے گا۔ یوں گناہوں کی کثافت ڈھل جائے گی اور جسم لطیف ہو جائے گا۔

سوال: اولیائے کرام کو زمین و آسمان کا جو علم عطا ہوتا ہے، اُس کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ نیز کیا وجہ ہے کہ تمام ایجادات یا دریافتیں غیر مسلم ہی کر رہے ہیں؟

جواب: علم لدنی یا علم باطنی کائنات کا اندرونی علم ہے جو کسی بھی شخص کو اُس کی نیکی کے جواب میں رب کی طرف

سے عطا ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ جس سے راضی ہوتا ہے، اُسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے، اُسے علم عطا فرماتا ہے اور جسے علم عطا فرماتا ہے اُسے عقل عطا فرما دیتا ہے۔ جسے دین کی سمجھ عطا

علم لدنی اپنے اندر تمام علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو علم لدنی عطا فرمایا ہو، وہ دیگر تمام علوم کو خود بخود جاننے لگتا ہے۔ آپ کا سوال اصل میں دو طرح کا ہے...... ایک تو یہ کہ یہ کیسا علم ہے؟ اور دوسرے یہ کہ ساری ایجادات غیر مسلم ہی کیوں کر رہے ہیں؟

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ہم لوگوں کے درمیان دنوں کو پھیرتے رہتے ہیں......'' ہر شخص پر اچھے اور بُرے دن آتے رہتے ہیں۔ ایک شخص انفرادی حیثیت میں اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ گھر کا سربراہ ہونے کی صورت میں خاندان کی ذمہ داری اُس پر ہے۔ اگر وہ ایک قبیلے، شہر یا ملک کا حکمران ہے تو اُس کی ذمہ داری مختلف ہے۔ یہ ایک فرد ہی ہے جو مختلف Capacities میں مختلف دسترس رکھتا ہے۔ اِس لیے رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں صرف چند ایک مقامات پر ایک خاص قوم کو ''یا بنی اسرائیل'' کہہ کر مخاطب فرمایا۔ ورنہ زیادہ تر رب تعالیٰ نے فرد کو مخاطب کیا...... کیونکہ فرد کو مخاطب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فرد کو اس کی موجود Capacity میں مخاطب کیا جائے۔

یہاں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم لوگوں کے درمیان دنوں کو پھیرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر Capacity میں ہیں...... اپنی ذات میں، اپنے خاندان، قبیلے اور ملک کے سربراہ کے طور پر۔ جس طرح افراد پر اچھے بُرے دن آتے رہتے ہیں، قوموں پر بھی اچھے بُرے دن آتے رہتے ہیں۔ قرآن پاک میں مختلف قوموں کے بارے میں یہ ذکر بھی ہوا کہ اُنھیں عروج عطا کیا گیا لیکن بعد ازاں اُن پر عذاب آیا اور وہ تباہ و برباد ہوگئیں۔ قوم ثمود تہذیب و تمدن میں اب تک گزری تمام معلوم قوموں سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد اسلامی سلطنت وسیع ہوئی، خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب یہ سلطنت 220 مربع میل فی دن کے حساب سے Expand ہو رہی تھی تو مسلمانوں میں بہت بڑے بڑے سائنس دان پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف ایجادات کیں۔

مسلمانوں کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان علم ہندسہ ہے کیونکہ فزکس کی بنیاد علم ہندسہ پر رکھی گئی تھی۔

کوئی تین ماہ قبل میں UK میں تھا۔ فارغ اوقات میں میں ٹی وی چینل پر مختلف شخصیات کے بارے میں کیا جانے والا ایک پروگرام دیکھا کرتا ہوں:

What ancestor did for us?

لیکن اُس روز جب میں نے ٹی وی آن کیا تو اتفاق سے ایک پروگرام چل رہا تھا:

What Muslims did for us?

انگریز ٹی وی اینکر کے الفاظ تھے کہ اگر مسلمان یہ ایجادات نہ کرتے تو آج ہم Dark Age میں رہ رہے ہوتے۔ اُس نے مسلمانوں کے احسانات گنوائے اور رازی کے کارہائے نمایاں کا بالخصوص ذکر کیا اور اُسے خراج عقیدت پیش کیا۔

مسلمان سائنس دان بہت بڑا کام کر گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اچھا دور بہت مختصر رہا لیکن بُرے دنوں کی مار کچھ زیادہ لمبی ہوگئی ہے۔ میں غیر مسلم سائنس دان کی خدمات کو قطعاً حقیر نہیں جانتا...... انھوں نے انسانیت پر بہت احسانات کیے ہیں۔

لیکن آپ نے جو سوال پوچھا ہے کہ غیر مسلم ہی یہ ایجادات اور دریافتیں کیوں کر رہے ہیں؟ تو میں اس کا جواب دے رہا ہوں کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں بہت ایجادات کی ہیں اور مغرب کے لیے مزید ایجادات کے لیے بنیاد فراہم کی ہے۔ جب غیر مسلموں نے سپین کو لوٹا تو وہاں سے ملنے والے مسلمانوں کے قلمی نسخے مزید ایجادات کی بنیاد بنے۔ ماضی میں شاید وہ اس کو نہ مانتے ہوں لیکن آج وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ایجادات کی بنیادیں مسلمانوں کے کیے گئے بنیادی کام پر رکھی ہیں...... یوں اس کا اصل کریڈٹ مسلمانوں کو جاتا ہے۔

ہمیں تھوڑا سا یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری آنکھیں دوبارہ کھول دے اور ہم پھر سے عروج کی طرف چلے جائیں۔ جس روز ہم نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا اُس روز ہم اُن پر شرمندہ ہونا بھی شروع کر دیں گے۔ جب ہم شرمندہ ہوں گے تو اپنی غلطیوں کو ٹھیک بھی کر لیں گے۔ ان شاءاللہ۔

سوال: کیا علم لدنی رکھنے والے صاحبان ایڈز، کینسر یا دیگر لاعلاج امراض کے علاج میں مدد نہیں دے سکتے؟

جواب: رب تعالیٰ جتنا بھوکے پیٹ میں آ کر بستا ہے اُتنا کہیں اور نہیں بستا۔ اِس لیے تقویٰ کے حصول کے لیے روزہ کی بہت اہمیت ہے۔ جہاں بھوک اور غربت ہو وہاں انسان بہت سی برائیوں سے بچا رہتا ہے۔

''صوم'' عربی میں رُکے رہنے کو کہتے ہیں...... رُوحانیت کی راہ پر آنے والے زیادہ تر لوگ مادی لحاظ سے کچھ زیادہ Affluent نہیں تھے۔ جو مادی لحاظ سے خوش حال تھے اور جن کے ہاتھ میں بادشاہت تھی وہ بھی جب اس راہ پر آئے تو بادشاہت کو لات ماری اور رضا کارانہ طور پر غربت میں چلے گئے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہل فقر عموماً خلق خدا سے زیادہ میل جول نہیں رکھتے۔ جیسا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ صاحب اور حضرت بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ صاحب نے فرمایا تھا کہ فقیر پر لازم ہے کہ وہ کم سے کم لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اہلِ فقر حصول علم کی سٹیج پر ہوتے ہیں تو دُنیا اور لوگوں سے کٹ جاتے ہیں۔ عبادات میں زیادہ مصروف ہونے کی وجہ سے دُنیاوی کتابوں کا مطالعہ چھوڑ دیتے ہیں۔

ولایت کے درجے تک پہنچنے میں چونکہ طویل عرصہ لگتا ہے اس لیے اُن کی یہ عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں اور بعد میں بھی اُن کا یہی وتیرہ رہ جاتا ہے۔ جب انسان Financially affluent نہیں ہوگا تو لوگوں سے اس کا میل جول کم ہوگا...... فرصت میسر ہوگی...... کیونکہ فرصت کا جو لمحہ ملے گا اُس میں وہ رب کی یاد شروع کر دے گا۔ اِس راہ میں کتھارسس (Catharsis) بہت اہم چیز ہے کہ انسان تنہائی میں بیٹھ کر اپنا کتھارسس (Catharsis) خود کرتا ہے۔ روزانہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا کتھارسس (Catharsis) بہت ضروری ہے...... ورنہ

انسان کہیں نہیں پہنچ پاتا۔ اس لیے فقیر کو جہاں تنہائی میسر آتی ہے، وہ رب تعالیٰ کی عبادت شروع کر دیتا ہے یا پھر تنہا بیٹھا غور و فکر میں ڈوب جاتا ہے..... نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دُنیاوی چیزوں سے کٹ جاتا ہے۔ پھر اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے کہ اُس کی رُوحانی سیر شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں اُسے وقت ملا وہ سیر اور ملاقاتوں کو نکل گیا۔ بظاہر تو وہ سامنے بیٹھا نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ رُوحانی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ اب وہ بزرگ جن کا نام سن کر ہی ہم پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں، جب اُن سے فقیر کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اُن کو چھوڑتا نہیں۔ یوں یہ دُنیاوی چیزیں اُسے ہیچ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ایسے لوگ ایجادات نہیں کر پاتے۔ لیکن اگر آپ اُن سے کوئی مشورہ مانگ لیں تو وہ بڑا صحیح مشورہ دیتے ہیں۔ کسی گزشتہ نشست میں میں نے آپ کو اپنی مرسیڈیز کے بلور کا قصہ سنایا تھا جس میں لگانے کے لیے جب مجھے ایک پلیٹ دی گئی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بلور میں فٹ کیسے ہوگی۔ حالانکہ میں نے بچپن سے ہی آٹوموبیل انجینئرنگ کو بطور Hobby (مشغلہ) اپنایا ہوا ہے۔ کسی زمانے میں جب وقت ہوتا تو ہم اپنے ہاتھ سے مختلف Modifications میں لگے رہتے۔ جب Races میں حصہ لیتے تو گاڑی کو خود Modify کرتے۔ آٹوموبیل انجینئرنگ کو اس حد تک سمجھنے کے باوجود میں وہاں دھوکا کھا گیا کہ مجھے اُس نے پلیٹ غلط دے دی ہے..... لیکن تب بڑے شاہ صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ پکڑی اور اُس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بولے کہ ''تم غلط سمجھ رہے ہو..... یہ پلیٹ اِس انداز میں بلور میں فٹ ہوگی۔'' (حالانکہ شاہ صاحب نے کبھی گاڑی نہیں رکھی تھی، اس کے باوجود وہ اس تکنیک کو سمجھ گئے۔) بعد میں شاہنواز والوں نے بالکل اُسی انداز میں وہ پلیٹ بلور میں فٹ کی جس طرح بڑے شاہ صاحب نے بتایا تھا۔

1979ء میں اِسی طرح ایک روز بیٹھے بیٹھے ایک صاحب نے آکر اُنھیں فیس کریم دکھائی کہ اس کریم سے بچیاں اپنے چہرے پر موجود فالتو بالوں سے مستقل نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ تب شاہ صاحب نے اُنھیں بتایا کہ اس کریم میں فلاں چیز کی کمی ہے..... وہ بھی ڈال لو..... اُس سے یہ زیادہ مفید اور مؤثر ہو جائے گی۔ اِسی اثنا میں مجھے ایک بات سوجھی اور میں نے کہا ''حضور! اس معمولی چیز سے کہیں زیادہ بہتر آئیڈیا تو میں بھی دے سکتا ہوں۔'' کہنے لگے ''وہ کیا؟'' میں نے کہا کہ یہ صاحب آپ سے گنجے سر پر بال اُگانے کا تیل بنانے کا نسخہ کیوں نہیں پوچھ لیتے۔'' بڑے شاہ صاحب نے اُن سے پوچھا کہ آپ وہ تیل کیوں نہیں بنا لیتے؟ وہ بولے ''مجھے نسخہ نہیں معلوم.....!'' بڑے شاہ صاحب نے کہا ''نسخہ میں بتا دوں گا۔'' تب میں نے عرض کی ''تجرباتی تیاری کی لاگت میں ادا کر دوں گا۔''

بڑے شاہ صاحب نے بتایا کہ یہ تیل دو طرح کا ہوگا..... پندرہ دن کے بعد لگانا ہوگا سر پر..... جہاں پیدائشی طور پر بال تھے وہاں Originally بال دوبارہ اُگ آئیں گے۔

1986ء میں جب بڑے شاہ صاحب حالتِ نزع میں تھے لیکن اس کے باوجود مجھے دیکھ کر کہنے لگے ''میں نے تم سے تیل بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ کاغذ پنسل اُٹھاؤ اور اُس کا نسخہ نوٹ کر لو۔ میرے مرنے کے بعد وہ تیل بنا لینا!''

میں مرشد صاحب کو حالتِ نزع میں دیکھ رہا تھا لیکن چونکہ اُنھوں نے مجھے نسخہ نوٹ کرنے کا حکم دیا تھا اِس لیے باوجود اضطراب کے میں وہ لکھتا گیا جو وہ لکھاتے رہے...... حالانکہ اندر ہی اندر تو مجھے یہ فکر تھی کہ میں تو ابھی اِن سے علم سیکھ رہا ہوں...... اگر یہ رُخصت ہو گئے تو میرا کیا بنے گا؟ تب میں نے خود سے کہا کہ آج ایک گستاخی کر ہی ڈالو۔! زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا......؟؟؟ مار پیٹ کر نکال دیں گے لیکن کم از کم مرشد تو ہاتھ سے نہیں جائیں گے! یہ سب سوچ کر میں نے اُن کی پشت پر بیٹھ کر کندھے دباتے دباتے پہلی اور آخری بار اُنھیں دم کر دیا۔ اُن کی شدید تکلیف ٹھیک ہو گئی...... ساتھ ہی گردن موڑ کر بولے "تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے۔" میں نے سوچا کہ اگر میں ہاں کہتا ہوں تو شامت آتی ہے، ناں کہتا ہوں تو جوتے پڑیں گے کہ جھوٹ بولا...... میں نے بات گول کر ڈالی۔

اُس کے بعد میں نے دُعا کی "یا باری تعالیٰ! یہ میرے مرشد ہیں...... اگر یہ چل دیے تو میرا مشن ادھورا رہ جائے گا...... تو اِنھیں کچھ مہلت عطا فرما دے ورنہ میری زندگی کے کچھ سال اِنھیں عطا کر دے۔" کچھ ہی دیر میں جواب آ گیا "مل گئی مہلت......!!!" یوں مرشد صاحب اُس وقت ٹھیک ہو گئے۔ وہ نسخہ معلوم نہیں کہاں پھینک دیا۔ یہ ساری بات سنانے کا مقصد یہی تھا کہ رُوحانیت کی راہ میں انسان کسی دُنیاوی چیز کی پروا نہیں کرتا۔

چند علمی نکات

کچھ لوگوں کے ساتھ جب علمی نکات پر بات ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ معاملہ جواب سمجھ آیا ہے، تین سال پہلے سمجھ کیوں نہیں آیا تھا......؟ تب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ صاحب! اگر آپ آئن سٹائن کی فلاسفی کلاس 5 میں سمجھنے کی کوشش کریں گے تو وہ پلے نہیں پڑے گی۔ یہ فلاسفی تو آپ کو اُس وقت سمجھ آئے گی جب آپ سائنس میں ماسٹرز کر رہے ہوں گے۔ کیا تب آپ ڈنڈا لے کر کلاس 5 کے اُستاد کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ آئن سٹائن کی جو فلاسفی مجھے اب سمجھ آئی ہے، یہ کلاس فائیو میں کیوں نہیں آئی تھی؟

کسی بھی بات کو سمجھنے کے لیے ایک خاص ذہنی استعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ علم اور بات ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی لیکن اُس کو سمجھنے کے لیے انسان کی ذہنی استعداد اپنے وقت پر پیدا ہوتی ہے۔ اِس استعداد کا پیدا ہونا Revolutionary نہیں بلکہ Evolutionary ہے۔ یہ استعداد Gradually increase ہوتی ہے...... یہ سارا Well-integrated سسٹم ہے جس میں پہلے ایک بات سیکھیں گے پھر اگلا نکتہ، پھر اُس سے اگلا نکتہ...... یوں انسان دن بہ دن سیکھنے کے عمل میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ موت تک سیکھنے کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اگر کوئی ایک سٹیج بھی درمیان سے غائب ہو جائے تو انسان اُس کے اُوپر کی چیزیں سیکھ ہی نہیں پاتا...... جس کی وجہ سے مطلوبہ استعداد پیدا نہیں ہو پاتی۔ جسے ہم عُرفِ عام میں کہتے ہیں کہ انسان کے علم میں کچا پن رہ گیا۔

علم کی وہ باتیں جن سے انسان کے اندر سکون پیدا ہوتا ہے، وہ بھی اپنے وقت پر ہی سیکھی جا سکتی ہیں۔ اِس لیے یہ کہنا مناسب نہیں کہ جناب! یہ بات تین سال پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی......!

اِسی طرح بہت سے لوگ بہت تیزی سے میرے قریب آتے ہیں۔ اگر میں اُن کے ساتھ تھوڑا سا کرخت ہو جاؤں تو میری زندگی آسان ہو جائے۔ کچھ لوگ مجھے Decent words میں الزام دیتے ہیں کہ صاحب! قصور آپ ہی کا ہے...... کیونکہ آپ ہر ایک سے اِس انداز میں ملتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے کہ آپ اُس سے بہت close ہیں۔

میں اپنے اس طرزِ عمل کی حکمت آپ کو فقیرانہ انداز میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہ آپ ﷺ کی سنت بھی

ہے اور آپ ﷺ کا حکم بھی کہ آپ ہر ایک سے اتنی محبت سے ملیے کہ ہر آدمی اپنی جگہ یہ سمجھے کہ اُس سے بڑھ کر آپ کو کوئی عزیز نہیں۔

آداب فقیری یا اخلاقِ فقیری کی بھی یہ بنیادی شرط ہے کہ ہر ایک سے محبت سے ملا جائے (میں "محبت" کہہ رہا ہوں، منافقت نہیں......!)

اگر آپ گہرائی سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ فقیر کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ ترکِ سنت نہیں کرتا۔ وہ ہر کام میں آپ ﷺ کی سنت کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آپ سب اچھے اور بھلے لوگ ہیں، آپ سب کی خواہش ہے کہ آپ کو اعلیٰ پائے کی ولایت حاصل ہو جائے تو بھائیو! میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ زندگی میں آپ جب بھی کوئی کام کرنے لگیں، کوئی قدم اُٹھانے لگیں تو یاد کرلیں کہ ایسے کسی بھی موقع پر آپ ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا...... پانچویں کلاس تک آپ نے جو دینیات پڑھی تھی اُس کا ایک بڑا حصہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر مشتمل تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک معجزہ ہے کہ کلاس فائیو تک پڑھی گئی اکثر باتیں ہم بھول چکے ہوں گے لیکن حیاتِ طیبہ سے متعلق پڑھی گئی باتیں انسان کو ساری زندگی نہیں بھولتیں۔ لہٰذا ہم جب بھی کوئی قدم اُٹھانے لگیں، کوئی ری ایکشن Show کرنے لگیں تو پہلے دیکھ لیں کہ آپ ﷺ نے ایسے موقع پر کس طرح Behave کیا تھا۔ صرف یہ کام کرلیجیے...... آپ ولی اللہ بن جائیں گے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ عملی قرآن ہے۔ آپ ﷺ نے قرآنِ پاک کو پوری طرح اپنی زندگی پر Implement کیا ہوا تھا۔ جب ہم سنت کی پیروی کریں گے تو قرآن پاک کی پیروی ہو جائے گی۔ جو آدمی قرآن پاک کی پیروی کرتا ہے وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے اور جو اللہ کا محبوب ہے وہ اُس کے قریب ہے...... اُس کا دوست ہے اور ولی اللہ کہتے ہی اللہ کے دوست کو ہیں۔

اپنی روزمرہ کی Dealings اور نشست و برخاست میں یا کوئی بھی کام سرانجام دیتے ہوئے ہم ذرا سی نظر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر دوڑا لیا کریں کہ اِس موقع پر آپ ﷺ نے کیا عمل فرمایا تھا۔ ہم اُس عمل کی پیروی کرلیں تو پھر ہمیں کسی تفسیر اور فقہ کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ پھر انسان Automatically (خود بخود) اُس اسلام پر عمل کرنے لگتا ہے جو اللہ نے اُتارا تھا۔

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ بابا سید تاج الدین اولیاء صاحب کا حکم آج بھی دُنیا میں جاری و ساری ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: بابا تاج الدین اولیاء صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ خاص انفرادیت بخشی کہ وہ بیک وقت مجذوب بھی تھے اور سالک بھی۔ بڑی شدت کا جذب اُن پر طاری ہو جاتا اور پھر یہ ہوش میں بھی رہتے...... یہ صاحب امر تھے۔

دُنیا میں موجود جو اولیائے کرام صاحب امر ہوتے ہیں اپنی زبان سے جو ادا کرتے ہیں، وہ ہو جاتا ہے۔

پروردگار اپنی رحمت کے صدقے اگر کسی شخص کو دُعا کا وہ مقام عطا فرمادے کہ جہاں اُس کی زبان سے نکلی ہر بات دُعا ہے اور مستجاب ہے تو ایسا ولی اللہ صاحب امر کہلاتا ہے۔ لیکن عموماً اولیاء اللہ کی یہ کیفیت اُن کے دُنیاوی طور پر پردہ کرنے کے بعد قائم نہیں رہتی بلکہ اُس شخص کو ٹرانسفر ہو جاتی ہے جو اُس کی جگہ آ کر بیٹھتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو۔

حضرت بابا سید تاج الدین اولیاء پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت کی کہ اُن کو اجازت فرمادی کہ مرنے کے بعد بھی اُن کی رُوح جو کچھ کہہ دے، وہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی رُوح بھی صاحب امر رہتی ہے۔

سوال: صاحب امر اور اولوالامر میں کیا فرق ہے؟

جواب: اولوالامر وہ ہیں جو اللہ کے احکامات پر بڑی شدت سے عمل کرتے ہیں۔ جب کہ صاحب امر وہ ہیں جو دُعا کے اس مقام پر فائز ہیں کہ اُن کی زبان سے نکلنے والی ہر بات بذات خود دُعا ہے۔ اللہ اُن کی کہی ہوئی بات کو قبول کر لیتا ہے اور اپنی رحمت کے صدقے پورا کر دیتا ہے۔

سوال: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کتاب میں درج ہے کہ اللہ فرماتا ہے "جو اپنے جیسی مخلوق پر بھروسا کرتا ہے میں اُس کو دُنیا میں ذلیل کرتا ہوں اور اُس کے پیروں تلے سے زمین نکال لیتا ہوں......" سوال یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں ایسے لوگوں کو زیادہ کامیاب دیکھتے ہیں جن کے Contacts ہوتے ہیں اور جو سفارش اور رشوت سے کام کروا لیتے ہیں۔

جواب: پہلے تو یہ واضح کر لیں کہ انسان کی اصل کامیابی ہے کیا......؟ دُنیاوی مال و زر، دُنیاوی مرتبہ اور آسائشوں کا حصول کامیابی ہے یا پھر آخرت کی کامیابی ہی دراصل کامیابی ہے۔

ہمارا ایک Concept (تصور) یہیں غلط ہو گیا کہ ہم نے دُنیا کی آسائشوں، مال و زر کی فراوانی، مراتب اور عہدوں کے حصول کو کامیابی سمجھ لیا جب کہ مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کو کامیابی قرار نہیں دیا بلکہ دُنیا کو تو اُس نے بہت حقیر قرار دیا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بھیڑ کے مرے بچے پر گزرے تو فرمایا "تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ یہ اِسے ایک درہم کے عوض ملے؟" صحابہ نے عرض کیا "ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں کسی بھی چیز کے عوض ملے۔" نبی کریم ﷺ "اللہ کی قسم! دُنیا اللہ کو اس سے زیادہ ذلیل ہے، جیسی یہ تمھارے نزدیک۔" (صحیح مسلم، کتاب الزھر والرقاق، حدیث: 7607، صفحہ 210 جلد 8)

دُنیاوی مال و زر اور آسائشوں کا حقارت سے ذکر کیا گیا جب کہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نوید سنائی ہے کہ اگر وہ اِس دُنیا میں اچھے اعمال کریں گے تو اُنھیں اِس کا اجر آخرت میں دیا جائے گا اور اُن کی ابدی زندگی بہت پُر آسائش ہوگی۔

اس لیے ہمیں پہلے اس بات کو Clear کر لینا چاہیے کہ کامیابی درحقیقت ہے کیا......؟ وہ جو دُنیا میں حاصل ہو رہی ہے......؟ یا وہ جو آخرت میں حاصل ہوگی......؟

یاد رکھیے! رب تعالیٰ سرکشوں، مشرکوں اور منکروں کو اُن کی نیکیوں کا اجر دُنیا میں ہی عطا فرما دیتا ہے اور اُنھیں بے پناہ آسائش عطا فرما دیتا ہے۔ یہ قرآن پاک میں بھی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

اب معاملہ واضح ہو جائے گا کہ وہ لوگ جو غیر اللہ پر بھروسا کرتے ہیں اُن کی دُنیا بہت اچھی ہو جاتی ہے لیکن میں یہ بھی Clear کردوں کہ یہ ہماری خام خیالی ہے کہ اُن کی دُنیا بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ جلد یا بدیر اُنھیں اپنے اعمال کا نتیجہ اُس دُنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ جو لوگ Contacts یا قوتِ بازو پر زندہ رہتے ہیں...... دوسروں کا حق مارتے ہیں...... اُن کا انجام کبھی بخیر نہیں ہوا۔

اِس لیے اس دھوکے میں مت آیئے کہ غیر اللہ پر بھروسا کرنے والے کامیاب و کامران ہیں۔ درحقیقت کامیاب و کامران صرف وہی ہیں جن کی آخرت اچھی ہے۔

اِس کی ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ اِسی شہر لاہور میں داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ابدی آرام فرما رہے ہیں۔ اُن کے وصال کو 968 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے بڑے سے بڑا کامیاب آدمی مثلاً وزیر اعظم یا وزیر مشیر بھی جب وہاں حاضری دیتا ہے تو واپسی پر اُلٹے قدموں چلتا ہے اور احتراماً مزار کی طرف پشت نہیں کرتا۔ دُنیا میں موجود نہ ہونے اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کے باوجود داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تقسیم ہونے والے لنگر سے دس ہزار سے زائد لوگ روزانہ کھانا کھاتے ہیں۔ اِس کے برعکس دُنیاوی لحاظ سے کامیاب انسان کے ہاں سے دس لوگ روز کھانا نہیں کھا سکتے۔ وہ کامیاب شخص چند روز میں تنگ آ جائے گا۔

آپ شاہ ایران کو لے لیجیے۔ وہ دُنیاوی طور پر بہت کامیاب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دُنیا میں طاقت اور دولت دونوں چیزیں عطا کی تھیں...... لیکن مرنے کے بعد وہ سات فٹ زمین کے لیے ترستا رہا۔ جہاز اُس کی Dead body لیے کبھی کہیں تو کبھی کہیں اُڑتا رہا۔ آخر اُس کے Ex-in-laws نے رحم کھا کر اُسے مصر میں دفن کرنے کی جگہ دے دی...... شاہ ایران وہ شخص تھا جو بڑے طمطراق سے دُنیا میں حکومت کرتا رہا تھا۔ خود ہمارے اپنے ملک میں مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں نے بڑے جبر سے حکومت کی، اُن کے مرنے کے بعد اُن کی اولاد تک اُن کا منہ نہ دیکھ سکی۔ اِس کے برعکس اولیاء اللہ جو ساری زندگی بڑی عاجزی کے ساتھ لوگوں کے جوتے سیدھے کرتے رہے، لوگوں کی خدمت کرتے رہے، رب تعالیٰ نے اُنھیں دُنیا میں بھی عزت عطا فرمائی اور مرنے کے بعد بھی عزت دی۔ اصل کامیابی یہی ہے۔ یوں اللہ پر بھروسا کرنے والا بندہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا عورتیں دوزخ اور مرد جنت میں جائیں گے؟ جنت میں جانے کے لیے کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے؟

جواب: صاحب! میرے پڑھنے میں یہ بات نہیں آئی کہ عورتیں دوزخ میں جائیں گی اور سارے مرد جنت میں جائیں گے۔ چاہے مرد ہو یا عورت، اُس کے اعمال کے مطابق اُس کے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔ غالباً یہ

کہنا بھی غلط ہے کہ ویسا ہی سلوک کیا جائے گا کیونکہ اللہ تو سب کے ساتھ رحمت اور مہربانی کا سلوک فرمائے گا۔ ہمیں اُس کی رحمت سے یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمادے گا اور جنت کے دروازے ہم پر کھول دے گا تاوقتیکہ ہم نے شرک نہ کیا ہو!

خواتین ہوں یا مرد...... کسی بھی چکر میں پڑنے کے بجائے صرف ایک کام کر لیجیے کہ آپ جو بھی قدم اُٹھائیں، اُس سے پہلے آپ ﷺ کا عمل دیکھ لیں۔ مثلاً کسی آدمی نے آپ کی بُرائی کی۔ وہ بات آپ تک پہنچی کہ فلاں آدمی نے آپ کی غیر موجودگی میں آپ کو گالیاں دی ہیں تو آپ کوئی بھی ردعمل ظاہر کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا عمل کیا تھا۔ ہم اُس عمل کی پیروی کر لیں۔ اگر کسی شخص نے ہمارے منہ پر دو چار سخت قسم کی گالیاں دے دیں تو اُسے جواب میں گالی دینے یا تھپڑ مارنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا کیا سلوک رہا۔ اگر کسی شخص کو ہم نے کوئی گناہ کرتے دیکھ لیا ہے تو بجائے کسی دوسرے شخص کے پاس جا کر یہ کہنے کے کہ تمھیں پتا ہے یار! فلاں آدمی کو ہم بڑا نیک سمجھتے تھے لیکن وہ تو اندر سے بہت بُرا نکلا......!!! ہم یہ دیکھ لیا کریں کہ ایسے کسی بھی موقع پر آپ ﷺ نے دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی کی یا اُن کا ڈھنڈورا پیٹا۔ ہم آپ ﷺ کے عمل کی پیروی کر لیا کریں۔ ہم سے کوئی قرض مانگنے آ گیا۔ ہم نے مہربانی کر کے اُسے دے دیا جو کہ وہ لوٹا نہ سکا۔ ہم ایسے موقع پر آپ ﷺ کا عمل دیکھ لیں کہ آپ ﷺ نے مقروض کو معاف فرما دیا یا ہماری طرح لوگوں کے پاس جا کر رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ دیکھو! وہ مجھ سے دس روپے مانگ کر لے گیا کہ کل واپس کر دوں گا۔ آج تک نہیں آیا۔ کھا گیا میرے پیسے۔ اگر ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سلسلے میں بھی سنت کو دیکھ لیں اور اُس کی پیروی کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جنت میں نہ جائیں...... چاہے وہ کوئی عورت ہو یا مرد۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے ہمیں ان شاء اللہ ضرور جنت میں بھیجے گا اور دُنیا میں بھی عزت عطا فرمادے گا۔

سوال: حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کے علاوہ ولایت میں کسی معروف خاتون ولی اللہ کا نام نہیں ملتا۔ کیا خواتین رُوحانی درجات حاصل نہیں کر سکتیں؟

جواب: حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا نام اس لیے زیادہ سامنے آتا ہے کیونکہ وہ ولایت کے بہت اعلیٰ مقام پر فائز ہوئیں...... اور علم کے اُس مقام پر گئیں جس پر مرد بھی بہت کم پہنچ پائے ہیں۔ اس لیے جگہ جگہ بی بی رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا نام آتا ہے۔ لیکن ہزاروں کی تعداد میں ایسی خواتین گزری ہیں جو اپنے وقت کی ولی اللہ تھیں۔ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی والدہ محترمہ ولی اللہ تھیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ بھی ولی اللہ تھیں۔ اس طرح نام گنوانے پر آؤں گا تو یہ تعداد ہزاروں میں سامنے آئے گی۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد اولیاء اللہ اور خواتین اولیاء اللہ کی تعداد میں فرق ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عورت کی ذمہ داریاں بے پناہ قسم کی ہیں۔ وہ تارک الدُنیا ہو کر صرف رُوحانیت کی راہ پر نہیں چل سکتیں چونکہ اُنھیں اپنی تمام تر ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں اُس لیے وہ اُس راہ پر زیادہ تر نہیں آتیں۔

ایک بات یاد رکھیے کہ اگر کوئی خاتون اپنی ذمہ داریاں بحیثیت ماں، بیوی اور بیٹی پوری کر رہی ہے تو یقین رکھیے کہ وہ اسی کے صدقے بخش دی جائے گی کیونکہ اُس کی عبادت اپنی ذمہ داریوں کو بااحسن وخوبی سرانجام دینے میں مضمر ہے۔

سوال: کیا علم لدنی بھی Evolutionary عمل ہے؟

جواب: علم خواہ دُنیاوی ہو یا لدنی، اس کی ترقی Revolutionary نہیں بلکہ Evolutionary ہے۔ آپ کائنات دیکھ لیجیے۔ اِس میں رب تعالیٰ کا سلوک Revolutionary نہیں بلکہ Evolutionary ہے۔ دن رات کا بدلنا ہی دیکھ لیجیے...... کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ چھ بجے تک دن ہے اور چھ بج کر ایک منٹ پر یک دم گہری رات ہو جائے۔ دن آہستہ آہستہ ڈوبتا ہے اور رات بتدریج آتی ہے۔ اسی طرح روشنی اور دن کا طلوع ہونا بھی بہت Gradual (بتدریج) ہوتا ہے۔ موسموں کے بدلنے میں بھی تدریج نظر آتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اپریل سے لے کر پندرہ اکتوبر تک گرمیاں چل رہی ہوں اور سولہ اکتوبر کو سخت سردی شروع ہو جائے۔ خود انسانی پیدائش اور موت کا عمل بھی Gradual ہے۔ درختوں، پودوں میں بیج ڈالنے سے اُن کی موت تک کا تمام عمل بڑا Gradual ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے رات کو بیج ڈالا...... صبح اُٹھ کر دیکھا تو وہ بیج ایک تناور درخت میں ڈھل چکا تھا۔ اِسی طرح پہاڑوں کے بننے میں سینکڑوں صدیاں لگتی ہیں۔ اِسی طرح اُن کے ٹوٹنے میں بھی طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج ہے...... کوئی کام یک لخت نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں پائیداری بہت ہے۔ وہ چیزیں جو Evolutionary طریقے سے وجود میں آتی ہیں، وہ پائیدار ہوتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی پہاڑ کی مثال دی کہ اُسے بننے میں کئی ہزار سال لگتے ہیں۔ دیکھیے یہ کتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اُس کے ٹوٹنے میں بھی کئی ہزار سال لگتے ہیں۔ چوہے اور خرگوش کا Gestation time بہت کم ہے، اُن کا لائف ٹائم بھی اُتنا ہی چھوٹا ہے۔ خرگوش اِتنا کم حوصلہ ہوتا ہے کہ ذرا سی بات پر خوف زدہ ہو کر مر جاتا ہے۔ گھوڑے کا Gestation time ایک سال ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ کس قدر طاقت ور جانور ہے اور کیسے کیسے کام سرانجام دیتا ہے۔ ہاتھی کا Gestation time دو سال ہے، آپ اُس کی قوت اور جثہ دیکھیے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ جو چیز جس قدر تدریج سے وجود میں آئی ہے وہ اُسی قدر پائیدار ہے۔ جو چیز یک لخت عمل سے وجود میں آتی ہے وہ اُتنی ہی Short-lived ہوتی ہے۔ علم بہت پائیدار چیز ہے اس لیے یہ Gradually آتا ہے...... یک لخت نہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی سنت کو زندہ کرنے والے شخص کو ستر شہداء یا بعض روایات کے مطابق سو شہداء تک کا ثواب دیا جاتا ہے۔ کیا دُنیا سے پردہ کر جانے کے بعد ایسے اشخاص کا جسد خاکی مٹی میں مل جاتا ہے یا شہدا کی مانند باقی رہتا ہے؟

جواب: یہ مراتب کی بات ہے۔ شہید کے زندہ ہونے میں کوئی شک نہیں...... وہ ہماری طرح کھاتے اور پیتے ہیں...... یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی عزیز ترین چیز یعنی جان کی قربانی دی،

اُس کا انعام اُنھیں یہ دیا جاتا ہے کہ "وہ زندہ ہیں مگر تمھیں اس کا شعور نہیں......" جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ سنت زندہ کرنے پر ستر شہیدوں کا ثواب ملے گا تو ایسے شخص کو ستر شہداء کے برابر ثواب دے دیا جائے گا۔

وہ جو اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والے شہید کی بات ہے...... وہ مرتبے کی بات ہے جب کہ سنت زندہ کرنے والے کے مرتبے نہیں بلکہ ثواب کی بات ہے۔ کیونکہ شہید کو دو انعام ملے...... ایک ثواب اور دوسرا مرتبہ...... یہ مرتبہ انعام ہے۔ جب کہ ثواب اُن کے فعل کا اجر ہے۔ سنت زندہ کرنے کی صورت میں اجر کے طور پر اتنا ثواب ملا جتنا ستر شہیدوں کو ملتا ہے یا پھر ایک آدمی کے ستر مرتبہ شہید ہونے پر دیا جاتا ہے...... لیکن یہاں مرتبہ کا ذکر نہیں ہے اس لیے جسم کا مٹی میں مل جانا ایک طبعی امر اور Law of nature ہے جو تقریباً سب کے لیے عائد ہوتا ہے۔

میں اس ضمن میں عرض کر دوں کہ میں زیادہ زور عملی زندگی پر دیتا ہوں کہ ہماری عملی زندگی ایک اچھے مسلمان کی سی ہو جائے۔ شہید کی زندگی کا عملی پہلو اگرچہ آپ سب جانتے ہیں پھر بھی صرف یاد دہانی کروانا چاہتا ہوں کہ شہید کا یہ مرتبہ، اجر اور انعام ہے کہ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں چلا جائے گا۔ اُس سے کسی قسم کی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے سوائے اِس کے کہ اُس نے کسی کا قرض ادا کرنا ہو تو وہ معاف نہیں ہو گا۔ اس لیے میں عملی زندگی کو سنت نبوی ﷺ کے سانچے میں ڈھالنے پر اِتنا زور دیتا ہوں۔ آپ دیکھ لیجیے کہ شہید جس کا اِتنا بڑا اجر اور مرتبہ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے (جو یقیناً سچ ہے) وہاں بھی ایک قید ہے کہ اگر اس نے کسی انسان کا قرض دینا ہے تو وہ معاف نہیں ہو گا۔

بد قسمتی سے ہمارا تمام زور عملی زندگی کو بہتر بنانے کی بجائے تسبیحات پر چلا گیا۔ لوگ دُعا کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ اِس دوران یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ وہ قرآن پاک جسے دُنیا میں لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُتارا گیا تھا، لوگ اُسے دُنیا کمانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں...... حالانکہ قرآن پاک کے نزول کا مقصد تو یہ تھا کہ ہماری عملی زندگی اُس طرح ہو جائے جس طرح رب چاہتا ہے۔ قران پاک میں دُنیاوی مال و زر، دُنیاوی آسائش اور مادی چیزوں کے حصول کی حیثیت کم تر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ قرآن ہمارے دل سے دُنیا کی محبت نکالتا اور آخرت کی محبت ڈالتا ہے۔ لیکن ہم جس ڈگر پر چلتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن جو ہمارے دل سے دُنیا کو نکالنے کے لیے اُتارا گیا تھا تاکہ ہمارے دل میں آخرت کی محبت پیدا ہو جائے...... ہم اللہ کی راہ پر چلنے لگیں اور سیدھا راستہ Follow کر لیں...... ہم اُسی قرآن کو دُنیا کمانے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ صاحب مجھے کوئی ایسی آیت بتا دیجیے جس سے مجھے اپنے بچے کی تربیت نہ کرنی پڑے...... تربیت نہ ہونے کے باوجود وہ نافرمان نہ نکلے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ہمارا فرماں بردار نہیں نکلتا، ایک اچھا انسان نہیں بنتا تو یہ ہمارا Fault ہے کہ ہم نے بطور ماں باپ اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دی۔ ہم بجائے اپنا فرض ادا کرنے کے کسی آیت کی تلاش

میں رہتے ہیں کہ جس کو ہم پڑھیں تو ہمارا بچہ بہترین انسان بن جائے۔ اِسی طرح ہمارا قرض اُس وقت اترے گا جب ہمارے پاس پیسہ آئے گا، رزق آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ کا کوئی فرشتہ آ کر اتنی رقم دے جائے کہ جس سے میرا قرض اُتر جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرض کی ادائیگی کے لیے مجھے ہاتھ پاؤں ہلانا ہوں گے، محنت کرنا ہوگی۔ اِس کے انعام کے طور پر رب تعالیٰ مجھ پر رزق وسیع کر دے گا اور اُمید ہے کہ اپنی رحمت کے صدقے میری محنت سے کئی ہزار گنا زیادہ انعام دے گا تو اُس سے قرض اُتر جائے گا۔ لیکن یہ طریقہ مناسب نہیں کہ صاحب! کوئی آیت بتا دیجیے، کوئی وظیفہ بتا دیجیے جس کو پڑھنے سے قرض اُتر جائے۔ مجھے خوف آتا ہے کہ کل کو کوئی آ جائے کہ صاحب! کوئی آیت بتا دیں کہ ہمیں ایک گولی بھی نہ چلانا پڑے اور ہمیں انڈیا پر فتح حاصل ہو جائے۔ ہر مسئلے کے حل کے لیے تسبیحات کی تلاش میں رہنا مسلمان کی راہ نہیں ہے۔

ایک سادہ سی بات عرض کر دوں کہ ہر وہ کام جو آپ ﷺ نے کیا، آپ ﷺ کے صحابہؓ نے کیا، وہ حق اور سچ ہے...... آنکھیں بند کر کے اُس کی پیروی کر لیں۔ لیکن اگر کوئی بات آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی حیاتِ مبارکہ سے ثابت نہیں ہوئی اور نہ ہی اُس پر کوئی اجماع موجود ہے تو اُس سے گریز کر لیجیے...... وہ اسلام کے مطابق نہیں ہے۔

کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ آپ ﷺ تو پیغمبر تھے...... ہمارا اور اُن کا کیا مقابلہ......!!! یہ دلیل درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بشر کی شکل میں پیدا کیا اور آپ ﷺ نے بشری زندگی اختیار ہی اِس لیے کی تھی تا کہ اُن کی اور ہماری زندگی میں کوئی فرق نہ رہ جائے اور ہم آسانی سے اُن کی پیروی کر لیں۔

صحابہ کرامؓ کی زندگی ہی کو لے لیجیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے زیادہ عسرت کی زندگی کس نے بسر کی ہے؟ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کبھی کسی پیر کے پاس گئے ہوں کہ دُعا کر دیں، میرا رزق بڑھ جائے۔ یا مجھے کوئی تسبیح دے دیں جس کو پڑھنے سے میرا رزق کھل جائے۔

قرآنِ پاک کو ہم اپنی زندگی سنوارنے کے لیے استعمال کریں، تسبیحات کی طرف نہ جائیں کیونکہ اس کی وجہ سے ہم عمل سے دُور ہو جائیں گے۔ ہمارا زیادہ زور اِس بات پر ہونا چاہیے کہ ہماری عملی زندگی جس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ Interaction ہوتا ہے، اُسے کسی طرح سے اُس سانچے میں ڈھال لیں جو قرآن نے بتایا ہے...... ایسا کرنے سے بے عملی کی راہ سے خود بخود ہماری جان چھوٹ جائے گی۔

مرنے کے بعد ہماری ارواح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہیں جہاں دو درجات...... علیین اور سجین ہیں۔ ایک درجے علیین میں اُن لوگوں کی ارواح رہتی ہیں جو بہت نیک اور اللہ کے پسندیدہ ہیں جب کہ دوسرے درجے سجین میں گناہ گار لوگوں کی ارواح رہتی ہیں۔ ارواح کا تعلق عموماً اپنی قبر کے مقام سے ضرور رہتا ہے۔ چونکہ ایک عام آدمی رُوحانی بالیدگی کے اُس مقام پر نہیں ہوتا کہ اُسے کشف القبور حاصل ہو یا اُس کو رُوحیں دکھائی دے سکیں اس لیے اُسے پتا نہیں چلتا کہ کوئی رُوح اِس وقت اپنی قبر میں موجود ہے یا نہیں۔

مثال کے طور پر آپ اس وقت یہاں تشریف رکھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ یہاں سے کراچی یا کسی

دوسرے شہر چلے جائیں تو آپ یہاں موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ کوئی بندوبست نہیں کر کے گئے تو آپ کے پیچھے آپ کے گھر کا کچن نہیں چل سکتا۔

داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لنگر کے حوالے سے میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہاں اِس طرح موجود نہیں ہیں کہ دُنیاوی طور پر کما کر لنگر کا خرچ چلا رہے ہوں۔ لیکن یہ رب کی رحمت ہے اور اُس زندگی کا انعام ہے جو داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گزاری کہ اُن کے وصال کے بعد اللہ نے اُن کا نام سربلند کر دیا اور یہ اعزاز بخش دیا کہ اُن کے لنگر سے روزانہ تقریباً دس ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں۔ میں اُسی انعام کو بیان کر رہا تھا۔

سوال: زندہ انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ وہ بیک وقت کئی مقامات پر موجود ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے وہ جھلک اور نظارے دیکھے ہیں جو شاہ صاحب آپ ہی کی شخصیت سے متعلق ہیں۔

جواب: خالد صاحب! یہ 1987ء کا قصہ ہے۔ میں نے اُس وقت بھی آپ سے گزارش کی تھی کہ جس مقام پر آپ نے مجھے دیکھ لیا ہے اُس کا ذکر کہیں نہ کیجیے گا۔ اِس کے بعد بھی جب ایک دو بار آپ نے ایسا ذکر کیا تو میں نے گزارش کی تھی کہ اِسے زبان پر نہ لایا کریں کہ میں کس وقت کہاں پر تھا۔

دیکھیے آپ جو بات کر رہے ہیں وہ ابدال کا مقام ہے۔ یہ خاصیت ابدال کی ہے کہ رب تعالیٰ اُن پر یہ رحمت فرماتا ہے کہ وہ رُوحانیت کے اُس مقام پر چلے جاتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں دو تین جگہوں پر دیکھے جاتے ہیں۔ اب یہ مقام اور صلاحیت تو حاصل ہوگئی...... جب آپ اِس مقام سے ترقی کر کے قطب کے مقام پر چلے جاتے ہیں تو ابدال کی صفات بھی آپ میں موجود رہتی ہیں اور اِس کے ساتھ قطب کی صفات بھی آپ کو عطا کر دی جاتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ اگر آپ ڈپٹی سیکرٹری ہیں تو آپ کے پاس کچھ اختیارات ہوں گے۔ کل کو ترقی پا کر جب آپ جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر گئے تو اُس کے اختیارات بھی آپ کو حاصل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ بحیثیت ایڈیشنل سیکرٹری فرائض سرانجام دینے لگے تو اُس وقت جو اختیارات آپ کو حاصل ہیں اُن میں وہ اختیارات بھی شامل ہیں جو بطور ڈپٹی سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری آپ کو حاصل ہوئے تھے۔

یوں آگے کی بات، جس کا میں آپ کو جواب دے رہا ہوں، یہ ہے کہ وہ صفات ابدال سے شروع ہوتی ہیں اور غوث تک چلی جاتی ہیں۔

سوال: اگر مناسب ہو تو اِس مجلس کے آخر میں ایک اجتماعی دُعا بھی فرما دیا کریں تاکہ ہم سب کے لیے مزید سکونِ قلب اور خیر و برکت کا باعث ہو۔

جواب: اجتماعی دُعا کرنے میں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن حضور! آپ ایک بات فرمایئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تو نماز کے بعد بھی دُعا کا رواج نہ تھا۔ نماز تو خود ایک دُعا ہے...... سلام پھیرا اور اُٹھ گئے۔ وہ لوگ انفرادی طور پر دُعا مانگتے تھے۔ اجتماعی عبادت کا تصور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں نہیں تھا۔ صرف فرض نماز، نماز

عیدین، نمازِ استسقاء اور نمازِ جنازہ باجماعت پڑھی گئیں، سنتیں، اور نوافل انفرادی طور پر پڑھے گئے۔ حلقہ باندھ کر نفلی عبادت کرنے کا تصور وہاں نہیں تھا۔

اجتماعی دُعاؤں کا رواج پاکستان میں ہندوؤں سے آیا۔ مجھے اس مجلس کے اختتام پر دُعا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ ثواب کا کام ہے۔ لیکن میری عرض ہے کہ آپ بہت سے قائم شدہ غلط تصورات سے باہر نکل آیئے۔ دُعا ضرور مانگیے، اجتماعی دُعا بھی مانگیے لیکن تصور Clear رہے۔

سوال: معاشرہ میں بہتری کس طرح ممکن ہے؟

عملی زندگی کو خوب صورت بنانے کے لیے عبادت میں کس پہلو کو مدنظر رکھیں۔

کیا آپ اپنی رُوحانی سیر کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ اِس کرۂ ارض کے علاوہ بھی کہیں مخلوق پائی جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: معاشرہ میں بہتری تو راتوں رات بھی آ جائے گی...... اور بہتری کبھی بھی نہیں آئے گی۔ دونوں ہی باتیں ہیں۔ جب تک ہمارا رویہ یہ رہے گا کہ "دوسرے ٹھیک ہو جائیں" بہتری کبھی نہیں آئے گی۔ جس دن یہ رویہ ہو گیا کہ "میں ٹھیک ہو جاؤں، دوسرے بھلے جو مرضی کرتے رہیں...... مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے۔" تب راتوں رات تبدیلی آ جائے گی۔ اور ایک ہی رات میں معاملات سدھر جائیں گے۔ تسبیحات سے زیادہ عملی زندگی پر جو میں زور دے رہا تھا اس سے کہیں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ میں عبادت کے خلاف ہوں...... ایسی بات نہیں ہے۔ میری گزارش ہے کہ ہم عبادات بالکل اُسی انداز میں کریں جو آپ ﷺ کا طریقہ تھا آپ ﷺ سے زیادہ عبادت گزار کون ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اسلام کے بارے میں Selective نہ ہوں اور اُس پر By parts عمل نہ کریں کہ جو چیز ہمیں اچھی لگے، اُسے اپنا لیں...... باقی سے پہلو تہی کر لیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کو اپنے اُوپر اِس طرح اوڑھ لیں جس طرح برقعہ اوڑھا جاتا ہے۔ پھر نتائج بالکل صحیح نکلیں گے اور ایک مومن کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چونکہ عبادات کا ہمیں یہ فائدہ ہے کہ اس میں ہمیں کوئی قربانی نہیں کرنا پڑتی۔ لوگ ہمیں نیک سمجھتے ہیں، ہماری عزت کرتے ہیں، ہمیں سلام کرتے ہیں، جس سے ہماری انا کو تسکین ملتی ہے، نفس پھلتا پھولتا ہے ہم زیادہ تر اس لیے عبادات کی طرف جاتے ہیں۔ ہمیں عبادات ضرور کرنی چاہییں۔ فرض نماز اجتماعی طور پر باجماعت جب کہ دیگر عبادات ہم بند کمرے میں کیا کریں، اُس کا ذکر کہیں نہ آنے دیں۔ عبادت چھپا کر کریں۔ اِس عبادت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پاکیزگی اور لطافت کو ہم اپنی عملی زندگی میں شامل کر لیں۔ ہم دوسرے لوگوں کے لیے مہربان ہو جائیں بغیر یہ دیکھے کہ کسی شخص کا مذہب کیا ہے؟ ذات اور برادری کیا ہے؟ ہم صرف یہ دیکھیں کہ جس رب کے ہم بندے ہیں اُسی رب کا یہ بندہ ہے۔ اس پر مہربان ہونا ہم پر فرض ہے۔ ہم دُنیا میں ہر شخص کے لیے مہربان ہو جائیں حتیٰ کہ اسلام کے دشمنوں کے لیے بھی ہم مہربان رہیں سوائے میدانِ جنگ کے۔ جنگ کے میدان میں ہم اُن کے لیے فولاد کی طرح سخت ہو جائیں اور وہ بھی اُس وقت تک جب تک دشمن تلوار اُٹھائے ہوئے ہے۔ اگر ہم یہ رویہ اپنا لیں تو نتائج بالکل وہ ہو جائیں گے جو چودہ سو سال پہلے تھے۔

ستر ہزار جہان اور بیس ہزار عالم ہیں۔ کائنات بے حد وسیع ہے لیکن سائنس کی حد تک اگر آپ بات کریں تو Known (ظاہر) چیزوں میں اس کرۂ ارض پر ہی ایسی آبادی ہے...... لیکن رُوحانی طور پر اگر ہم بات کریں تو میں کھل کر کوئی چیز بیان کرنے کا مجاز نہیں لیکن اِتنا ضرور عرض کر دوں کہ کچھ ایسے جہان ہیں جہاں آبادی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ انسان تحقیق کرے اور چیزوں کو Explore کرے۔ اِس لیے اُمید رکھنی چاہیے کہ کل سائنس بھی اِس درجے میں پہنچ جائے گی کہ دوسرے سیاروں پر موجود زندہ مخلوق تک رسائی کر سکے۔

سوال: ہم نے سنا تھا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن اہلِ علم کے مطابق انسان احسن التقویم ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: صاحب! یہ بات اہلِ علم کی جانب سے نہیں آئی بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ انسان کو اشرف المخلوقات اِس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر انداز اور ہر پہلو سے دوسری مخلوقات سے بہتر ہے۔

سوال: (i) شہداء کی شہادت کے بعد اُن کے قرض کی ادائیگی دُنیا میں کیسے ممکن ہے......؟

(ii) لوگ قبروں پر چراغ یا اگربتی سلگاتے ہیں، اِس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: شہید کا قرض اُسی طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے جس طرح عام طریقے سے مرنے والے شخص کا۔ اگر مرحوم کو زندگی میں قرض ادا کرنے کی مہلت نہیں ملی تو اُس کے لواحقین پہلے اُس کی چھوڑی ہوئی وراثت میں سے اُس کا قرض ادا کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد بقایا وراثت لواحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔ اگر مرحوم نے کوئی ایسی وراثت نہیں چھوڑی کہ جس سے قرض ادا ہو پائے تو عام طور پر اُس کے رشتہ دار اُس کا قرض ادا کر دیتے ہیں۔ شہید کے قرض کی ادائیگی کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

جہاں تک قبروں پر چراغ روشن کرنے اور اگربتیاں سلگانے کا رواج ہے تو اسلام میں کچھ چیزیں رواج یا دوسرے لوگوں کی مسابقت کے طور پر شامل ہو گئیں۔ انڈیا اور پاکستان میں آپ کو ایسی چیزیں بہت زیادہ ملیں گی اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ایک بڑی اکثریت ہندو سے مسلمان ہوئی ہے۔ ہم نے اپنا عقیدہ تو چھوڑ دیا، جب اللہ نے توفیق دی اور رحم فرمایا تو اُس نے ہمیں اپنے صحیح دین کی طرف بلا لیا۔ لیکن ہم عقیدہ بدلنے کے باوجود رسم و رواج کو نہ بدل پائے کیونکہ ہم اُس ہندو معاشرے میں رہے جو Dominating تھا...... یوں ہمارے ہاں بہت سی چیزیں بطور رسوم داخل ہوتی گئیں۔ ہندوؤں کے یہاں دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہاں اگربتی سلگانے کا Concept بھی ہے۔ اگربتی کی خوشبو سے پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے، اِس لیے وہ ایسی جگہوں کی Requirement سمجھی جاتی ہے۔ لیکن قبر پر اگربتی سلگانے کا تعلق محض رسم و رواج سے ہے۔ اگر ہم رسم و رواج کو کھنگالیں تو پتا چلے گا

کہ ارواح کو چونکہ خوشبو زیادہ پسند ہے۔ ارواح اور فرشتے Bad smell سے دور بھاگتے ہیں...... خوشبو والی جگہ پر رُوحیں زیادہ آتی ہیں۔ اگر ہم یہ سوچ کر قبر پر اگربتی سلگا دیں کہ یہاں پاکیزگی کا احساس اور خوشبو رہے تا کہ رُوح کو آمد و رفت میں آسانی ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگربتی سلگانے کے پیچھے یہ ایک بنیادی Concept ہے لیکن میں اسے Justify نہیں کرتا اور اِسے اسلام کا حصہ نہیں بناتا...... یہ ایک ایسی رسم ہی رہے گی جو ہندوستان سے چلی۔

سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات افطار اور طرزِ زندگی

کچھ صاحبان یہ جاننے میں دل چسپی رکھتے ہیں کہ بڑے شاہ صاحب کا افطار کا روٹین کیا تھا۔ میں نے جتنا عرصہ بڑے شاہ صاحب کے ساتھ گزارا، اُس دوران چند باتیں میرے لیے حیران کن تھیں۔ شاہ صاحب جسمانی طور پر بہت دُبلے نظر آتے تھے، ہڈیوں پر گویا کھال منڈھی ہوئی تھی۔ اُن دنوں زیادہ تر روزے گرمیوں کے مہینے جولائی یا اگست ہی میں آئے۔ مجھے پتا چلا کہ بڑے شاہ صاحب انارکلی کے جس تھڑے پر ڈیوٹی پر بیٹھتے تھے (جہاں کچھ عرصہ اُن کے وصال کے بعد میں بھی بیٹھتا رہا) وہاں سے دو بجے اُٹھا کرتے تھے۔ وہاں سے اُٹھ کر پرانی انارکلی سے نکل کر مال روڈ پر چلتے ہوئے سیدھے آر اے بازار تک Cantonment کے اگلے سرے تک پیدل جاتے۔ پھر آر۔ اے بازار سے واپس مڑتے اور جیل روڈ سے ہوتے ہوئے پیدل سنت نگر آجاتے...... افطار سے کوئی آدھ پونا گھنٹا پہلے۔ اب روزہ کے ساتھ جولائی اگست کی گرمی میں انارکلی سے پیدل چل کر آر۔ اے بازار تک جانا اور پھر وہاں سے پیدل سنت نگر تک آنا یقیناً دُشوار کام ہے۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے ہاتھ سے افطار تیار کرتے اور یہ افطار بھی اِس لحاظ سے عجیب و غریب تھا کہ اس میں تین یا چار قاشیں خربوزے کی ہوتیں، ایک پلیٹ کالے چنے جس میں نمک اور مرچ مسالا ڈال کر ہلکی سی گریوی (Gravy) بنالی جاتی......اور ایک خاص شربت جو وہ ماہ رمضان سے پہلے اپنے ہاتھ سے بنالیا کرتے تھے۔ بڑے شاہ صاحب بتاتے نہیں تھے کہ وہ شربت کیا تھا۔ (وہ تو بعد میں حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے زمرے میں ایک چیز میرے علم میں آئی تو اُس شربت کا بھید کھلا) ہم بھی افطار کے وقت اُن کے پاس پہنچ جایا کرتے۔ میں تو افطار ہمیشہ بڑے شاہ صاحب کے ساتھ ہی کرتا رہا۔ جب روزہ کھلتا تو وہ گن کر دو چمچ چنے کھاتے...... آدھی قاش خربوزے کی لیتے، آدھا گلاس شربت پیتے اور اُس کے فوراً بعد ایک کپ چائے...... یہ تھی ٹوٹل افطاری اور ڈنر اُس آدمی کا جس نے اتنا لمبا روزہ رکھا، اِتنا زیادہ پیدل چل کر آیا......!!!

اُس زمانے میں میری عمر 32,33 سال تھی، جسامت بھی اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی دی ہوئی تھی۔ بڑے شاہ صاحب کے برعکس ہم وہاں بیٹھے دھڑا دھڑ کھا رہے ہوتے تھے، پوری پلیٹ ہم ہی خالی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد تنور سے روٹی منگواتے اور وہیں بیٹھ کر کھاتے...... البتہ یہ ضرور تھا کہ بعد میں بڑے شاہ صاحب

رات گئے تک چائے پیتے رہتے تھے۔ ایک دن مجھے زیادہ پیاس لگی ہوئی تھی...... پورا گلاس شربت پینے کے باوجود جب پیاس نہ بجھی تو میں نے بڑے شاہ صاحب سے کہا "حضور! ایک گلاس اور پی لوں؟" کہنے لگے "چاہے تم دس گلاس پی لو لیکن دھیان رہے کہ یہ شربت ٹھنڈا بہت ہے۔ دوسرا گلاس تمھیں شدید قسم کی قبض دے گا۔"

اِس شربت کا پتا نہ چلتا تھا کہ یہ ہے کس چیز کا لیکن ہوتا بہت مزے کا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی افطار کا یہی روٹین تھا۔ وہ بھی اِتنی مقدار میں کھاتے تھے......اور وہی شربت اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور وہ شربت عناب ہوتا تھا۔

چونکہ میرا مسئلہ یہ رہتا ہے کہ مجھے ذکر اذکار کی وجہ سے گرمی زیادہ محسوس ہوتی ہے اِس لیے میں زیادہ گرم چیزیں نہیں کھا سکتا لیکن اُس شربت کے پینے سے میرا ایک بہت اچھا بیلنس قائم تھا۔

یہ تو بڑے شاہ صاحب کا افطار کا معمول تھا۔ اِسی طرح اُن کی نیند بھی ہم نے عجیب وغریب دیکھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ جب میں رات کو Tour سے واپس آتا...... کبھی دو بجے تو کبھی تین بجے۔ اگر واپسی پر اکیلا ہوتا تو سید ھا مرشد صاحب کے پاس جاتا تھا (میری یہ روٹین تھی کہ دفتر جانے سے پہلے بھی بڑے شاہ صاحب سے مل کر جاتا تھا) وہاں جا کر دبے پاؤں آگے ہو کر دیکھتا کہ وہ دیوار کی طرف منہ کیے سو رہے ہیں۔ جیسے ہی خاموشی سے واپس لوٹنے لگتا تو اچانک ہر مرتبہ پیچھے سے آواز آتی تھی "سرفراز! کدھر جا رہے ہو؟" میں کہتا میں تو سمجھا تھا کہ آپ سو رہے ہیں۔ کہتے "نہیں نہیں، تم آؤ بیٹھو!"

جب وہ میرے ساتھ Tour پر جانے لگے تو میں نے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا چھوڑ دیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ لاہور سے نان سٹاپ پشاور اور پھر وہاں سے بنوں جانا پڑا۔ چونکہ میں تو گاڑی چلا رہا ہوتا تھا اِس لیے سونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے شاہ صاحب کو بھی کبھی گاڑی میں اُونگھتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ذکرِ الٰہی کے جواب میں یہ قوتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں...... اِس میں کسی انسان کا اپنا کمال بالکل بھی نہیں ہوتا۔ یہ اُس کلامِ الٰہی کی برکت ہے جس کا انسان کثرت سے ذکر کرتا ہے۔

ہر وہ ذکرِ الٰہی جو کثرت سے کیا جائے گا اُس کے دو دور ہوتے ہیں...... ایک دورِ صغیر اور دوسرا دورِ کبیر۔ جب کوئی دور مکمل ہوتا ہے تو اُس کے جواب میں انسان کو انعام ملتا ہے۔ وہ انعامات اِسی طرح کے ہوتے ہیں کہ انسان کی مخفی صلاحیتیں اور قوتیں بیدار ہو جاتی اور بڑھ جاتی ہیں۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ فقیر کی تمام قوتیں اور حسیات ایک عام انسان کی نسبت چھ گنا تیز ہو جاتی ہیں۔ فقیر کی قوت برداشت بھی چھ گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہ وہ روایت ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے۔ اِسی طرح انسان کے جسم میں خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ ہم بڑے شاہ صاحب کے پاس جاتے تو اُن کے حجرہ میں ایک عجیب خوشبو پھیلی ہوتی تھی۔ جو کھانا وہ بناتے اُس میں بھی ایک عجیب ذائقہ ہوتا۔ بعد میں آہستہ آہستہ یہ بات سمجھ آئی کہ اصل میں انسان کے جسم میں خوشبو ذکرِ الٰہی کے انعام کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور پاکیزگی کی وجہ سے اُس کے ہاتھ میں تاثیر آتی ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کشف وکرامات کے ذکر اور اظہار سے عموماً بڑے شاہ صاحب کو شدید نفرت تھی۔

ایک روز ترکی کے سرکاری دورے سے واپسی پر جب میں اُن کے حجرہ میں بیٹھا تھا تو دورانِ گفتگو ترکی کا ذکر چھڑ گیا اور میں بتانے لگا کہ میں ترکی میں کہاں کہاں گیا۔ چونکہ کسی سرکاری کام سے گیا تھا اس لیے وہ معلومات نہیں دی جاسکتی تھیں۔ وہ اُس وقت حالتِ جذب میں تھے۔ جواب میں وہ مجھے کہنے لگے ''میں زندگی میں دو مرتبہ ترکی گیا ہوں...... میری وہاں ڈیوٹی لگی تھی۔ ایک بار تب جب وہاں زلزلہ آیا تھا اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی تھی اور دوسری بار جب وہاں آگ لگی تھی۔'' پھر وہ بتانے لگے کہ فلاں جگہ اور فلاں علاقہ تھا۔ میں اُن کی باتوں میں اس قدر محو تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بڑے شاہ صاحب کے اِس مختصر حجرہ میں ایک کونا بڑے شاہ صاحب کے لیے مخصوص تھا اور اُس کے پاس دوسرے کونے میں میری جگہ مخصوص تھی۔ میری بیک پر ایک دیوار کے اندر اُنھوں نے ایک الماری بنوائی ہوئی تھی اور میری دائیں سمت میں ایک الماری تھی جس میں بڑے شاہ صاحب کی مختلف چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ وہیں ایک کیل پر مختلف تسبیحیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دس ہزار دانوں والی تسبیح بھی بل دے کر اُنھوں نے وہاں لٹکا رکھی تھی۔ اُن کی باتیں سنتے سنتے بے خیالی میں کہیں میں نے اُن کی ایک تسبیح اُٹھائی اور اُسے ہاتھ میں لے کر کھیلنے لگا۔ مزے سے ترکی کے قصے بیان کرتے کرتے اچانک اُن کی نظر میرے ہاتھ پر پڑ گئی جس میں تسبیح تھی...... بس صاحب! جہاں اتنے پیار اور محبت سے ذکر ہو رہا تھا، وہاں ایک دم بے پناہ قسم کا غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگے ''بات سنو! یہ تم اللہ کا ذکر اس لیے کرتے ہو کہ لوگ تمھیں نیک سمجھیں...... نیک سمجھ کر تمھیں سلام کریں اور تمھاری عزت کریں؟'' میں حیران ہوا کہ ذکر تو ترکی کا چل رہا تھا، یک دم میری شامت کیوں آ گئی؟

میں نے کہا ''حضور! کیا ہوا؟'' کہنے لگے ''تم بھری محفل میں تسبیح لے کر بیٹھے ہوتا کہ لوگ سمجھیں کہ تم اللہ کی بڑی عبادت کرتے ہو۔ بڑے نیک آدمی ہو۔ یوں وہ تمھیں سلام کریں اور تمھاری عزت کریں۔'' میں نے کہا ''حضور! یہ تو آپ کی تسبیح ہے، جو آپ کی باتیں سنتے ہوئے بے خیالی میں میں نے اُٹھالی اور میں اِس سے ایسے ہی کھیل رہا تھا۔ میری اُنگلیاں موٹی ہیں اِس لیے تسبیح کے اتنے باریک دانے میں چلا ہی نہیں سکتا۔ میں تو ٹِک ٹِک استعمال کرتا ہوں۔'' لیکن وہ ضد میں آئے ہوئے تھے کہ تمھاری نیت ہی یہ ہے کہ تم نیک سمجھے جاؤ اور لوگ تمھاری عزت کریں۔ تب بہت مشکل سے معافی مانگ کر جان چھڑائی۔ یہ قصہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ بڑے شاہ صاحب نیکی یا عبادت کے اظہار سے اس قدر اجتناب کرتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو میں اس درجہ احتیاط برتتے کہ کسی بھی طرح اُن کی زبان سے کشف وکرامات کی کوئی بات نہ نکلے...... اُن کی بہت سی کرامات ہیں جن کا مشاہدہ ہم نے خود کیا۔

''اسی طرح ایک بار میں نے دیکھا کہ اُنھوں نے نائٹرک ایسڈ (جو بہت Strong تیزاب مانا جاتا ہے) کی ایک بوتل منگوائی اور ننگے ہاتھوں اُنھوں نے اُس تیزاب سے ایک پتھر کو صاف کیا۔ یہ سماگ پتھر تھا۔ جب پہاڑی علاقوں سے دریا گزرتے ہیں تو اُن پہاڑوں کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے۔ اُن پہاڑی

علاقوں میں دریا کا بہاؤ خاصا تیز ہوتا ہے اور وہ اُن پتھروں کو ساتھ بہالے جاتا ہے۔ جب دریا نشیبی علاقوں کی طرف جاتے ہیں تو یہ پتھر لڑھکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بہت بڑا پتھر بھی لڑھکنے کی وجہ سے گھس گھس کر چھوٹا رہ جاتا ہے۔ اُس پتھر کو کاٹنا، تراشنا اور توڑنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے پتھر کو Shape دیتے ہوئے سات آٹھ چیزلز ٹوٹ جاتے ہیں۔ حالانکہ چیزلز ہائی سپیڈ سٹیل سے بنی ہوتی ہے۔ اُس پتھر کی Hardness کی سپیڈ آٹھ ہوتی ہے جب کہ دُنیا کے Hardest پتھر ہیرے کی Hardness کی سپیڈ دس ہے۔ بڑے شاہ صاحب کو اُس آٹھ سپیڈ والے Hard پتھر کی کھرل چاہیے تھی۔

بڑے شاہ صاحب نے کہا کہ "تم ٹور پر جاتے ہو، وہاں سے کھرل بنوا کے لا دو۔"

ایک صاحب مجھے مل گئے جنھوں نے اصلی کھرل مجھے دے دی۔ بڑے شاہ صاحب اُسے لے کر بڑے خوش ہوئے۔ ایک روز مجھ سے باتیں کرتے کرتے اُنھوں نے نائٹرک ایسڈ ایک سٹین لیس سٹیل کی کٹوری میں ڈالا پھر تھوڑا سا کپڑا اُٹھایا اور ننگے ہاتھوں سے کپڑا اُس میں ڈبو دیا۔ میں کہنے لگا۔ "حضور! یہ ایسڈ ہے۔" لیکن اِس کے باوجود اُنھوں نے اُس میں ہاتھ ڈال دیا اور بڑے مزے سے پتھر صاف کرتے رہے۔ وہ کپڑا جلتا تھا اور اُس میں سے دھواں نکلتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی اُنگلیاں نہیں جلیں۔

یہ قصہ سنانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بڑے شاہ صاحب مافوق البشر تھے بلکہ بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ وہ قوتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر انسان کو عطا فرماتا ہے۔

فقیر کی زندگی کا ایک اور بھی پہلو ہوتا ہے۔ بڑے شاہ صاحب جس کمرے میں رہتے تھے اُس کی لمبائی ایک بڑے صوفے کے برابر اور چوڑائی صوفہ کی چوڑائی سے دوگنا تھی۔ یہی کمرہ اُن کا بیڈ روم، ڈرائنگ روم، سٹور روم اور کچن تھا۔ اُس کمرے میں اُن کی زندگی کا ایک طویل حصہ بسر ہوا۔ مالی لحاظ سے کچھ زیادہ اچھے نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے بلوں کی فوری ادائیگی کے سلسلے میں بہت Particular تھے۔

میرے اُن کے ساتھ تین رشتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے Clear کہا تھا کہ میں نے اپنی جیب سرفراز کو دے دی۔ پھر ایک دن لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے کہنے لگے "یہ میرا بیٹا ہے۔" پھر ایک روز فرمایا "میرے مرشد کا ایک ہی خلیفہ تھا اور میرا بھی ایک ہی خلیفہ ہے، سرفراز......!"

اِتنے گہرے تین رشتے ہونے کے باوجود میں اپنی مرضی سے جو بھی سلوک کرتا رہوں، وہ علیحدہ تھا۔ لیکن اُنھوں نے کبھی میرے سامنے اپنی مالی حالت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اِسی طرح جو بھی دُنیاوی سختیاں اُن پر آتیں، وہ بے حد خاموشی سے اُنھیں سہتے تھے۔

کچھ معمولات میں وہ بہت باقاعدہ اور پابند تھے۔ ستائیس رمضان المبارک کو ختم ضرور دلاتے تھے۔ ساری عمر میں نے دیکھا کہ وہ بریانی اور زردے کی ایک ایک دیگ پکاتے۔ مالی تنگی یا وسائل کی کمی کے باوجود اِس معمول میں کبھی ناغہ نہیں آیا۔ اِسی طرح سات محرم الحرام کو بھی وہ ضرور ختم دلاتے۔ اُس میں صرف ایک بریانی کی دیگ پکواتے تھے۔

اللہ کی راہ پر چلنے کی جو بنیادی شرط ہے، وہ صبر اور شکر ہے...... جس سے ہم تھوڑا سا دُور چلے جاتے ہیں۔
چونکہ آپ سب لوگ اللہ کا قرب چاہتے ہیں اور اُس کے مقربین میں شامل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں اس لیے میں اکثر و بیشتر اس بات پر زور دیتا ہوں کہ صبر اور شکر سے کام لیجیے۔ اِن دونوں الفاظ کا مفہوم ہم عموماً غلط سمجھتے ہیں۔ صبر یہ نہیں کہ میں ہائے ہائے بھی کرتا رہوں۔ لوگوں سے بھی کہتا رہوں کہ میں لٹ گیا، میں مر گیا۔ روٹی نہیں ہے، کپڑا نہیں ہے میرے پاس۔ یہ واویلا مچانے کے باوجود اگر میں دل میں سمجھوں کہ میں تو صبر کر رہا ہوں تو یہ غلط ہے کیونکہ یہ صبر نہیں بلکہ برداشت ہے۔

صبر یہ ہے کہ میں اِنتہائی مشکل میں ہوں لیکن میرے اِنتہائی قریبی لوگوں والدہ، والد، بیوی بچوں میں سے کسی کو اس کا گمان تک نہ گزرے۔ صبر یہ نہیں کہ میں ذرا سی مشکل آ جانے پر کسی لوٹا پھیرنے والے کی تلاش میں چل پڑوں تاکہ اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کوئی وظیفہ جان سکوں۔

اِسی طرح شکر کا ایک غلط Concept نہ جانے کہاں سے ہم میں چلا آیا۔ ہم پیر صاحبان، عامل حضرات یا دُعا کرنے والوں کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں کہ مشکل کے حل کے لیے کوئی وظیفہ دے دیں...... دُعا کر دیں کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں۔ میرے بھائی جائداد میں سے مجھے حصہ نہیں دے رہے، دُعا کر دیں میں جائداد کا مقدمہ جیت جاؤں۔ لیکن اگر کوئی ہم سے حال احوال پوچھے تو ہم کہتے ہیں کہ ''اللہ کا شکر ہے۔'' یاد رکھیے! یہ شکر نہیں ہے۔ آپ زبان سے بے شک مت کہیے کہ اللہ تیرا شکر ہے۔ لیکن اللہ کی طرف سے آنے والی ہر چیز اور ہر فیصلے کو ہنسی خوشی تسلیم کر لیجیے اور یہ کہیے کہ رب نے یہ بڑا اچھا کیا ہے میرے لیے۔ سمجھ لیجیے آپ نے شکر ادا کر دیا ہے...... یہی شکر ہے۔

یہ بھی واضح کر دوں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہمیں جیسی بھی زندگی عطا ہو گئی اُس کو بڑی خوشی سے قبول کر لیں لیکن ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہ بیٹھیں بلکہ بغیر زبان پر شکایت لائے جدوجہد کرتے رہیں اور اِس جدوجہد کے جواب میں رب کی طرف سے جو فیصلہ آ جائے، جو انعام آ جائے، اُسے ہم بڑی خندہ پیشانی سے ہنستے مسکراتے ہوئے دل سے قبول کر لیں یہ کہہ کر کہ ہمارے رب نے جو عطا کیا ہے، وہ بہترین ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہمیں کیا چاہیے...... ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بُرا۔ جب ہم نے یہ رویہ اپنا لیا تو گویا ہم نے رب کا شکر ادا کر دیا۔

شکر کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ عطا فرمایا ہے...... خواہ وہ کم ہے یا زیادہ...... اُس میں سے ہم رب کے بندوں کی خدمت کرتے جائیں اس قدر عاجزی اور خاموشی کے ساتھ کہ کسی کے علم میں ہمارا یہ عمل نہ آنے پائے۔ اِس رویے کو اپنانے کے ساتھ ساتھ ہم رب تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں، اُسے یاد کرتے رہیں تو یقین مانیے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر بھی وہ عنایات کر دے گا جن کا ذکر بڑے شاہ صاحب کے ضمن میں ہوا۔ تو بھائیو! آپ وظائف پر زور نہ دیجیے بلکہ خدا کے ساتھ اپنی بہتر Dealings پر زور دیجیے۔ اللہ کو یاد کرتے رہیے، صبر اور شکر کو اپنا لیجیے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ رب آپ کو اپنے بہت قریب کر لے گا۔

تدبیر کیوں؟

(i) جب پتھر میں بند کیڑے کو بھی رزق ملتا ہے تو پھر جدوجہد کی کیا ضرورت؟

(ii) روزِ حساب رب منصف زیادہ ہوگا یا رحیم؟

UK میں ایک بڑی اکثریت نے مجھ سے پوچھا تھا کہ رزق اگر پروردگار کی طرف سے دیا جاتا ہے اور جب پتھر میں کیڑے کو بھی پروردگار رزق فراہم کرتا ہے تو پھر تگ و دو اور جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ ایک اور سوال جو امریکہ میں ایک سیمینار میں مجھ سے پوچھا گیا کہ رب تعالیٰ منصف زیادہ ہے یا رحیم؟ (عام طور پر ایسے سوال اُن لوگوں کی طرف سے اُٹھائے جاتے ہیں جو اسلام کے بارے میں زیادہ اچھے جذبات نہیں رکھتے۔) میں نے سوچا کہ پیشتر اس کے کہ کوئی اور نوجوان یہ سوال کرے میں خود ہی اس کا جواب دے دوں۔

تقدیر کے دو حصے ہیں: ایک تقدیر مبرم جسے تقدیر معین بھی کہتے ہیں اور دوسری تقدیر معلق ہے۔ تقدیر معین ٹوٹل تقدیر کا پانچ سے دس فی صد حصہ ہے جیسے کسی انسان کو کس خاندان میں پیدا ہونا ہے؟ کس رُوح کو کس خاندان میں پیدا ہونا ہے۔ اِس میں ہماری چوائس نہیں ہے...... یہ رب تعالیٰ کی چوائس ہے۔ عزت، ذلت، زندگی اور موت، اولاد، یہ سب تقدیر مبرم کا حصہ ہے۔ اِس کے علاوہ جو تمام معاملات ہیں اُن کے سلسلے میں پروردگار نے انسان کو Dos and don'ts سے متعارف کرا کر اپنی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعے اُسے تین طرح کی آزادی دے دی: Freedom of thought (سوچ کی آزادی) عطا کر دی۔ ہم جو چاہیں سوچتے رہیں، اچھا یا بُرا، گناہ آلود یا نیک...... کسی بھی سوچ پر کوئی پابندی نہیں۔ رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ زمین پر نہیں اُترتا یہ کہنے کے لیے کہ ایسا مت سوچو۔ پھر Freedom of decision (فیصلہ کی آزادی) انسان کو عطا کر دی گئی۔ وہ جو چاہے فیصلہ کرے...... بُرائی کی طرف جانا ہے یا نیکی کی طرف، کچھ بھی کرے، اُس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اِس کے بعد Freedom of action (عمل کی آزادی) ہے جو ایک حد تک Conditional (مشروط) ہے۔ ہم اِس آزادی سے فائدہ اُٹھا کر اُس حد تک کوئی سا بھی کام کر سکتے ہیں جس حد تک کہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ کائنات میں مداخلت نہ ہو۔ جہاں وہ حد شروع ہوگئی، وہاں وہ اپنے

اختیارات کا استعمال کرے گا کیونکہ یہ اتھارٹی صرف رب کے پاس ہی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کو گھر کے اندر کھیلنے کی پوری اجازت دے دیتی ہے لیکن جب وہ بچہ کھیلتے کھیلتے جلتی ہوئی آگ کے قریب جاتا ہے تو وہ اُسے روک دیتی ہے اور آگ کو پکڑنے نہیں دیتی۔ بچے کو گھر کے اندر کھیل کود کی آزادی ہے لیکن جہاں اُس کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوگا، ماں اپنے اختیار کو استعمال کرتی ہے اور بچے کو روک دیتی ہے۔

اسی طرح انسان کو Freedom of action ہے۔ لیکن جہاں اُس کا عمل نظام کائنات میں مداخلت کا سبب بننے لگتا ہے، اُسے روک دیا جاتا ہے۔ ہمارا علم بہت محدود ہے حتیٰ کہ ہم اپنی ذات کے بارے میں بھی بہت Limited (محدود) علم رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ پوری کائنات کو چلا رہا ہے، کس مقام پر کیا عمل (Action) ہوگا یہ سب رب کو پتا ہے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ ایکشن صرف ہماری ذات تک محدود ہے حالانکہ درحقیقت اُس سے دوسرے لوگ متاثر ہو رہے ہوتے ہیں۔ تو جہاں اللہ کے معاملات میں انسان کی مداخلت ہے، وہاں اللہ تعالیٰ ہمارا ہاتھ روک دے گا۔ یوں فریڈم آف ایکشن Limited ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تین طرح کی آزادیاں عطا کیں اور اِن کے ساتھ پیرامیٹرز بھی بیان کر دیے کہ اِن کے اندر رہ کر ہمیں زندگی گزارنی چاہیے تاکہ دُنیا و آخرت میں ہمارا انجام بہت اچھا ہو۔ جب انسان اِن پیرامیٹرز میں رہ کر زندگی گزارتا ہے تو اُس کو اُس کے انعامات مل جائیں گے لیکن اگر وہ اِن پیرامیٹرز کو برقرار نہیں رکھ پاتا تو حد سے تجاوز کرتا ہے جس کی اُسے سزا ملتی ہے۔ اب فیصلہ ہمارا ہے کہ ہم نے کون سی راہ اپنانی ہے۔

اگر کسی شخص نے چوری کی ہے تو یہ کہنا کہ اُس نے (معاذ اللہ) اللہ کے حکم کے تحت ایسا کیا ہے، اس لیے اُسے سزا کیسی۔ یا پھر کسی نے قتل کیا ہے تو (معاذ اللہ) اللہ کی مرضی اور حکم سے ایسا کیا ہے پھر سزا کیسی۔ ایسا سوچنا اور کہنا درست نہیں ہے۔ رب تعالیٰ نے ہمیں چوری کرنے سے منع کیا ہے اور قتل کرنے سے بھی۔ اگر وہ ایک عمل سے ہمیں منع کرتا ہے تو پھر اُس میں اُس کی مرضی کیسے ہوسکتی ہے......؟ ہم اِس بات کو تھوڑا سا غلط سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ فیصلے ہمارے اپنے ہیں۔ چونکہ ہمیں تین طرح کی آزادیاں دے دی گئی ہیں اس لیے سزا وجزا بھی رکھ دی گئی۔ اگر یہ آزادی ہمیں حاصل نہ ہوتی تو پھر سزا و جزا مقرر کرنا ناانصافی ہوتا۔

دوسرا سوال جو پوچھا جاتا رہا وہ یہ تھا کہ صاحب! جب رازق رب ہے، اُس نے رزق فراہم کرنے کا ذمہ لیا ہے، وہ پتھر میں بند کیڑے کو بھی رزق عطا کرتا ہے تو پھر رزق کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ اور دوڑ دھوپ کیوں ہے؟

چونکہ مجھ سے یہ سوال UK اور امریکہ میں پوچھا گیا تھا اِس لیے میرے لیے اِس کو Explain کرنا آسان تھا۔ انگلینڈ ایک Welfare state ہے صحیح معنوں میں۔ اگر ایک انسان وہاں کام نہیں کرتا خواہ اپنی مرضی سے یا حالات کے جبر کے تحت تو بغیر سوال پوچھے اُسے گورنمنٹ سوشل سیکورٹی انکم سپورٹ کے تحت

45 پونڈ Per week دے دیتی ہے اور اُس کی ضرورت کے مطابق اُسے رہائش فراہم کر دیتی ہے۔ اب اُسے اپنی ضروریات اِن 45 پاؤنڈز Per week سے پوری کرنی ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر موت تک آپ وہاں کام نہ کریں...... سوشل سکیورٹی آپ کو یہ سہولیات فراہم کرتی جائے گی حتیٰ کہ انسان طبعی عمر تک پہنچ کر دُنیا سے رُخصت ہو جاتا ہے لیکن آخری وقت تک وہ روٹی کھا رہا ہوگا۔ یہ ایک محدود سہولیات سے مرتب زندگی ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ پُر آسائش زندگی گزاریں تو پھر آپ کو محنت کرنا ہوگی...... ہم جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے، اُتنی ہی پُر آسائش زندگی ملتی چلی جائے گی۔ رب رزق کی گارنٹی دیتا ہے۔ آپ کا تجربہ و مشاہدہ ہوگا کہ جو لوگ بالکل کوئی کام نہیں کرتے، وہ بھی زندہ رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی وسیلے سے رب تعالیٰ اُنھیں رزق فراہم کر رہا ہوگا۔ انسان کی Minimum ضروریات پوری کرنے کی جو گارنٹی رب نے دی ہے وہ اُسے پورا کرتا ہے۔ میں ذاتی طور پر بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے (میرے دیکھنے کی حد تک تو) کبھی کام نہیں کیا لیکن پھر بھی زندگی گزاری ہے۔ رب رازق ہے...... وہ رزق فراہم کرتا ہے...... اُس کا وعدہ بڑا سچا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ پُر آسائش زندگی گزاریں اور اپنی مرضی سے جہاں چاہیں خرچ کریں تو اس کے لیے ہمیں محنت کرنا ہوگی۔ ہم جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے، اُتنا ہی رزق ہمیں ملتا چلا جائے گا۔

تیسرا سوال جو ایک نوجوان نے پوچھا وہ تھا یہ کہ رب تعالیٰ بروزِ قیامت منصف ہوگا یا رحیم ہوگا......؟ اس کا بڑا Simple سا جواب ہے کہ جس وقت حساب کتاب ہو رہا ہوگا، فیصلے صادر کیے جا رہے ہوں گے، اُس وقت رب تعالیٰ منصف کی کرسی پر بیٹھا ہوگا اور بہت ناپ تول کر کے ہمارے اعمال پر فیصلے سنا دے گا۔ اعمال کے بدلے میں سزا و جزا کا فیصلہ سنانے تک وہ منصف ہے۔ اِس میں کسی کے ساتھ قطعاً کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ لیکن فیصلہ سنا دینے کے بعد رب تعالیٰ کا اختیار ہے کہ جسے چاہے معاف کر دے۔ فیصلہ کر دینے کے بعد جب وہ معاملہ کرے گا تو وہ بحیثیت رحیم و کریم کرے گا۔ یہ دونوں حیثیتیں منصف اور رحیم و کریم ہونا محشر میں بیک وقت کارفرما ہوں گی۔

اگر آپ کسی کو سوال کا جواب دے رہے ہوں تو ایک بات یاد رکھیں کہ پوچھنے والا اگر مسلمان ہے تو قرآن و حدیث کے حوالے کافی ہوں گے۔ لیکن اگر سوال پوچھنے والا غیر مسلم ہو تو چونکہ وہ قران و حدیث پر ایمان نہیں رکھتا اِس لیے اُن میں سے حوالے دینا مناسب نہیں۔ لیکن ہم غلطی یہ کرتے ہیں کہ غیر مسلم کو بھی قرآن پاک میں سے حوالے دے کر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے حوالہ وہ دیجیے جس پر وہ ایمان رکھتا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسا حوالہ دیجیے جو Prove (ثابت) ہو جائے۔ تیسری بات یہ یاد رکھیے کہ رب تعالیٰ کا حکم بھی ہے اور آپ ﷺ کا فرمان بھی کہ جب آپ گفتگو کریں تو مخاطب کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھیں۔

ایسی گفتگو زیادہ Affective ہوگی۔ کوشش کریں کہ آپ کے جواب سے کسی کے دل میں Reaction پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر رب نے یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کے جھوٹے خداؤں کو بُرا نہ کہو تا کہ وہ تمھارے سچے خدا کو بُرا نہ کہیں۔

پشتو زبان کا بھی ایک بڑا خوبصورت محاورہ ہے جس کا اُردو ترجمہ یوں ہے کہ کسی کی بُری ماں کو بُرا نہ کہو تا کہ وہ تمھاری اچھی ماں کو بُرا نہ کہے۔

ہم Conflict-based جواب نہ دیں کیونکہ یہ فقیر کے مسلک کے خلاف ہے۔ یہ مصلحت کے خلاف بھی ہے اور سنت کے خلاف بھی۔ آپ ﷺ نے کسی کے بھی اعتراض کا جواب دیتے وقت کبھی اُس کے ایمان، اعتقاد اور ذاتی زندگی کو نشانہ نہیں بنایا، اس کی خامی نہیں بتائی۔ اِس لیے سوال کا جواب Logical دیں۔ اور کوشش کریں کہ روزمرہ زندگی سے مثال دے کر بات سمجھائیں۔ اِس سے سوال کرنے والا آپ کی بات کو تسلیم کرلے گا اور آپ کے قریب آجائے گا۔

یہ جو برصغیر پاک و ہند میں بزرگانِ دین نے بغیر کسی مدد اور وسائل کے لاکھوں کی تعداد میں لوگ مسلمان کیے، اُس کے پیچھے بات صرف اِتنی سی تھی کہ اُنھوں نے سنت پر عمل کیا کہ ہر ایک کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کیا، اپنے ذاتی کردار سے بہترین مثال قائم کی۔ لہٰذا جب تک ہم ذاتی مثال سیٹ نہیں کریں گے، اسلام نہیں پھیلے گا۔ سنت بھی یہی ہے۔ آپ ﷺ نے بعثت سے قبل اپنے چالیس سالہ دور میں اپنے آپ کو امین اور صادق ثابت کیا۔ آپ ﷺ پہلے امین اور صادق کہلائے پھر پیغمبری کا اعلان کیا۔ اِسی طرح آپ ﷺ نے زندگی بھر کسی کو کوئی نصیحت نہیں کی تاوقتیکہ خود اُس پر عمل نہ کیا ہو۔

جب تک سنت کی پیروی نہیں ہوگی، اسلام نہیں پھیلے گا اور کوئی غیر مسلم ہم سے متاثر نہیں ہوگا۔ جس زمانے میں اسلامی سلطنت کی سرحدیں بڑی تیزی سے وسیع ہو رہی تھیں، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے دور میں جو ترقی ہوئی اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اُس میں ہمارے اسلاف کی بہادری اور سمجھداری بہت نمایاں ہے۔ کیونکہ اُن کی جنگی حکمت عملی اِتنی کامیاب رہی کہ فتوحات ہوتی چلی گئیں۔ حکمت عملی کے ساتھ بہادری کے عنصر نے مہمیز کا کام کیا۔

اگر آپ کوئی علاقہ فتح کر بھی لیں تو اُسے اپنے قبضے میں دیر تک رکھنا ممکن نہیں ہوتا خواہ آپ کے پاس کتنے ہی Holding troops کیوں نہ ہوں...... کیونکہ وہاں کی Local population کی مزاحمت اور جدوجہد جاری رہتی ہے۔ فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں کئی ایک انڈر گراؤنڈ تنظیمیں At their own کام کرنے لگ گئی تھیں۔ جنھیں بعد میں انگلینڈ نے سپورٹ کیا اور جرمنی کے خلاف بڑی شدت سے اُنھوں نے جدوجہد کی اور بالآخر اپنا ملک آزاد کرا لیا۔ لیکن مسلمانوں کے قبضے کے خلاف کہیں ایسی جدوجہد نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی جتنی بھی قابل فوجیں تھیں، اُن کا کردار اور اخلاق

اِتنا بلند تھا کہ اُس سے متاثر ہو کر وہاں کے Local از خود دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے۔ جس کا آج یورپ میں حوالہ دیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ درحقیقت وہ دل کی بات کہنا چاہتا ہے کہ تلوار سے اسلام پھیلنا ممکن نہیں کیونکہ جس رفتار سے عیسائی مسلمان ہوئے، تلوار کے زور پر ایسا ممکن نہیں۔ ہم تو کہیں بھی، کسی بھی موقع پر پچاس ہزار سے زائد فوج لے کر مدینے سے چلے ہی نہیں اور پھر کئی سال وہ مہم جاری رہی...... اُس میں شہادتیں بھی ہوتی رہیں اور طبعی موت بھی مسلمان مرتے رہے۔ ہر مہم کے بعد اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ لشکر جس تعداد میں مدینہ منورہ سے چلا تھا...... وہ تعداد کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ جب مصر فتح ہوا تو کل دس ہزار کی فوج رہ گئی تھی بلکہ ایک مہم میں مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ اِس صورت میں ہمارے پاس Holding troops ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جو علاقے فتح کرتے ہیں اُنھیں Hold کرنے کے لیے troops پیچھے چھوڑتے چلے جائیں اور آگے بڑھتے جائیں۔ یہ تو دراصل مسلمانوں کے اخلاق کی طاقت تھی جس نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ مقبوضہ علاقے ہمارے زیر تسلط رہ گئے اور وہاں بدامنی نہیں ہونے پائی ایسا Personal example (ذاتی مثال) ہی سے ممکن ہوا تھا۔ آپ بھی جب کسی (غیر مسلم) شخص کو اسلام کے سلسلے میں کوئی جواب دیں تو یہ یاد رکھیے کہ اُس کے اندر قوت پیدا ہو ہی نہیں سکتی، آپ کی بات اُس کے دل میں گھر کر ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ اُس کے اندر آپ کے Personal character (ذاتی کردار) سے Personal example (ذاتی مثال) شامل نہ ہو جائے۔ جب دیکھنے والا بغیر آپ کے کہے یہ جان جائے گا کہ آپ نے جو بات کہی ہے اُسے اپنی ذات پر Implement کیا ہوا ہے۔ تو پھر آپ کی بات ہر انداز میں اُس کے دل میں گھر کر جائے گی۔

سوال: اماں حوا چوبیس گھنٹوں کے بعد دو جوان بچے پیدا کرتی تھیں۔ جو جوڑی پہلے پیدا ہوتی اُس کا رشتہ چوبیس گھنٹے بعد پیدا ہونے والی جوڑی کے ساتھ طے کر دیا جاتا۔ افزائش نسل انسانی کے اِس طریقے میں رشتوں کا تقدس خاص طور پر بہن بھائی کے رشتے کا تقدس موجودہ دَور کی مانند دکھائی نہیں دیتا۔

جواب: یہ فرمان ہے کہ آپ اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کیجیے۔ رب تعالیٰ بھی دُنیا میں جو پیغام بھیجتا رہا، وہ اُس وقت کے لوگوں کی ذہنی اِستطاعت اور حالات کے مطابق ہوتا تھا۔ اِس لیے میں ایک بات کہا کرتا ہوں کہ آپ ﷺ کے دور میں اسلام نازل نہیں ہوا بلکہ مکمل ہوا ہے۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ نازل نہیں ہوا بلکہ قرآن پاک سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں اور اُس سے پہلے جو پیغام آئے وہ سب اسلام کا ہی حصہ تھے۔ لیکن آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کے آنے کے ساتھ جو پیغام آیا، وہ آخری پیغام تھا اور اُس پر دین اسلام مکمل ہو گیا۔ آپ ﷺ اِسی لیے آخری نبی ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی اسلام مکمل ہو گیا...... مزید کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔

حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر اُتارے جانے کے فوراً بعد صورت حال یہ تھی کہ وہ اس روئے زمین پر اکلوتے بشر تھے۔ اس کے بعد اماں حوا تشریف لائیں پھر اُن کے بیٹے اور بیٹیاں۔ بہن بھائی کے رشتے کا جو تقدس آج ہے یا دو تین ہزار سال پہلے تھا، اگر وہ اُس ابتدائی دور میں ہوتا تو نسلِ انسانی بڑھ نہیں سکتی تھی۔ کبھی کل کو کوئی غیر مسلم یا Non-believer یہ سوال بھی اُٹھا سکتا ہے کہ اماں حوا تو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں یوں حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کا رشتہ تو باپ بیٹی کا ہو گیا۔ پھر وہ میاں بیوی کیسے ہو گئے......؟

Logically دیکھا جائے تو جس نے اولاد کو جنم دیا، وہ ماں ہے اور جس نے جنم لیا، وہ اولاد ہے۔ رشتوں کا یوں قائم ہونا حالات اور ضرورت کے تحت اس لیے ضروری تھا تا کہ انسانی نسل کی افزائش ہو سکے۔ چونکہ اُس وقت انسانی ذہنی استطاعت اتنی نیچے تھی کہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی لیکن پھر جوں جوں Development ہوتی گئی توں توں Mental development بھی Expand کرتی چلی گئی...... حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کا پہلا پیغام نازل ہو گیا...... کہا جاتا ہے کہ اسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا...... اور آپ ﷺ پر مکمل ہو گیا۔

سوال: انسان کی زندگی اور موت کا وقت اُس کے پیدا ہونے سے پہلے لکھ دیا جاتا ہے تو پھر خودکشی حرام کیسے ہے۔

جواب: اگر انسان اپنی کوشش سے وقت سے پہلے مر جاتا تو پھر آپ کو اکثر و بیشتر ایسے واقعات سے واسطہ نہ پڑتا کہ کسی شخص نے خودکشی کی بہت کامیاب کوشش کی جس میں بظاہر ناکامی کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اُس کی جان بچ گئی۔

خودکشی اس لیے حرام ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے نظام میں Interfere (مداخلت) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں ہم اُس کے بنائے ہوئے نظام میں Interfere کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں وہ اپنی ویٹو پاور کو استعمال کرتا ہے۔

اللہ نے موت کے معاملے میں تین چیزیں مقرر کر دیں...... موت کا وقت، موت کی جگہ اور موت کا طریقہ۔ اگر ہم اِن مقرر کردہ چیزوں میں اپنی مرضی سے تبدیلی کرنے کی کوشش کریں گے تو ہمارا یہ عمل قابل گرفت ہو گا اور اللہ تعالیٰ ہماری ایسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دے گا لیکن Interference کی وجہ سے ہم ضرور مجرم بن جائیں گے...... اس لیے اللہ تعالیٰ نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔

سوال: جب موت کا طریقہ ہی خودکشی طے ہے تو پھر انسان کو سزا کیوں؟

جواب: دیکھیے اللہ تعالیٰ نے موت کا ایک طریقہ، ایک وقت اور ایک مقام مقرر کیا، پھر ہم اپنے ہاتھ سے اُس کو تبدیل کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ زہر کھا کر مرنے کی کوشش کیوں کریں؟ ہم اپنی طبعی عمر پوری ہونے کا

انتظار کیوں نہ کریں؟ جب ہم خود دخل اندازی کرتے ہیں یا اپنی مرضی سے موت کو گلے لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو مجرم کہلاتے ہیں۔

اب آپ کو یا مجھے یا کسی اور کو معلوم نہیں کہ ہمارا موت کا طریقہ کیا ہے؟ موت کا وقت کیا ہے؟ ہم نے اللہ کے حکم سے سرکشی کر کے اپنے آپ کو مارنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر تو وہ موت کا مقررہ وقت نہیں تھا تو بچ گئے لیکن اگر وہ مقررہ وقت تھا تو خودکشی سے موت واقع ہو گئی۔ لیکن اس خودکشی والی موت میں ہماری مرضی داخل ہو گئی۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ فرض کیجیے ایک شخص کو سزا سنا دی جاتی ہے کہ اُسے یکم نومبر صبح 4 بجے پھانسی دی جائے گی۔ جب 4 بجنے میں دو منٹ باقی تھے تو اُس نے خودکشی کر لی۔ اب اگر وہ بچ جاتا ہے تب بھی اور نہیں بچتا تب بھی خودکشی کا مرتکب کہلائے گا کیونکہ اُس نے موت کے مقرر کردہ طریقے یعنی پھانسی سے ہٹ کر خود اپنی موت کا طریقہ تجویز کیا۔ سزا تو اُس نے اپنے آپ کو وہی دی جو اُس کے لیے لاگو تھی لیکن مرضی اپنی کی۔ اِس لیے خودکشی کا مرتکب کہلایا۔ اخبار میں آئے گا کہ ایک پھانسی کے مجرم نے خودکشی کر کے اپنی موت سے آدھا منٹ پہلے اپنی زندگی ختم کر لی۔ یوں سارا الزام اُس پر آ گیا۔ جب ہم خودکشی کرتے ہیں تو پھر الزام ہم اپنے اُوپر لے رہے ہوتے ہیں۔ یہ بہت باریک سا نکتہ ہے جسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بے شک موت کا طریقہ مقرر ہے لیکن چونکہ آپ نے اپنی مرضی کی اِس لیے سارا الزام آپ پر آ گیا اور آپ مجرم ہو گئے۔

سوال: اگر ایک ڈاکو کو پولیس مقابلے میں گولی لگتی ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے، Chain of events اُسے موت کی طرف لے گئی۔ اب اس میں تقدیر کا کتنا عمل دخل ہے اور تدبیر کا کتنا؟

جواب: اگر ایک شخص نے قتل کیا، وہ پکڑا گیا اور اُسے پھانسی کی سزا ہوئی، اُسے پھانسی دے دی گئی اور وہ مر گیا۔ اب یہ بھی ایک Chain of events ہے۔ اِس میں تقدیر اور تدبیر تو آتی ہی نہیں کیونکہ اُس نے غلط کام کیا جس کی اُسے سزا ملے گی۔ یہ تدبیر کا fault ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا تھا کہ تم حلال راستے سے رزق حاصل کرو، لوگوں کے مال کو اپنے قبضے میں نہ کرو اور نہ ہی ناجائز طریقے سے استعمال کرو۔ لیکن وہ شخص نہ صرف ان احکامات کی خلاف ورزی کرتا رہا بلکہ ڈاکا زنی اور دیگر بُرائیوں میں مبتلا رہا مثلاً ہو سکتا ہے کہ ڈاکا زنی کے دوران اُس سے کوئی قتل ہو گیا ہو، لوگ زخمی ہو گئے ہوں۔ چونکہ وہ کسی طور پر قابو میں نہیں آ رہا تھا تو پھر اللہ کا نظام حرکت میں آیا اور پولیس مقابلے میں اُس کو سزا دے دی گئی اور خلقِ خدا کو اُس کے شر سے نجات مل گئی۔ معاملہ وہی ہے جو میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین طرح کی آزادیاں عطا فرمائی ہیں۔ ہم آزاد ہیں، کوئی سا بھی روپ دھار کر کوئی سا بھی کیریئر اختیار کر لیں، اخلاق کے کسی بھی مقام پر چلے جائیں حتیٰ کہ شیطان کے پیروکار ہو جائیں، ہمیں کہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے...... یا پھر ہم فرشتوں سے بھی بلند اپنے اصل مقام تک پہنچ جائیں، اُس پر بھی کوئی روک ٹوک نہیں ہے بلکہ ہمیں سراہا جائے گا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ صاحب اُس ڈاکو کی تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا جائے درست نہیں ہے۔ رب تعالیٰ کو اپنی مخلوق عزیز ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے شر سے اپنی مخلوق کو بچاتا ہے۔ دوسرا وہ اپنے قائم کردہ قانون کی حد کو قائم رکھتا ہے کہ یہ قانونِ فطرت ہے۔ جو اس حد میں مداخلت کی کوشش کرتا ہے اسے وہ لوگوں کی عبرت کے لیے لوگوں کے سامنے سزا دیتا ہے۔

سوال: کیا تقدیر میں اُلجھنا ہمارے ایمان کی کمزوری ہے؟

جواب: یقیناً کمزوری ہے۔ آپ ﷺ نے بڑی شدت اور سختی سے تقدیر کو Discuss کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن اگر کوئی شخص اِس حوالے سے سوال کرتا ہے اور آپ اُس کے ذہن کو مطمئن نہیں کرتے تو وہ شکوک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اِس خطرے سے بچنے کے لیے کہ لوگ اُس شخص کے دل میں دین اسلام کے شکوک ڈال کر اُسے مذہب سے دُور لے جائیں، ضروری ہے کہ ہر ممکنہ حد تک ایسے شخص کے سوالوں کا جواب دے دیا جائے۔

سوال: انسانی اِرتقا کے بارے میں سائنس کا کہنا ہے کہ پہلے وہ Homorectus تھا پھر Homosapien بنا جب کہ اسلام کے مطابق انسان ابتدا سے اِسی شکل میں تھا۔ سائنس اور اسلام کے نظریات کو ہم کیسے co-relate کر سکتے ہیں؟

جواب: رب نے فرمایا جس کا مفہوم ہے کہ ہم نے چاند، سورج اور ستارے پیدا کیے جو اپنے مقررہ راستوں پر گردش کرتے رہتے ہیں...... سائنس اس نتیجے پر آج پہنچی ہے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے سائنس نے کتنی تھیوریز Establish کیں اور بعد میں اُنھیں Negate کر دیا۔

جوں جوں انسانی ذہن کا ارتقا ہو رہا ہے اور انسان کا علم بڑھ رہا ہے، وہ اسرار کائنات کا کھوج لگاتا جا رہا ہے۔ اِسی طرح انسانی جسم کے اِرتقا (Human biological evolution) کے بارے میں Theory اب تبدیل ہونا شروع ہو گئی ہے۔ ڈارون کی تھیوری ایک زمانے میں بہت Popular ہوئی لیکن اب وہ Automatically negate ہونا شروع ہو گئی ہے۔

ہم تو اُس عالم الغیب اور خالق کی بات کو درست مانتے ہیں جس نے یہ تمام گورکھ دھندا تخلیق کیا۔ سائنس کے نامکمل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ زمین کی شکل کے بارے میں بے شمار Theories آئیں اور بالآخر اُنھوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ تو نارنگی کی شکل کی ہے۔ اِسی طرح زمین کی گردش کے بارے میں کبھی کہا گیا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، پھر کہا جانے لگا کہ سورج تو اپنی جگہ ساکن ہے، زمین اُس کے گرد گھومتی ہے۔ پھر کہا گیا کہ زمین سورج کے گرد بھی گھومتی ہے اور اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے۔ Latest theory یہ ہے کہ تمام Planets (سیارے) اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے Orbit میں گردش میں ہیں اور اُن کی ایک خاص ترتیب ہے۔

اِن تمام Theories اور حقائق سے اندازہ لگا لیجیے کہ سائنسی علم جسے ہم بہت Automatic جانتے ہیں، وہ درحقیقت کس قدر نامکمل اور ابتدائی شکل میں ہے۔ وہ وقت آئے گا جب سائنس جان لے گی کہ انسان اِسی شکل میں پیدا ہوتا تھا...... البتہ قد کاٹھ آج کے انسان کے قد کاٹھ کی نسبت مختلف تھا۔ تب قد اور عمریں طویل ہوتی تھیں۔ لیکن وہ Environmental تھا۔ Environmental change کی وجہ سے ہماری عمر بھی کم ہوئی اور ہمارے قد کاٹھ بھی چھوٹے ہونا شروع ہو گئے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان اِبتدا ہی سے انسانی شکل میں تھا۔

عقیدہ اور یقین

سوال: میں نے کہیں لکھا ہوا دیکھا کہ کچھ لوگ تجارت کے لیے سفر کرنا چاہتے تھے۔ وہ شیخ ابوالحسن کی بارگاہ میں دُعا کرانے کے لیے گئے تو اُنھوں نے کہا کہ اللہ کا نام لے کر سفر کرو...... اگر راہ میں کوئی مشکل آئے تو میرا نام لے لینا۔ ایسا ہوا کہ جن لوگوں نے دورانِ سفر اُن کا نام لیا، وہ بخیریت رہے اور جنھوں نے اللہ کا نام لیا، اُن کو نقصان پہنچا۔ اِس بات کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: اصل میں یہ بات عقیدے سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ عقیدہ اور یقین میں ایک رُوحانی سسٹم کام کرتا ہے جسے میں explain کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہت حیا والا ہے، بہت وفادار ہے، وہ اپنے دوستوں کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص اُس کے دوست کے پاس جاتا یا اُس کے دوست کا حوالہ دیتا ہے تو رب تعالیٰ اپنے سب سے زیادہ حیادار اور وفادار ہونے کی وجہ سے اپنے دوست کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ یوں اُس کے کسی دوست کا نام پکارنے پر وہ اُس آدمی کی مدد کرتا ہے۔ اِس طرح اُس کے دوست کا بھرم قائم رہ جاتا ہے۔ چونکہ رب کے ایک دوست نے یہ کہا کہ مشکل میں میرا نام پکار لینا...... تو رب تعالیٰ نے اپنے دوست کی کہی ہوئی بات کا بھرم رکھا اور جن لوگوں نے اُس کے دوست کا نام لیا، پروردگار نے اُنھیں مشکل سے نکال دیا۔

جب اللہ نے انسان کی تخلیق کی تو اُس وقت صرف فرشتے اور جنات وغیرہ تھے۔ رب نے چاہا کہ ایسی مخلوق تخلیق کرے جس سے اُس کی ذات پہچانی جائے، جس میں اُس کا عکس نظر آئے۔ تب رب تعالیٰ نے اپنے نور سے دو حصے لیے...... یہ نور العالمین اور نور المتقین تھے۔ نور المتقین سے اُس نے پیغمبروں کی ارواح تخلیق کیں جب کہ نور العالمین سے عام انسانوں کی رُوحیں تخلیق کیں۔ یوں رب تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی سوائے رحمٰن کے، کہیں نہ کہیں انسان میں جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اِنھی صفات کے عکس کے طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو واقعتاً اندر سے بڑے لوگ ہیں، اُن کے سامنے اگر ان کی بڑائی بیان کر کے یا اُن کا حوالہ دے کر کام کرائیں تو وہ ٹال دیتے ہیں لیکن اگر اُن کے کسی دوست کا حوالہ دے دیں جو موجود نہیں ہے حتیٰ کہ اُن کے کسی دشمن کا حوالہ بھی دے دیں تو وہ فوراً کام کر دیں گے۔

اگر اُس کی صفات کا ہلکا سا عکس رکھنے والا انسان ایسی بلندی کا ثبوت دیتا ہے تو رب تو پھر رب ہے......!
یہ اُس کا بڑا پن ہے اور اُس کے رب ہونے کا ایک پکا ثبوت ہے۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ اگر آپ اُسے اُس کے کسی دوست کا حوالہ دیجیے تو وہ اُس کا بھرم قائم رکھے گا جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں ہوا۔ جہاں تک اُس کے اپنے نام کی بات ہے تو اِس واقعہ میں اُس نے اپنے حوالے کو Ignore کر دیا...... لیکن دوست کے حوالے کی عزت رکھ لی۔ یہ ایک رُوحانی باریکی ہے جو ذرا دیر میں سمجھ آتی ہے۔ اِس لیے میں نے کہا تھا کہ یہ عقیدہ اور یقین کا مسئلہ ہے۔

ایک دن قبلہ بڑے شاہ صاحب جوش و خروش سے بول رہے تھے۔ گفتگو کی روانی میں کہنے لگے ''میاں! منتوں اور دُعاؤں کا کیا ہے، وہ تو میلے کپڑوں کو کے ڈھیر سے پوری ہو جاتی ہیں۔'' تو رب تعالیٰ اپنے بندوں کا بھرم قائم رکھتا ہے۔

سوال: ملائکہ، انسانوں اور حیوانات میں کون سی قدر مختلف ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: حیوان اور انسان میں یہ فرق ہے کی حیوان کہ تمام حرکات جبلی ہیں جب کہ انسان عقل اور سوجھ بوجھ سے کام لیتا ہے۔ بطخ کا بچہ جونہی انڈے سے نکلتا ہے، آپ اُسے پانی میں پھینک دیں...... وہ پانی میں تیرنا شروع کر دے گا...... اُس نے کسی سے تیرنا نہیں سیکھا ہے۔ مگرمچھ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کا رُخ کرے گا اگرچہ اُسے نہیں معلوم کہ پانی کس رُخ پر ہے لیکن اُس کی Direction پانی کی طرف ہوگی۔ کوئی پرندہ جونہی ذرا سا بڑا ہوگا، اُس کے بال و پر پوری طرح نکل آئیں گے...... وہ اُڑان بھرلے گا۔ لیکن انسان کی تمام حرکات وسکنات اور تمام کاموں میں عقل اور سمجھ کو دخل ہوتا ہے۔ حیوانات اور انسانوں میں یہی فرق ہے۔

فرشتوں اور انسانوں میں فرق یوں نظر آتا ہے کہ فرشتہ احکامات کا پابند ہے...... وہ نہ تو اپنی سوچ کو استعمال کرتا ہے اور نہ وہ اپنے دماغ کو Apply کر سکتا ہے۔ نہ وہ اپنی مرضی کو کہیں اختیار کر سکتا ہے...... نہ اپنا کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ معاملات کے بارے میں یہ شرف رب تعالیٰ نے صرف انسان کو بخشا ہے۔ رب تعالیٰ نے انسان کو یہ آزادی بخش دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سوچ سکتا ہے، فیصلہ کر سکتا ہے اور عمل کر سکتا ہے۔ یوں انسان سزا و جزا کا بھی مستحق ٹھہرتا ہے جب کہ فرشتے کی کوئی سزا اور جزا نہیں ہے کیونکہ کسی بھی عمل میں اُس کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

انسان اشرف المخلوقات اس لیے ہے کیونکہ اُس میں رب تعالیٰ کی صفات کا عکس ہے سوائے صفت رحمٰن کے...... یہ صفت صرف اور صرف رب تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن دیگر صفات کا عکس انسان میں رکھ کر رب تعالیٰ نے اُسے اشرف المخلوقات کیا۔

سوال: آپ نے کسی نشست میں ذکر کیا تھا کہ ستر ہزار جہان اور بیس ہزار عالم ہیں...... کیا زمین بھی کوئی جہان یا عالم ہے؟ کیا اُن جہانوں اور عالمین کا کوئی دار الخلافہ بھی ہے؟

جواب: آپ بالکل صحیح سمجھے ہیں کہ یہ زمین ایک جہان ہے...... اِس کے اپنے چاند ستارے ہیں۔ اسی طرح دوسرے عالم پائے جاتے ہیں۔ کئی ایک Planets مل کر ایک عالم بناتے ہیں۔ جہاں تک قرآن پاک میں اُن عالمین اور جہانوں کا ذکر یا اشارہ موجود ہونے کی بات ہے تو قرآن پاک دو طرح کی آیات پر مبنی ہے:

(1) بینات

(2) متشابہات

آیات بینات میں احکامات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے جب کہ آیات متشابہات میں رب تعالیٰ نے اپنی کائنات کی مختلف چیزیں سمجھانے کے لیے اشارہ کر دیا...... کوئی واقعہ سمجھانے یا عبرت دلانے کے لیے اشارۃً کوئی بات کہہ دی۔

ہمارے ہاں چونکہ آج کل Management سیکھنے پر خاصا زور دیا جا رہا ہے تو اِسی میں سے ایک مثال دے کر بات کو واضح کرتا ہوں۔ Management کا ایک اُصول ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ Information (معلومات) اپنے ماتحتوں کو مت دیجیے ورنہ وہ Confuse ہو جائیں گے۔ جتنی ضرورت ہے صرف اُسی قدر Information دیجیے۔ آج ہم اِس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ اتنی معلومات دوسروں کو نہ دی جائیں کہ وہ Confuse ہو جائیں اور اس Information کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی پاگل ہو جائیں۔ رب تعالیٰ تو پھر رب ہے...... وہ انسان کی نفسیات کو سب سے زیادہ سمجھتا ہے۔ اُس نے قرآن پاک میں اشارہ دے دیا کہ میں رب العالمین ہوں...... تمام جہانوں کا پالنے والا۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے جہان موجود ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کو رحمت اللعالم نہیں بلکہ رحمۃ اللعالمین کہا۔ اب یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ صاحب وہ جو جہانوں یا عالمین کا لفظ استعمال ہوا اُس سے مراد یہ ہے کہ یہ عالم بھی اور آخری عالم بھی۔ اسی طرح ایک جگہ پر "دونوں جہان" کے الفاظ استعمال ہوئے یوں اشارۃً بیان کر دیا گیا کہ دوسرے جہان اور عالم ہیں۔ اِسی طرح قرآن پاک میں "رب المشرقین" اور "رب المغربین" کے الفاظ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر صرف ایک عالم ہوتا تو مغرب اور مشرق کے الفاظ ہوتے نہ کہ مشرقین اور مغربین۔ یہ سب اشارے ثابت کرتے ہیں کہ دیگر جہان اور عالم موجود ہیں۔ اب سائنس نے بھی Discover کر لیا ہے کہ زمین کا اپنا ایک جہان ہے۔ اسی طرح سورج کا بھی اپنا ایک جہان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل سائنس یہ پتا چلانے میں بھی کامیاب ہو جائے کہ کہیں اور بھی زندگی ہے لیکن وہاں کی Local requirements کے مطابق مخلوق کی جسمانی ساخت Vary کرتی ہے۔ وہاں کی Local environment اور local conditions کے مطابق انسانی ساخت ہے۔

اب رہ گئی بات زمین پر انسان کے آنے کی...... تو صاحب! انسان جب جنت سے نکالا گیا تو اُسے زمین پر بھیج دیا گیا...... درحقیقت وہ بنایا ہی زمین کے لیے گیا تھا۔ اِس لیے سورۃ البقرۃ میں جہاں ذکر ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو وہاں انسان کو زمین پر خلیفہ بنانے کا بھی ذکر ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے سے پہلے کا ہے۔ انسان ڈیزائن ہی اِس زمین کے لیے کیا گیا تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اِسے اپنے ایک عکس کے طور پر پیدا کیا، اِس میں اپنی صفات کا عکس رکھا...... یوں زمین کو یہ شرف حاصل ہو گیا کہ یہاں وہ مخلوق بسی جسے پروردگار نے خاص طور پر ڈیزائن کیا تھا۔

ریاکاری سے بچاؤ ضروری کیوں؟

حج اسلام کا بنیادی رُکن اور Major عبادت ہے۔ اگر میں حج کرنے کے بعد اپنے نام کے ساتھ حاجی لگاتا ہوں تو نماز پڑھنے کے بعد نمازی اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد زکوٰتی کیوں نہیں لگاتا۔ میں حیران ہوں کہ اتنی نمائش کس بات کی ہے......؟ اِسی طرح اگر ہم کہیں بیٹھے ہیں تو اذان ہوتے ہی بے تحاشا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ میں نے نماز پڑھنی ہے۔ وضو کا کوئی انتظام ہے......؟ جانماز ہے آپ کے گھر میں......؟ صاحب! مسلمان کا گھر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلم گھرانے میں جانماز اور قرآن پاک نہ ملے......!

سوال یہ ہے کہ آپ کسی کے گھر اگر مہمان گئے ہیں تو ظاہر ہے جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا نماز پڑھیں گے۔ اگر آپ نے ظہر کی نماز ادا کرنی ہے تو اُس میں خاصا لمبا وقت ہوتا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم جس گھر گئے ہیں، وہاں سے خاموشی سے اُٹھ کر باہر کسی قریبی مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیں۔

بجائے اپنی نماز کی نمائش کر کے لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے کہ ہم بڑے نمازی اور پرہیز گار ہیں، کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم جن سے ملنے کے لیے گئے ہیں، وہاں خاموشی سے بیٹھ کر گفتگو کرتے رہیں اور جب دیکھیں کہ نماز کا ٹائم کم ہو رہا ہے تو اجازت لے کر وہاں سے رُخصت ہو جائیں۔ میرے خیال میں اگر عبادات کو ذرا سا چھپا لیا جائے تو اُن کی فضیلت بڑھ جائے گی۔

اِسی طرح ہم محفل میں بیٹھے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے تو انسان کا دھیان گفتگو کی طرف ہو گا۔ اگر گفتگو کی طرف نہ بھی ہو تو کسی کی موجودگی میں ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی...... پھر بھری محفل میں بیٹھ کر ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر رب کو کس طرح یاد کیا جا سکتا ہے......؟ اِسی طرح سڑک پر چل رہے ہیں اور ہاتھ میں تسبیح لٹک رہی ہوتی ہے۔ یہ ایک ڈھنڈورا پیٹنے والی بات ہے۔ میری گزارش ہے کہ ایسے تمام افعال کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ اِس کے فوائد اور انعامات بہت زیادہ ہیں۔

اگر ڈھنڈورا پیٹیں گے تو لوگ آپ کو نیک سمجھ کر آپ کی عزت کرنے لگیں گے، آپ سے دُعا کا کہنے لگیں گے۔ تو جہاں یہ سلسلہ شروع ہوا، سمجھ لیجیے کہ انسان تکبر کی طرف چل پڑا اور تکبر میں سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

ذرا سی احتیاط کر لیجیے...... کسی بھی طور آپ کی Body language یا زبان سے یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ آپ عبادت کرتے ہیں۔ چھپائیے، جتنا بھی ممکن ہو سکے، اس سے آپ کو فائدہ ملے گا۔

آج آپ کی خدمت میں یہ بھی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی کو فطری انداز میں گزار لیجیے اور زندگی کا فطری انداز یہ ہے کہ زندگی میں خوش حالی بھی ہے، تنگ دستی بھی، کامیابیاں بھی ہیں، ناکامیاں بھی، تندرستی بھی ہے بیماری بھی۔ ہم یہ نہ چاہیں کہ زندگی کی Positive side پر تو ہم خوش رہیں جب کہ Otherwise صورت حال کو قبول نہ کریں۔ ہم بڑے شاہ صاحب والی وہ بات یاد رکھا کریں کہ اچھے دن ہم نے گزارے تھے تو بُرے دن بھی ہمیں ہی گزارنا ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ سہولتیں، خوش حالی اور تندرستی ہم نے انجوائے کی ہے تو بیماری، تنگ دستی اور مشکلات کو بھی ہم ہنسی خوشی گزار لیں۔ مشکل وقت میں ہم یہ کہنے لگتے ہیں کہ صاحب ہم پر کسی نے تعویذ جادو کر دیا ہے، ہمیں نظر لگ گئی ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ واقعی یہ مشکل وقت کسی جادو، تعویذ یا نظر کا نتیجہ ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ جب ہم خوش حالی کے دور سے گزر رہے تھے تب ہم کسی پیر صاحب کے پاس یہ کہنے کیوں نہیں گئے کہ صاحب دیکھیے! مجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے، میں بڑے اچھے حالات میں ہوں...... خدا کے لیے کچھ کیجیے کہ میری یہ خوش حالی ختم ہو جائے۔ اگر ہم اپنی سہولت بھری زندگی، خوشی و تندرستی کو اپنی محنت اور کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ یہ جو تنگ دستی اور بیماری آئی ہے، یہ ہماری بدتدبیری کا نتیجہ ہے۔ فطری زندگی یہی ہے کہ جس خوشی اور خندہ پیشانی سے ہم خوش حالی، تندرستی اور سہولتوں کو انجوائے کرتے ہیں، اُسی خندہ پیشانی کے ساتھ ہم تنگ دستی اور مشکل حالات کو گزار لیں۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں صبر کے انعامات ملنا شروع ہو جائیں گے۔ صبر مومن کا طریقہ ہے اور مومن کی تعریف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ کی تھی "مومن وہ ہے جس کو نہ کسی چیز کے ملنے کی خوشی ہو نہ کسی چیز کے چھن جانے کا غم۔" میرے نزدیک صبر کی تعریف یہ ہے کہ جہاں رحمت اور زحمت کے درمیان فرق کا احساس مٹ جائے، وہ مقام صبر ہے!

خوش حالی ہو تو بھی خوش، مشکل حالات ہوں تو بھی اُتنی ہی خوشی سے وہ وقت گزار لیا جائے...... یہ صبر ہے۔ زبان پر شکوہ شکایت نہ آئے...... کسی پر اظہار نہ ہو کہ میں مشکلات کا شکار ہوں...... یہ صبر ہے۔ اگر ہم نے زندگی کے دونوں پہلوؤں کو ہنسی خوشی گزارنا سیکھ لیا تو سمجھ لیجیے کہ ہم صابر ہو گئے۔ صابر کا مقام بہت بلند ہے۔

یہ جو ہم تنگ دستی کے بارے میں پریشان رہتے ہیں اور عامل و پیر حضرات کے پاس جا کر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ صاحب اِن بُرے دنوں کو (معاذ اللہ) سیکنڈر دیں۔ حالانکہ اُن کے اختیار میں تو یہ بھی نہیں کہ کمر پر بیٹھی مکھی کو اُڑا دیں تو اُن بے چاروں نے کسی کی تنگ دستی، مصیبت اور بُرے دنوں کو کیا ٹالنا ہے۔ تنگ دستی کو ٹالنے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک ایسی خوب صورت بات کہی جو آج تک دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا Economist نہ کہہ سکا۔ آپؓ نے فرمایا "میں نے اپنے اخراجات اور اپنی ضرورتوں کو اتنا کم کر لیا کہ میں

امیر ہو گیا۔'' لہٰذا اپنے آپ کو امیر کرنے کا ایک نسخہ یہ ہے کہ مشکل حالات میں اپنی ضروریات کو اتنا کم کر لیا جائے کہ انسان امیر ہو جائے۔

گزشتہ 22 سال سے لوگ میرے پاس دُعا کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ان 22 سالوں کا نچوڑ یہ ہے کہ ہم تنگ دستی کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی تنگ رہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے ہمارے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ دشمن ہمارے خلاف پراپیگنڈا کر رہا ہے، ہمیں بدنام کر رہا ہے، سازشیں کرتا ہے......

ایسے موقع پر میری نظر میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم حضرتِ امام حسنؓ کا سارویہ اپنالیں۔

کوفہ کے ایک صاحب علم گورنر سے لوگوں نے کہا کہ آج کے زمانے میں حضرت امام حسنؓ سے زیادہ علم کسی کے پاس نہیں۔ گورنر نے کہا کہ میں اِس بات کو اُس وقت تک تسلیم نہ کروں گا جب تک کہ اس کو آزمانہ لوں۔ گورنر کوفہ نے ایک قاصد کو بلا کر اُس کے سامنے حضرت امام حسنؓ کے بارے میں انتہائی نازیبا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''یہ الفاظ بعینہٖ حضرت امام حسنؓ کے سامنے جا کر دہرا دینا۔ وہ جواب میں جو کچھ فرمائیں، آ کر مجھے من وعن بتانا۔'' قاصد کوفہ سے مدینہ پہنچا اور حضرت امام حسنؓ کے حضور حاضری دی۔ آپؓ محفل میں بیٹھے تھے۔ قاصد نے عرض کی ''میں گورنر کوفہ کا پیغام لایا ہوں اور چاہتا ہوں کہ علیحدگی میں عرض کر دوں تاکہ آپ کی تعظیم اور عزت میں فرق نہ آئے۔'' آپؓ نے فرمایا ''آپ سب کے سامنے کہہ دیجیے'' قاصد نے سرِ محفل گورنر کوفہ کے نازیبا الفاظ دہرا دیے جنھیں سن کر حضرت امام حسنؓ نے صرف ایک جملہ کہا کہ ''گورنر کوفہ نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اگر وہ سچ ہے تو اللہ میرے حال پر رحم فرمائے اور اگر وہ جھوٹ ہے تو اللہ گورنر کوفہ کے حال پر رحم فرمائے۔''

اِس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص آپ کے خلاف پراپیگنڈا کر رہا ہے یا لوگوں کے سامنے آپ کی برائیاں کرتا ہے تو بجائے پریشان ہونے کے حضرت امام حسنؓ کی سنت پر عمل کر لیجیے یہ سوچ کر کہ اگر یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے تو اللہ مجھے اِن خامیوں سے پاک ہونے کی توفیق بخشے اور اگر یہ غلط کہہ رہا ہے تو اللہ اس کے حال پر رحم فرمائے...... اُس نے جو مجھ پر تہمت باندھی ہے، اِس کے لیے اللہ اُسے معاف فرمائے۔

یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہمیں زندگی میں دوڑائے رکھتی ہیں۔ پھر ہم پریشانی کے عالم میں کبھی کسی کے پاس جاتے ہیں تو کبھی کسی کے پاس۔ اگر ہم اُنھیں Positive طریقے سے لیں تو یہ کوئی اِتنی بڑی بات نہیں ہے۔

ہم کسی عامل کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ صاحب! آپ کی شہرت سن کر آپ کے پاس آیا ہوں، مجھے بھی ایک تعویذ دے دیں تاکہ لوگ میرے مطیع ہو جائیں۔ میرے خیال میں اِس قسم کا کوئی بھی سوال دوسروں کے سامنے کرنے کے لیے سب سے پہلے انسان کو اپنی عزت نفس ختم کرنا پڑتی ہے...... شرک کا پہلو اس کے علاوہ ہے۔ انسان اس کی سزا کاٹتا ہے۔ تعویذوں کے بارے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان کے اثرات ہیں ضرور...... لیکن یاد رکھیے کہ تعویذ اپنی مدت پوری ہونے کے بعد اُلٹی مار ضرور مارتے ہیں۔ وقتی طور پر ان سے

شاید کہیں فائدہ ہو جائے کیونکہ کچھ تعویذ کلامِ الٰہی سے لکھے جاتے ہیں...... لیکن جب یہ اپنی مدت پوری ہونے کے بعد الٹی مار مارتے ہیں تو صورت حال بڑی عجیب وغریب ہوتی ہے۔

دُعا کے لیے کئی صاحبان میرے پاس تشریف لائے۔ وہ مشکلات کا شکار تھے۔ کشف میں جا کر دیکھا تو پتا چلا کہ اُنھوں نے تعویذ کرائے تھے کسی کام کی دُرستی کے لیے اور اب اُنھیں اُن تعویذوں کی اُلٹی مار پڑ رہی تھی...... اِسے رجعت کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کام کیا ہی کیوں جائے جس کا وقتی طور پر فائدہ اور بعد میں نقصان ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا اللہ پر اتنا کمزور ایمان ہو ہی کیوں کہ ہمیں تعویذوں کی مدد لینا پڑے۔ کیا رب کافی نہیں ہمارے لیے......؟

مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں ایک فرقہ جسے آئین اور عدالت نے غیر مسلم قرار دیا ہے، اُن کے ہاں ایک انگوٹھی پہنی جاتی ہے جس پر قرآنِ پاک کی ایک آیت ''کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں!'' (الزمر:135) لکھی ہوتی ہے۔ یہ آیت مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ میں نے بجائے کسی انگوٹھی بنانے والے کے پاس جانے کے ایک غیر مسلم صاحب سے کہا کہ جب آپ اپنے سالانہ جلسہ پر تشریف لے جائیں تو میرے ماپ کی ایک انگوٹھی لا دیجیے گا (کیونکہ میرے اندر یہی سوچ تھی کہ قرآنی آیت پر کسی کی اجارہ داری تھوڑی ہے...... اِس پر میرا بھی اُتنا حق ہے جتنا کسی اور کا...... کیونکہ یہ میرے رب کے کلام کا حصہ ہے۔) اُن صاحب نے مجھے انگوٹھی لا دی اور میں نے وہ پہننا شروع کر دی۔ (یہ میں آپ کو دراصل اللہ کے کافی ہونے کی بات بتانا چاہ رہا ہوں۔)

یہ وہ زمانہ تھا جب میں پرنس آغا خان کے لیے کام کر رہا تھا۔ یہ ایک آرگنائزیشن تھی۔ 1970ء میں ہمارے منیجر چھٹی پر چلے گئے تو چونکہ Next senior آدمی میں ہی تھا تو باس نے جاتے ہوئے مجھے ایک مخصوص رائج فقرہ کہا کہ

Ok, I am going, you'll hold the fort.

میں ایک روز کسی کام سے دفتر سے باہر تھا۔ واپس آیا تو ہمارے اکاؤنٹنٹ صاحب نے کہا کہ صاحب آج لیبر ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ سے ایک صاحب آئے تھے، خاصے ناراض ہو کر گئے ہیں۔ ہم نے اُن سے کہا بھی کہ ہمارے انچارج اِس وقت نہیں ہیں، جب وہ آ جائیں تو آپ تشریف لے آئیے۔ دو بجے وہ صاحب میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے ''صاحب! آپ کے ہاں لیبر لاء (Labour law) کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔'' میں نے اُن سے عرض کیا ''بالکل ایسا ہی ہے۔ لیکن یہ پرنس آغا خان کی آرگنائزیشن ہے اور اس کے لیے قانون میں بہت سی Relaxations موجود ہیں۔ اُن Relaxations کی وجہ سے آپ کو Labour law کی خلاف ورزی معلوم ہو رہی ہے۔'' وہ بولے ''نہیں صاحب! خواہ عام انسان ہو یا صدرِ پاکستان جنرل یحییٰ...... قانون سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔'' میں نے کہا ''ٹھیک، پھر بتایئے میں کیا کروں؟'' کہنے لگے ''آپ

فلاں فلاں باتیں نوٹ کرلیں تاکہ آیندہ ایسا نہ ہونے پائے۔ میں فی الحال چالان نہیں کرتا لیکن اگر Next time اِن باتوں کا خیال نہ رکھا گیا تو چالان کردوں گا'' میں اُن کے بتائے گئے Points نوٹ کرنے لگا تو میرے داہنے ہاتھ کی اُنگلی میں پہنی ہوئی وہ انگوٹھی اُن صاحب کی نظر میں آگئی۔ یک دم کہنے لگے'' آپ مجھے پہلے بتادیتے'' میں نے کہا، کیا بتادیتا؟'' انھوں نے میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو مجھے سمجھ آئی کہ وہ انگوٹھی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا'' جی، اس میں کیا ہے؟'' کہنے لگے'' میں بھی اسی سے تعلق رکھتا ہوں'' اوہو...... میں نے کہا'' جناب ایسا نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں...... میں الحمدللہ سنی العقیدہ مسلمان ہوں...... کہنے لگے'' پھر آپ نے یہ انگوٹھی کیوں پہن رکھی ہے؟'' میں نے کہا یہ آیت چونکہ مجھے بہت پسند ہے اس لیے میں یہ انگوٹھی پہنے رکھتا ہوں'' وہ صاحب بولے'' آپ پیپرز مجھے دے دیجیے، میں جارہا ہوں۔'' یوں اُس روز مجھے دکھائی دے گیا کہ ہاں، میرا رب ہی میرے لیے کافی ہے اِس طرح میں چالان سے بچ گیا۔

یقین کرلیجیے کہ رب ہمارے لیے کافی ہے۔ رب پر بھروسا رکھیے۔ تمام قصوں کو چھوڑ دیجیے، صرف ایک چیز پر نظر رکھیے کہ آپ کی ذات سے لوگوں کو فائدہ ملتا رہے۔ اگر آپ کی ذات سے دوسروں کو فائدہ ملتا رہا اور آپ کی ذات سے لوگوں کو کسی قسم کا نقصان، زحمت یا تکلیف نہ ہوئی تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ نہ صرف یہ دُنیا آپ کی ہے بلکہ رب بھی آپ کا ہے۔ رب آپ پر مہربان ہو جائے گا ان شاء اللہ اور جس پر وہ مہربان ہوتا ہے، اُسے اپنا دوست بنالیتا ہے اور جو اُس کا دوست ہے...... اُسے وہ بہت کچھ عطا فرماتا ہے...... اُس پر اُس کی رحمتیں بے پایاں ہوتی ہیں۔

آپ براہِ کرم اِس بات پر توجہ نہ دیجیے کہ آپ کے نام کے ساتھ حاجی لگ جائے یا اگر آپ سلام کریں تو انتہائی عاجزی سے سلام کریں...... یہ سب دکھاوے ہیں۔ دکھاوے سے دُور رہیے کیونکہ یہ آپ کو ریاکاری کی طرف لے جائے گا اور ریاکاری میں سوائے تکلیف اور شرمندگی کے کچھ نہیں ملتا۔ اِن چیزوں سے دور رہیے اور خاموشی سے اپنے رب کو اِس یقین کے ساتھ پکارتے رہیے کہ میں اپنے رب کی جو عبادت کررہا ہوں۔ اِس میں نہ جہنم کا ڈر ہے نہ جنت کا لالچ اور نہ ہی عبادت اِس لیے ہے کہ یہ میرے رب کا حکم ہے بلکہ میں اپنے رب کی عبادت صرف اِس لیے کر رہا ہوں کہ وہ لائق عبادت ہے۔ ایسی عبادت کے جواب میں رب تعالیٰ ہمیں کچھ بھی عطا فرمادے، وہ مالک ہے...... آقا ہے...... ہم اُس کے سامنے سرنہیں اُٹھاسکتے۔ اِس عبادت کے جواب میں وہ جہنم میں پھینک دے تو بھی ہماری مجال نہیں کہ آنکھ اُٹھا جائیں یا یہ کہہ دیں کہ یا مولا! یہ کیا کر رہا ہے تو......؟ اور اگر رب تعالیٰ ہمیں جنت عطا فرمادے تو یہ اُس کی مہربانی ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے۔ وہ ہر حال میں مالک ہے، آقا ہے اور اپنے آقا کی کسی بھی بات پر اُنگلی اُٹھانے کے ہم مجاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو یہ توفیق بخش دے کہ ہم اپنے رب کی رضا میں راضی ہونا سیکھیں۔ جو کچھ وہاں سے عطا ہو جائے، ہم اُس پر عمل کرلیں۔

سوال: گزشتہ دنوں الحمرا میں علم الغیب کے موضوع پر ہونے والے مذاکرہ میں ایک جج صاحب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہر کام ہوتا ہے یہاں تک کہ خزاں میں ہر پتا بھی خدا کے حکم سے گرتا ہے۔ تو پھر یہ جواب باجوڑ ایجنسی میں 83افراد مارے گئے ہیں یہ کیا معاملہ ہے۔ اِسی طرح بہت سے لوگوں کے ساتھ زندگی میں ناانصافی ہو جاتی ہے...... یہ سب کیا ہے۔

جواب: آپ پاکستان میں رہتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ کیا اِس ملک کے اندر صدر کی مرضی کے خلاف کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ صدر پاکستان اتھارٹی ہے۔ اگر جمہوریت ہو گی تو Ultimate authority وزیر اعظم کی ہو گی۔ وہ محافظ ہے اس ملک کا بھی اور اِس ملک کے شہریوں کا بھی، اُن کی جائیداد، اُن کے مال اور ان کی جان کا بھی۔ ہے ناں ایسا۔ اِس کے باوجود یہاں چوریاں ڈکیتیاں بھی ہوتی ہیں......لوگ بھی قتل ہوتے ہیں۔ اگر ہم سمجھیں کہ یہ سب ملک کے چیف ایگزیکٹو کی مرضی سے ہو رہا ہے تو پھر اُن تمام چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو سزا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اُنھوں نے President کے چاہنے پر یہ سب کیا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اُن سب کو سزا ملتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ Ultimate authority بے شک صدر یا وزیر اعظم کی ہے لیکن اُس نے شہر کے ڈپٹی کمشنر، ایس ایس پی اور علاقے کے ایس ایچ او کو اختیارات دے رکھے ہیں کہ لوگ اگر عطا کردہ اختیارات اور آزادی سے تجاوز کرتے ہیں اور ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اُن پر گرفت کی جائے۔ ہر انسان کو ایک خاص درجے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اِس آزادی کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسرے آدمی کی آزادی شروع ہو جائے۔

رب تعالیٰ مالکِ کل ہے۔ پوری کائنات کا مالک ہے...... جتنے بھی جہان ہیں، سب کا وہ مالک ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا لیکن اُس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا اور انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے۔ چونکہ وہ خود قادرِ مطلق ہے اِس لیے اُس نے اپنے نائب کو بے اختیار نہیں رکھا۔ اُسے مجبورِ محض نہیں بنایا...... بلکہ اُس نے اُسے بہت سی آزادیاں عطا فرمائی ہیں جس میں سوچنے کی بھی آزادی ہے کہ وہ جو چاہے سوچے، فیصلے کی بھی آزادی ہے اور عمل کی آزادی بھی......اس کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ نے یہ قانون بنا دیا کہ اِس نائب کو دُنیا میں جا کر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک وہ اللہ کی اُن متعین کردہ حدود میں رہ کر عمل اور اللہ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرتا ہے، وہ دُنیا میں عزت اور آخرت میں اجر پاتا ہے۔ لیکن اگر وہ خلاف ورزی کرتا ہے تو سزا پاتا ہے۔ بالکل اِسی طرح جب اِس ملک میں رہنے والا شخص Law of the land کی خلاف ورزی کرتا ہے تو سزا پاتا ہے لیکن جب وہ Law of the land کی پیروی کرتا ہے تو پوری آزادی سے اپنی زندگی انجوائے کرتا ہے......لیکن Ultimate authority صدر یا وزیر اعظم ہی کی رہتی ہے۔

یاد رہے کہ اتھارٹی اور ملکیت رب ہی کی ہے۔ وہ جب چاہے آپ کی آزادی میں بریک لگا دے اور اپنی ویٹو پاور استعمال کرتے ہوئے آپ کے چلتے ہوئے کام کو روک دے۔ یہ اُس کی اتھارٹی اور حق ہے لیکن چونکہ

اُس نے انسان کو آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ انسان کو صرف اُس وقت روکتا ہے جب نظامِ کائنات میں خلل آنے لگے...... یا خود انسان کو بہت نقصان ہونے لگے تو رب اپنی ویٹو پاور استعمال کر کے انسان کو اُس عمل سے روک دیتا ہے۔

باجوڑ میں 83 لوگ شہید ہو گئے...... سوال یہ ہے کہ کیا وہ کوئی غلط کام کر رہے تھے یا حق پر تھے۔ عام انسان پر تو ایک قانون نافذ ہوتا ہے لیکن مسلمان پر دو قوانین لاگو ہوتے ہیں Law of the land اور Law of nature...... یہاں رہنے والے لوگوں نے اللہ کی طرف سے عطا کردہ Freedom of action (عمل کی آزادی) کو Exercise کیا اور بمباری کی۔ جس کے نتیجے میں 83 لوگ شہید ہو گئے۔ اگر اُنھوں نے زیادتی کی ہے تو اُنھیں یہاں بھی اور آخرت میں بھی سزا ملے گی...... اگر یہ لوگ اپنے عمل میں درست ہیں تو اُنھوں نے اپنا فرض نبھایا ہے۔

سوال: قرآن پاک میں بار بار یہ بات آئی ہے کہ ہم جسے چاہیں ہدایت دیں اور جسے چاہیں نہ دیں...... سمجھ نہیں آتی کہ ایسی صورت میں ہم گناہ گار کہاں پر ہیں۔

جواب: آپ کتابت کرتے ہیں۔ اِس کا ایک خاص معاوضہ طے ہے کہ فرض کریں فی سطر آپ کو دس روپے ملیں گے، ہر سطر میں اتنے حروف ہوں گے۔ اب آپ کتابت کریں گے تو معاوضہ مل جائے گا...... کتابت نہیں کریں گے تو معاوضہ نہیں ملے گا۔ اگر آپ نے کتابت بہت خوب صورت کی ہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ کے کام سے خوش ہو کر میں کہوں کہ صاحب! آپ نے کتابت بہت اچھی کی ہے، یہ پانچ سو روپے آپ کا انعام ہے۔

اب یہاں دو چیزیں ہیں...... ایک جو آپ کا معاوضہ طے ہوا تھا وہ آپ کا حق تھا اور آپ کو ملنا چاہیے تھا۔ آپ نے کتابت کی تو مل گیا...... نہیں کی تو نہیں ملا۔ دوسرا پانچ سو روپیہ میں نے اپنی خوشی سے آپ کو دیا...... میں جس کو چاہوں دوں، جس کو چاہوں نہ دوں...... وہ میری مرضی ہے۔

رب تعالیٰ نے کتابِ ہدایت اُتاری...... ہر عاقل و بالغ شخص پر فرض ہے کہ وہ خود اس ہدایت کی جستجو کرے...... جس نے اِس پر محنت کی اُسے ہدایت ملے گی۔

ایک ہدایت ہے من جانب اللہ۔ ایک شخص یہ سن کر کہ نبی کریم ﷺ اُن کے خداؤں کی پرستش سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک رب کی عبادت کی جائے تلوار لے کر (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کی زندگی ختم کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ پہلے مسلمان بہن کی زندگی کے خاتمے کے لیے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ تلاوت قرآن پاک کر رہی ہیں۔ وہ آواز کانوں میں پڑتی ہے تو دل کی حالت بدل جاتی ہے...... کایا ہی پلٹ جاتی ہے...... وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ یہ ہدایت من جانب اللہ ہے...... اس کی جستجو نہیں تھی۔ تو وہ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ اُن کے اسلام لانے کے بعد اللہ نے اتنی ہدایت دی کہ وہ حضرت عمرؓ فاروق اعظم کہلائے۔

ایک ہدایت وہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کو ملی کہ اُنھوں نے جستجو کی، اُن تک پیغام

پہنچا۔ اُنھوں نے اُس پیغام کو تسلیم کیا اور اُس پر عمل کیا...... یوں ہدایت و فلاح پا گئے۔

یہ رب کی صوابدید ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے نہ بخشے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی ہے کہ اگر کسی وجہ سے اللہ نے دلوں پر مہر لگا دی تو کتنی ہی جستجو کر لی جائے ہدایت کی، ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

یہ آیت دو جگہوں پر Apply کی جائے گی...... اگر کسی وجہ سے دل پر (خدانخواستہ) قفل لگ گیا تو پھر باوجود ہدایت کی جستجو کے ہدایت میسر نہ آئی، رب نے اپنا حق استعمال کر لیا۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں میں نے حضرت عمرؓ کی مثال عرض کی۔

قرآنِ پاک میں دو طرح کی سورتیں اور بیان ملیں گے...... ایک بینات ہیں جنھیں کھلے لفظوں میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اِن کے اندر کوئی ابہام نہیں ہے۔ جب کہ کچھ باتیں رب تعالیٰ اہلِ علم کے لیے مخصوص رکھتا ہے۔ جو بھی آدمی علم اور عقل کے اِس خاص مقام پر پہنچے، اُس کی سمجھ میں وہ باتیں آنے لگتی ہیں اُنھیں متشابہات کہا جاتا ہے۔ اللہ نے اُنھیں استعارہ کے طور پر بیان کر دیا۔ جب انسان علم اور ہدایت کے خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اُن کو جان لیتا ہے جب کہ بینات میں احکام بہت واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں...... جیسے زکوٰۃ، حج، طلاق اور انسانی حقوق کے بارے میں احکامات بہت واضح ہیں اور اُنھیں با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

سوال: جب انسان تنگی کے دور سے گزر جائے اور اللہ کا فضل و کرم آ جائے تو ایسے میں بندے کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: بھائی! کچھ مت کیجیے، زیادہ لمبے چکر میں نہ پڑیے...... صرف ایک چھوٹا سا کام کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے، مادی یا اندرونی خوشی کی صورت میں Tangible or intangible اُس میں دوسروں کو حصہ دار بنا لیجیے۔ خوشیاں بانٹ لیجیے دوسروں کے ساتھ۔ جو رحمتیں اللہ نے آپ پر کی ہیں اُنھیں دوسروں کے ساتھ بانٹ لیجیے اور کوشش کیجیے کہ دوستوں کے ساتھ کم اور دشمنوں کے ساتھ زیادہ بانٹیں۔ اِس سے بڑا رب کی نعمتوں کا شکر میری نظر میں تو کوئی نہیں ہے......!

علم لدنی کے حصول کا راستہ

چونکہ یہاں تشریف لانے والے ہمارے بھائی شعوری یا لاشعوری طور پر علم لدنی کے حصول کی خواہش رکھتے ہیں اس لیے ہماری گفتگو کا محور یہی Point رہا۔ علم لدنی کے حصول کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں ہیں۔ خوش فہمیاں یوں کہ انسان کو جب یہ علم حاصل ہو جاتا ہے تو اُسے چھپی ہوئی تمام چیزوں کا علم ہونے لگتا ہے، اُس کے پاس ماورائے فطرت قوتیں آ جاتی ہیں، اُسے کشف و کرامات حاصل ہو جاتی ہیں۔ چونکہ آج گفتگو کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہے اس لیے میرے دل میں خیال آیا کہ آج میں اِن باتوں کو بیان کردوں۔

اگر ہم ذکر اذکار اور اوراد و وظائف کا سائنسی جائزہ لیں تو درحقیقت یہ ایک طرح کی Exercise یا ورزش ہیں...... بلکہ اس کی زیادہ بہتر مثال یہ ہوگی کہ جس طرح مارشل آرٹس سیکھنے سے پہلے ہم بدن اور اعصاب کو ایک مخصوص لوچ اور لچک دینے کے لیے مختلف ورزشیں کرتے ہیں تاکہ جب ہم جوڈو کراٹے کے مختلف داؤ پیچ کھیلیں تو کوئی Muscle pull نہ ہو...... اِسی طرح علمِ لدنی کے حصول میں ذکر اذکار یہی کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمیں عام زندگی میں مزدور، کاریگر اور آرٹسٹ، فنکار یا اُستاد سے واسطہ پڑتا ہے۔ (یہاں اُستاد سے مراد پڑھانے والا نہیں بلکہ مہارت کے انتہائی درجے پر پہنچا ہوا شخص ہے۔) مزدور، کاریگر اور ایک فنکار میں کیا فرق ہے؟ اگر ایک مکان بن رہا ہے تو اُس پر کام کرنے والے مزدور کو دو یا تین سو روزانہ اُجرت ملتی ہے...... حالانکہ وہ بہت سخت کام کر رہا ہے کہ اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر وہ اُوپر کی منزل پر جاتا ہے۔ بڑا سخت کام کرنے کے باوجود اُس کی مزدوری بہت کم ہے۔ اِس کے برعکس معمار کا کام مزدور کی نسبت بہت آسان ہے۔ وہ مزدور کی لائی ہوئی اینٹوں کو اُٹھاتا اور اُن پر سیمنٹ لگاتا ہے۔ اگر مزدور دو سو روپیہ مزدوری لے رہا ہے تو معمار کی اُجرت آٹھ سو روپے ہے۔ وہ راج یا معمار بھی دھوپ اور بارش میں بیٹھ کر کام کر رہا ہے۔ موسم کی سختیاں سہہ رہا ہے جب کہ اُسی مکان کا نقشہ بنانے والے Architect نے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کھڑے ہو کر وائٹ بورڈ پر صرف لائنیں کھینچ کر وہ کاغذ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ دس گھنٹے کی محنت کے جواب میں اُس نے Total cost of house کا کم از کم دو فی صد آپ سے چارج کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے......؟

وجہ یہ ہے کہ مزدور صرف جسمانی محنت کر رہا ہے جس میں اُس کی سوچ اور خواہش کو کوئی دخل نہیں۔ وہ صرف ایک مشین کی طرح اینٹیں سر پر اُٹھاتا اور اوپر پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس راج یا معمار اپنا ذہن استعمال کر رہا ہے کہ دیوار ٹیڑھی نہ بننے پائے...... سیمنٹ نہ ضرورت سے زیادہ ہونے پائے نہ کم...... دیوار کی سطح Smooth رہے۔ معمار چونکہ اپنا دماغ اور مہارت استعمال کر رہا ہے اس لیے مزدور سے چار گنا زیادہ اجرت لے رہا ہے۔ Architect نے مکان کا نقشہ بڑے شوق اور ذوق سے بنایا ہے، اِس میں اُس کا اپنا نام بھی شامل ہے کہ میں اس کو اِس طرح ڈیزائن کروں کہ اِس میں رہنے والوں کو تو سہولتیں ملیں ہی لیکن میرا نام بھی ہو۔ یوں اُس کے اندر شوق، جذبہ اور خواہش شامل ہے۔ دوسرا، اُس نے اِس میں اپنی مہارت استعمال کی ہے کہ جگہ بہترین ہو، Cost effective ہو۔ Comfortable ہو۔ چونکہ Architect نے جسمانی اور ذہنی مشقت کے ساتھ ساتھ ذوق وشوق کو بھی استعمال کیا ہے اس لیے اُسے نہ صرف گھر کی ٹوٹل لاگت کا دو فی صد بطور معاوضہ ملا ہے بلکہ انعام اور شہرت بھی ملی ہے۔

اِسی طرح جب ہم تسبیح پھیر رہے ہوتے ہیں اور محض زبان سے پڑھ رہے ہوتے ہیں...... جب کہ ذہن دفتر کی کسی پرابلم یا کرکٹ میچ میں اٹکا ہے...... تو یہ محض مزدوری ہے جس کے نتیجے میں سوائے ثواب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر میں نے یک سو ہو کر، سوچ سمجھ کر کوئی وظیفہ یا ذکر پڑھا تو میری توجہ ہونے لگتی ہے۔ مجھے اپنی توجہ کو ایک خاص نقطے پر مرکوز کرنے کی Practice ہو جائے گی۔ کچھ عرصے بعد میرا دل اور ہاتھ دونوں یک سو ہو جائیں گے۔ جہاں اِن دونوں نے مل کر پڑھنا شروع کر دیا وہاں رب کی طرف سے میرا انعام کئی گنا بڑھا دیا گیا۔ بالکل اُس کاریگر کی طرح جو اینٹیں لگاتے ہوئے اپنا دماغ بھی استعمال کرتا ہے اور مزدور کی نسبت چار گنا زیادہ اجرت وصول کرتا ہے۔ اگر ذکر کے دوران میرا ذوق وشوق اور دل بھی اِس میں شامل ہو گیا، ہاتھوں نے تسبیح کے دانے چلائے اور زبان نے ذہن کے تابع ذکر کیا، دل نے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا تو میرا ہاتھ، میرا دل اور میرا ذہن بیک وقت ایک ہی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر میری مزدوری Architect کی طرح نہ صرف علم لدنی کی صورت میں ثمر بار ہوئی بلکہ اللہ کا قرب بھی مجھے حاصل ہو گیا۔ جو شخص یک سو ہو کر ذوق وشوق سے ذکر اذکار میں مصروف ہوتا ہے، رب تعالیٰ کی طرف سے اُسے یہ دونوں چیزیں عطا ہو جاتی ہیں۔

ہم میں سے بڑی اکثریت محض روٹین میں ذکر اذکار کر رہی ہوتی ہے...... اس میں اُن کا دل اور دماغ ساتھ نہیں دے رہا ہوتا، صرف زبان اور ہاتھ چل رہے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُنھیں اُس ذکر اذکار کے انعامات بہت کم ملتے ہیں۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ وظائف کا پڑھنا اور ذکر اذکار کرنا درحقیقت ایک ورزش ہے جس سے ہمیں یک سوئی کے حصول میں مدد ملتی ہے اور جب ہم یک سو ہر کر ذوق وشوق سے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو رب بھی ذوق وشوق کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں قرب الٰہی حاصل ہو جائے گا تو رب

ہمیں اپنا دوست بنالے گا اور جب وہ اپنی قربت عطا فرمادے تو اُس وقت وہ ہمیں اپنے سینے سے لگائے گا، ہم اُس کے پسندیدہ بندے ہو جائیں گے۔ اور رب کا پسندیدہ بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم رب تعالیٰ کی اطاعت کریں، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم سنت رب اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرنا شروع کر دیں۔

اگر ہم قرآن پاک پڑھیں تو اِس میں اللہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ کن لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ایک جگہ اُس نے فرمایا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے، وہ معاف کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔ یہ اللہ کا Clear cut وعدہ ہے...... اِس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یوں بڑا آسان سا نسخہ ہمارے ہاتھ لگ گیا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔ اللہ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ جو ذکر کرتے ہیں بلکہ اُس نے Clearly کہا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے......!

اگر ہم اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرلیں کہ دوسروں کو معاف کر دیا کریں تو اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے وعدے کے مطابق ہمیں پسند کرنے لگے گا۔ اور معاف کر دینے کے بعد بھی کئی درجے ہیں۔ پسندیدہ عمل یہ ہے کہ اگر کسی نے آپ سے معافی مانگی تو آپ اُسے معاف فرمادیں۔ اِس سے اوپر کا درجہ یہ ہے کہ جہاں کسی نے معذرت کی تو بڑی خوش دلی سے نہ صرف اُسے معاف کر دیں بلکہ ساتھ کوئی نہ کوئی Good will بھی Show کریں مثلاً اُسے سینے سے لگالیں، قہقہہ لگائیں اور کہیں کہ تم نے کچھ بھی نہیں کیا، کیوں معافی مانگ رہے ہو......! خوش دلی سے معاف کرنے کا یہ انداز اللہ کو بہت پسند آئے گا۔

معاف کرنے کا ایک اور بہترین درجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ دوسرے کو کوئی قصور کرنے سے پہلے ہی معاف کر دیں۔ آپ کو یہ بات بڑی عجیب سی لگے گی کہ کسی کو قصور کرنے سے پہلے بھلا کیسے معاف کیا جا سکتا ہے......! جب قصور ہی نہیں کیا تو معافی کس بات کی......! تو بھائی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر شخص سے توقع رکھیے کہ وہ خطا کا پتلا ہے، اُس سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہو گئی تو میں اُس کی کوتاہی پر بُرا ماننے کے بجائے خود کو کیوں نہ سمجھالوں کہ وہ بھی انسان ہے۔ آخر اُس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے یوں میں اُس کی اُن تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کو قبول کرلوں جو وہ کرنے والا ہے۔ اِس طرح گویا میں نے اُس کے کوتاہی کرنے سے پہلے ہی اُسے معاف کر دیا۔

ایک ڈاکٹر صاحبہ 1987ء سے یہاں تشریف لاتی ہیں۔ ایک بار اُن سے یورپ میں سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ اُن کے Husband بھی ڈاکٹر ہیں...... وہ بھی ساتھ تھے۔ دورانِ گفتگو اُنھوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا کہ آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہیں ہوتی؟ آپ نے کبھی کسی کا گلہ شکوہ نہیں کیا؟ یہ خصوصیت میرے اندر کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ میں نے اُن کو ایک نسخہ بتایا۔ معلوم نہیں وہ نسخہ آپ کے کام آتا ہے کہ نہیں، وہ حکیمی نسخہ تھا جو شاید سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے اہلِ فقر کے درمیان۔

سو، میں نے عرض کی کہ میں جب بھی کسی صاحب سے ملتا ہوں تو اُن سے بڑی گہری توقعات وابستہ کر لیتا ہوں۔ جب میں نے یہ جملہ کہا تو اُن کے چہرے پر حیرت تھی کیونکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ کبھی کسی سے توقعات

وابستہ نہ کیجیے ورنہ آپ کو مایوسی ہوگی...... جب کہ میں نے اس کے برعکس بات کی کہ میں تو بڑی گہری توقع وابستہ کر لیتا ہوں۔ یہ توقع کہ یہ شخص مجھے بھرے بازار میں ذلیل وخوار کرے گا۔ جب وہ ذلیل وخوار نہیں کرتا بلکہ صرف بُرا بھلا کہتا ہے تو مجھے وہ شخص بڑا اچھا لگتا ہے کہ اُس نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ اِسی طرح جب کوئی شخص مجھے برا بھلا نہیں کہتا، صرف Dirty looks دیتا ہے تو میرے نزدیک وہ بڑا مہذب انسان ہوتا ہے اور جب کوئی شخص مجھے Dirty looks نہیں دیتا، محض لعن طعن کر کے چلا جاتا ہے تو میرے نزدیک وہ فرشتہ ہے، بہت ہی نیک آدمی ہے......اور جو شخص مجھے برا بھلا نہیں کہتا، خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے تو میں اُس کا مرید ہو جاتا ہوں کہ اُس جیسا آدمی روئے زمین پر نہیں ہے۔ تو یوں مجھے آج تک سبھی اچھے لوگ ملے ہیں۔ وہ جو کسی کو قصور کرنے سے پہلے ہی معاف کرنے کی بات ہے، وہ اِسی زمرے میں آتی ہے کہ آپ ہر انسان کو خطا کا پتلا سمجھیں...... غلطی اور کوتاہی کا سرزد ہونا انسانی سرشت میں ہے۔ ہم اِس حقیقت کو تسلیم کر لیں اور دوسروں کے خطا کرنے سے پہلے اُنھیں معاف کر دیں تو ہم اللہ کے قریب ہو جائیں گے۔

اللہ نے قرآن پاک میں یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ احسان کا سلوک کرتے ہیں، وہ رب تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں...... لہٰذا رب کا پسندیدہ بننے کے لیے ہم ان دو چیزوں کو پکڑ لیں...... ایک تو دوسروں کو معاف کر دیا کریں اور دوسرے احسان کا سلوک کیا کریں۔ ایک اور قسم کے لوگوں کا ذکر قرآن پاک میں بہت اچھے الفاظ میں کیا گیا...... یہ وہ لوگ ہیں جو نصف شب سے ذرا پہلے اور نصف شب سے ذرا بعد تک رب کو یاد کرتے ہیں۔ اس لیے ہم عبادات کے اِس پہلو کو پکڑ لیں کہ جس میں اُن لوگوں کو یاد کیا گیا ہے جو رب تعالیٰ کا نصف شب سے ذرا پہلے تک یا نصف شب کے بعد تک ذکر کرتے ہیں۔ اِن تینوں چیزوں کو اپنانے والا اللہ کے قریب چلا جائے گا۔ پھر رہ گئی بات سنتِ رب اور سنتِ رسول ﷺ کی تو رب تعالیٰ نے اپنے آپ کو 'ستار' کہا ہے کہ وہ لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ آپ اِس سنت رب پر عمل کر لیجیے۔ اُس نے اپنے آپ کو رحیم وکریم کہا ہے، اُس کی اِس سنت پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے لیے مہربان ہو جائیے......!

آپ ﷺ نے عزت حاصل کرنے کا ایک بڑا آسان نسخہ بتایا کہ لوگوں کے لیے متواضع ہو جائیں۔ یہ جتنی باتیں میں نے کہی ہیں، ذرا سی نظر دوڑائیے کہ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آپ جو کتابیں پڑھتے ہیں اگرچہ اُن میں زیادہ تر زور کشف وکرامات پر ہوتا ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہم اِن چیزوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں حالانکہ اِس کی کوئی ویلیو نہیں ہے لیکن اگر ہم بنظرِ غائر اِن کتابوں کو پڑھیں تو ایک چیز اِن میں Common (مشترک) نظر آئے گی کہ کم مرتبہ ولی اللہ ہو یا اعلیٰ ترین مرتبے کا ولی اللہ...... اُن میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ کوئی ولی اللہ ایسا نہیں ہے جس میں یہ خوبیاں موجود نہ ہوں یا وہ اِن پر شدت کے ساتھ عمل نہ کرتا ہو۔

جس زمانے میں خانقاہی سسٹم عروج پر تھا، وہاں جو شخص علم کے حصول کی نیت سے آتا اور اُسے شاگردی میں قبول کر لیا جاتا تو دستور کے مطابق سب سے پہلے اُس کے سر پر اُسترا پھروا دیا جاتا تھا...... اُس کے بال

اُتروا دیے جاتے۔ ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ بالوں کو Properly arranged اور جوتوں کو صاف رکھنے کی بہت اہمیت ہے۔ حدیث ہے جس کے بال ہوں وہ ان کی تکریم کرے (ستھرا اور عمدہ رکھے) (ابوداؤد:4165)۔ آپ دیکھیے کہ جو شخص آپ سے ملنے آیا ہے اگر اُس کے بال اُلجھے ہوں تو وہ آپ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑے گا۔ اسی طرح اگر اُس کے جوتوں پر گرد پڑی ہے تو اچھا تاثر قائم نہیں ہوگا۔ اولیائے کرام کو کبھی دیکھیے اُن کے بال ہمیشہ بنے ہوئے ہوں گے۔ اور جوتے ہمیشہ چمک رہے ہوں گے۔

بات خانقاہ پر حصولِ علم کی غرض سے آنے والے شخص کے سر پر اُسترا پھیرنے کی ہو رہی تھی۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ بال اُتروا کر زیبائش اور ظاہری خوب صورتی کا ذریعہ ختم کر دیا جائے۔ اِس کے بعد اُن کو ہلکی قسم کے ذکر اذکار دیے جاتے۔ فرض عبادات پر زور دیا جاتا۔ کوئی چھوٹا موٹا ذکر دے دیا جاتا اور خانقاہ کی کوئی ادنیٰ ترین خدمت سونپ دی جاتی۔ مثال کے طور پر خانقاہ پر جھاڑو لگانے اور وہاں کی صفائی کرنے کی ذمہ داری اُسے دے دی جاتی بغیر یہ دیکھے کہ وہ آدمی کوئی بادشاہ ہے، وزیر ہے یا کوئی افسر...... کسی بھی Status کے آدمی سے وہ ادنیٰ ترین خدمت لے لی جاتی۔

سر پر اُسترا پھروا کر بال اُتار کر آپ کی شکل وصورت کو زیبائش کے لیول سے ہٹا دیا گیا اور اِس کے بعد آپ کے ذمہ یہ خدمت لگا دی گئی کہ آپ خانقاہ میں لوگوں کی ادنیٰ ترین خدمت سرانجام دیں...... اُن کے جوتے جھاڑ پونچھ کر سیدھے رکھیے، اُن کو Arrange کیجیے یا خانقاہ میں جھاڑو دیجیے، لوگوں کے سامنے برتن لا کر رکھیے، جھوٹے برتن اُٹھا کر لے جائیں، برتن دھوئیے۔ یہ سب اس خیال کی مشق ہے کہ میں دُنیاوی لحاظ سے ادنیٰ ترین غلام ہوں...... اللہ کے سب بندوں سے ادنیٰ ہوں...... اِن کی خدمت مجھ پر فرض ہے۔

یہ ایک Psychological treatment تھا جو آدمی کے ساتھ کیا جاتا تھا...... پیشتر اس کے کہ اُس کو تربیت دی جائے۔ اِس کے بعد وہ درجہ بہ درجہ اُوپر آتا تھا۔ تب ایک اعلیٰ درجہ کی خدمت جو بہت ایگزیکٹو تھی اور اُس کی ڈیمانڈز بھی بہت ایگزیکٹو تھیں، وہ اُسے سونپ دی جاتی...... کہ وہ لنگر تقسیم کرے۔ اُس میں اُسے حق اور انصاف کا سبق ملتا تھا کہ مجھے کس طرح لوگوں کے درمیان انصاف کرنا ہے دشمن ہو یا دوست۔ کسی کے لیے Liking ہے یا Disliking...... میرا ہاتھ سب کے لیے یکساں ہے۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک کروں اور خود اپنے آپ کو سب سے آخر پر رکھوں۔ اگر لنگر تقسیم کے بعد کچھ بچ گیا تو میں کھا سکتا ہوں ورنہ نہیں۔ فاقہ میرا حصہ اور کھانا دوسروں کا حصہ ہے۔ خانقاہ پر تربیت کی یہ ترتیب تھی جس میں لنگر پر ڈیوٹی کافی ایڈوانس لیول پر تھی پھر کہیں جا کر نوبت آتی تھی چلہ کشی کی۔

چلہ کشی کے دوران رُوح کی تربیت کے لیے تین روزے رکھوائے جاتے تھے جو کہ مسلسل رکھے جاتے۔ زندگی میں ایک بار تین روزے مسلسل ہیں کہ آج میں نے جو سحری کی، پورا دن میں روزے سے رہا اور افطار کے وقت صرف ایک گھونٹ پانی سے روزہ کھول لوں۔ اگلے دن ایک گھونٹ پانی پی کر روزہ رکھ لوں گا اور کچھ نہیں کھاؤں گا۔ دوسرے روز بھی پانی کے ساتھ افطار کروں گا اور تیسرا روزہ بھی پانی کے گھونٹ کے ساتھ ہی

رکھوں گا۔ اِس تمام عرصے میں میری عبادات جاری رہیں گی، خانقاہ کی خدمت بھی جاری رہے گی، میرے دُنیاوی معاملات میں کوئی فرق نہیں آئے گا...... اور نہ میں کسی پر ظاہر ہونے دوں گا کہ میرا روزہ ہے حتیٰ کہ تیسرے روزے کا افطار میرے مرشد اپنے ہاتھ سے کرائیں گے...... وہ مجھے کچھ کھانے کو دیں گے۔ یہ ضبط کی بہترین مثال تھی، ضبط کی بہترین تربیت تھی۔ کبھی اپنے اُوپر ضبط کی ضرورت پیش آجائے تو آسانی کے ساتھ ایسا کیا جاسکے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ احساس پیدا کرنا بھی مقصود ہوتا تھا کہ اگر میں نے روزہ رکھا ہے تو وہ کسی پر احسان نہیں ہے کہ مجھے میری ڈیوٹی کے دوران کوئی سہولت دے دی جائے۔ اب مجھے بھوک بھی برداشت کرنی ہے...... اُسے لوگوں پر ظاہر بھی نہیں ہونے دینا اور اپنے معمولات میں بھی فرق نہیں آنے دینا۔ یہ سب تربیت کا انداز تھا۔

اگر آپ اِس سارے سلسلے کو دیکھیں کہ کس طرح سے خانقاہ میں خدمت لی جاتی تھی، کیا کیا Duties سونپی جاتی تھیں...... اُن کے ساتھ ساتھ عبادات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اِس سب سے انسان میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جاتیں جن سے علم لدنی حاصل ہوتا ہے، انسان اللہ کے قریب چلا جاتا ہے۔ تمام فقیروں کے ہاں یہ خوبیاں اِسی لیے ہیں کیونکہ سب کی تربیت اسی نہج پر ہوتی ہے۔

آپ کسی بھی فقیر کو دیکھ لیں...... وہ زندگی میں کبھی مدعی نہیں بنتا۔ اُس کی زبان پر کسی شخص کے رویے کے بارے میں کوئی گلہ شکوہ نہیں آئے گا، وہ کبھی بدلہ نہیں لے گا کسی سے۔ لوگوں کے لیے اگر کچھ کرے گا تو اپنی Duty سمجھ کر کرے گا اور اُسے بھلا دے گا۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کے کھانے کا بندوبست کرے گا۔ اپنے حصے کا کھانا ہمیشہ دوسروں کو پیش کر دے گا اور اِس انداز میں کرے گا کہ کھانے والا یہ سمجھے کہ اِس کے پاس تو یہ فالتو ہے، پھینکنا تھا، سو مجھے دے دیا۔ فرض عبادات کو ہر حال میں پورا کرے گا جب کہ نفلی عبادات ذکر اذکار اور اورادو وظائف پر زور قدرے کم ہو گا۔ اہلِ فقر کے ہاں فطرت کی تربیت پر زیادہ زور ہے کہ انسانی فطرت کی تربیت اِس انداز میں کی جائے کہ وہ ایک خاص سانچے میں ڈھل جائے۔

عجیب بات ہے کہ علم لدنی کے حصول کی خواہش رکھنے والوں کا تمام تر زور ذکر اذکار اور وظائف پر ہوتا ہے۔ اگر میں بھی کسی فقیر کے پاس جاتا ہوں تو پہلا سوال یہی کروں گا کہ مجھے پڑھنے کو کچھ بتا دیں...... حالانکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ جس فقیر کے پاس میں آیا ہوں، وہ صاحبِ کمال فقیر ہے۔ وہ اِس کمال کی منزل پر کیسے پہنچا؟ اُس کی زندگی کے معمولات اور اُس کے رویے دیکھنے لگیں گے تو اُن میں عبادات کا پہلو بھی خود بخود آجائے گا۔ معمولات زندگی میں توازن بہت ضروری ہے۔

بہت پرانی بات ہے، میں اُن دنوں سرکاری نوکری میں تھا اور بہت پریشان تھا کیونکہ میری ڈیوٹی کچھ اہم کاموں پر تھی۔ مصروفیت بے پناہ تھی، سفر بھی بہت تھا...... پھر لوگ بھی مجھے نہیں چھوڑتے تھے۔ پریشانی یہ تھی کہ اِس سب کی وجہ سے میری فیملی مجھ سے Neglect (نظر انداز) ہو رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری ڈیوٹی نظر انداز ہونے لگے گی اور میں لوگوں کی خدمت پوری طرح سے نہیں کر سکوں گا۔ یہ تینوں خطرے مجھے

Upset کیے ہوئے تھے۔ اُنہی دنوں میں ٹور پر کراچی گیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ گلشن اقبال کے علاقے میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جو شاید صدیقیہ مسجد کہلاتی ہے۔ میں بارہ بجے وہاں جا بیٹھا (جمعہ کے روز میرا معمول ہے کہ بارہ بجے مسجد میں جا بیٹھتا ہوں۔) پڑھتے پڑھتے مجھے درمیان میں ایک ذکر سے دوسرے ذکر پر شفٹ ہونا تھا۔ اُن دو چار لمحوں کی بریک میں میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے دیوار پر ایک کالا کتبہ لگا نظر آیا جس پر لکھا تھا کہ آپ ﷺ نے اپنے 24 گھنٹوں کے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا......ایک حصہ وقف تھا اُمور مملکت اور صحابہ کرامؓ سے ملاقات کے لیے۔ دوسرا حصہ وقف تھا آپ ﷺ کی خانگی زندگی کے لیے جس میں آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کی گھریلو معاملات میں مدد فرماتے۔ دن کا تیسرا حصہ وقف تھا عبادات اور آرام کے لیے۔

اس تحریر سے مجھے واضح طور پر راہنمائی مل گئی کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کو کس طرح Organise کیا ہوا تھا۔ آپ فقیر کی زندگی کو دیکھیے کہ اُس نے اُسے کیسے ترتیب دیا ہے۔ اپنی زندگی کو بھی اُسی انداز میں ترتیب دے لیجیے تاکہ آپ کے خانگی معاملات (Family obligations) بھی بڑے خوب صورت طریقے پر پورے ہوتے چلے جائیں۔ روزگار سے متعلق آپ کے معاملات پورے ہوتے رہیں۔ عبادات اور آپ کے جسم کا آپ پر جو حق ہے وہ بھی خوب صورت طریقے سے ادا ہوتا رہے۔ فقیر کے معمولات زندگی میں آپ کو یہی ترتیب نظر آئے گی۔ وہ اپنی زندگی میں ان میں سے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ تمام فرائض جن کے لیے اُسے اللہ کو جواب دینا ہے، وہ اُنھیں پورا کرتا ہے لہٰذا آپ فقیر کے پاس جا کر اُس سے ذکر اذکار نہ مانگیے کہ مجھے کچھ پڑھنے کے لیے دیجیے۔ آپ صرف اُس کے معمولات کو گہرائی کے ساتھ دیکھیے اور اُس کے Attitudes (رویوں) پر نظر رکھیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ پھر خاموشی سے اُس کو Copy (نقل) کرنا شروع کر دیجیے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرض عبادات جاری رکھیے، قرآن پاک کی تلاوت پر زور دیجیے......جس قدر قرآن پاک کی تلاوت پر زور دیں گے اُسی قدر اللہ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں گی۔

آپ ذکر اذکار اور وظائف کے چکر میں نہ پڑیے بلکہ فرض عبادات اور اُس کے بعد تلاوتِ کلام پر زور دیجیے تو وہ فقیر از خود آپ کو پڑھنے کو بتائے گا اور یاد رکھیے کہ وہ وظائف بہت مختصر اور آسان ہوتے ہیں، مشکل نہیں ہوتے......فقیر آپ کو سکھائے گا کہ اُن کا ذکر کیسے کرنا ہے۔

جب آپ کے رویے تبدیل ہو جائیں گے......آپ سنت رب اور سنت رسول ﷺ کی حتی الامکان پیروی کی کوشش کر رہے ہوں گے تو یقین کر لیجیے کہ یقینی طور پر ولایت آپ کو مل جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ آپ خلق خدا کے لیے مہربان ہو جایئے۔ خلقِ خدا پر مہربان ہونے سے مراد یہ ہے کہ سارے گلے شکووں سے زبان بند کر لیجیے۔ دوسروں کو معاف کر دیجیے۔ دوسروں کی ضرورت کا خیال رکھیے......!

ایک بزرگ اپنے ایک دوست سے ملے تو دیکھا کہ وہ بہت بُرے حال میں ہے۔ دوست کہنے لگا کہ میری مالی حالت بہت خراب ہے اور میں مدد کے لیے تمھاری طرف ہی جا رہا تھا۔ اُن بزرگ نے اپنے دوست

کی یہ بات سنی تو رونے لگے کہ کیسا دوست ہوں کہ تمھاری مشکل کو جان نہ پایا اور تمھاری حالت پر نظر نہ رکھی حتیٰ کہ تمھیں مجھے مدد کے لیے کہنا پڑا...... جب کہ یہ میرا فرض تھا کہ تمھارے حالات پر نظر رکھتا اور جہاں محسوس کرتا کہ تمھیں مدد کی ضرورت ہے تو خود بخود تمھیں مدد پیش کر دیتا۔

آپ اپنی زندگی کو اِس معیار پر لے آیئے کہ اپنے عزیز، رشتہ داروں، بہن بھائیوں، اعزہ و اقارب اور دوستوں پر نظر رکھیے کہ جس جس رنگ میں جہاں جہاں آپ کسی کی کوئی بھی خدمت کر سکتے ہیں، بغیر کسی کے کہے خود بخود انتہائی خاموشی سے اُس کی خدمت کر دیجیے، اِتنی خاموشی سے کہ آپ کی ذات کے علاوہ کبھی کسی کو اُس کی خبر نہ ہونے پائے۔ پھر آپ تماشا دیکھیے کہ رب تعالیٰ کیسے آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے...... ذکر اذکار کے بجائے اپنی تربیت کے اس پہلو پر توجہ دیجیے۔

ایک اور گزارش کرنا چاہوں گا۔ اِسے سیلف ڈسپلن کے طور پر نہ لیجیے گا بلکہ آپ اِسے اللہ کو راضی کرنے کا ایک ذریعہ سمجھیے گا۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہم بس کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں، جونہی بس آتی ہے دھکم پیل کر کے ہم پہلے سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کی بجائے آپ دوسروں سے کہیے کہ آپ جایئے میں دوسری بس پر آجاؤں گا یا بعد میں سوار ہو جاؤں گا۔ آپ کسی جگہ اپنا کام کروانے جاتے ہیں تو دوسروں کو پہلے اپنا کام کروانے کا موقع دے دیجیے اپنا کام بعد میں کروا لیجیے۔ اِسی طرح یہاں لوگ دُعا کے لیے آتے ہیں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے دُکھ درد کی داستان A to Z بیان کر دیں...... دوسروں کا خیال رکھیے۔ دوسروں کی سہولت کا خیال رکھیے۔ اللہ آپ کی سہولتوں کا خیال رکھے گا۔ اپنا حق دوسروں کی Favour میں چھوڑ دیجیے پھر دیکھیے کہ اللہ کس طرح آپ کو نوازتا ہے۔ آپ کہیں انتظار کر رہے ہیں تو وہ سایہ دوسرے کو آفر کر دیجیے کہ صاحب آپ یہاں آجایئے میں دھوپ میں کھڑا ہوتا ہوں کیونکہ سردی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ دوسروں کو سایہ عطا کر دیں اللہ آپ کے لیے بادل لے آئے گا۔ یہ میرا ایمان ہے......! اِن رویوں کو اپنا لیجیے...... علم لدنی بھی ملے گا اور اللہ کی قربت بھی عطا ہوگی جو کہ محض ذکر اذکار سے ممکن نہیں۔

راہِ تصوف کے مصائب

ہم میں سے اکثر حضرات تصوف کی راہ پر جانا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت دس ہزار میں سے شاید ایک آدمی ایسا ہوگا جو تصوف کی راہ پر اِس لیے جانا چاہتا ہے کہ اِس سے رب ملتا ہے...... ورنہ ہم سب کے لاشعور کو کتابوں میں بیان کردہ اولیائے کرام کی کشف و کرامات اور مافوق الفطرت قوتوں کا اسرار لبھاتا ہے اور ہم لاشعوری طور پر اِن کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اِن کی تہ میں جو چیزیں چھپی ہیں اور کشف و کرامات کے اِس مقام تک پہنچنے کے لیے اُن اولیاء اللہ سے جو چیزیں چھن گئیں، وہ نہ تو کبھی کسی کتاب میں بیان کی گئی ہیں اور نہ خود ہم اُس تک پہنچتے ہیں۔ اِسی لیے تصوف کی راہ پر چلنے والے لوگوں کی اکثریت کچھ عرصے بعد بھاگ جاتی ہے...... جو لوگ رہ جاتے ہیں وہ اتنی Fractional percentage میں ہیں کہ کسی گنتی میں نہیں آسکتے۔ اگر ایک لاکھ آدمی اس راہ پر چلتے تو بمشکل ایک آدمی ولایت کے درجے تک ثابت قدمی سے چلتا ہے ورنہ لوگ کسی نہ کسی سٹیج پر اِس راہ کو چھوڑ جاتے ہیں۔

جب آپ اولیائے کرام کے بارے میں کوئی کتاب منتخب کرتے ہیں تو کوشش کریں کہ وہ کتاب پڑھیں جو فقیروں نے خود لکھی ہیں...... مریدین کی لکھی ہوئی کتابیں مت پڑھیے۔ کیونکہ وہ فقیر جب خود کتاب لکھتا ہے تو اُس میں علمی نقطۂ نظر کو اُجاگر کرتا ہے جیسے عظیم المرتبت فقیر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اب ایک یا دو کتابیں میسر ہیں...... باقی وقت کے ساتھ ساتھ نایاب ہوگئیں۔ ایسی کتابوں میں آپ کو کشف و کرامات اور مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر دُور دُور تک نہیں ملے گا۔ اُن میں زیادہ تر توحید کا ذکر ملے گا اور رب تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے جو ریاضتیں اور چلّے آپ کو کاٹنا ہوتے ہیں، اُن کی ترغیب ملے گی۔

دقتوں سے نہ گھبرائیے، اِس راہ پر ثابت قدمی سے گامزن رہیے، آپ کو رب مل جائے گا۔ پھر رب کو حاصل کرنے کی ترغیب ہے کہ دُنیا کو ایک طرف کر کے رب کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اِس کے برعکس مریدین کی لکھی ہوئی کتابوں میں علمیت کی ایک جھلک تک کہیں دکھائی نہیں دیتی...... ذکر تو بڑی دُور کی بات ہے...... ! وہاں صرف بزرگوں اور فقیروں سے منسوب کشف و کرامات اور قوتوں کا ذکر ہے۔ اِس لیے آپ صرف فقیر کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھیے تاکہ آپ کا ذہن تصوف کے بارے میں بالکل clear رہے کہ تصوف کشف و کرامات اور مافوق الفطرت قوتوں کو حاصل کر لینے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ پروردگار یہ

سب عطا کر دے...... لیکن دراصل اِن چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

دیانت داری سے ذکر کروں تو ایک زمانے میں کشف و کرامات مجھے بھی بہت Fascinate کرتی تھیں لیکن جب کشف حاصل ہو گیا تو شروع میں تو اِس کو بہت انجوائے کیا...... یہ ایک Pastime یا Hobby بن گئی تھی اور میں گھنٹوں کشف میں جا کر مختلف چیزیں دیکھتا رہتا۔ مگر جوں جوں اللہ کچھ سمجھ عطا فرماتا گیا تو پتا چلا کہ یہ بہت بے معنی چیز ہے۔ میں اِس کے عطا ہونے پر اللہ کا احسان مند ضرور ہوں، اُس کا شکر گزار ہوں لیکن اِس کی اہمیت اب دل میں نہیں رہی۔ اب مجھے یہ مداری پن سے زیادہ دکھائی نہیں دیتا۔ اِسی طرح جب پروردگار نے مجھے مستجاب الدعوات کیا تو ابتدا میں میں دُعا کر کے بہت انجوائے کرتا تھا...... بڑی خوش دلی اور شوق سے دُعا کرتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاحبِ امر کر دیا تو بڑے ذوق و شوق سے زبان سے بات نکال دیتا تھا...... جب وہ بات پوری ہو جاتی تھی تو بڑا مزا آتا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ پتا چلا کہ یہ سب بے کار چیزیں ہیں جن پر میں اِتنا خوش ہوتا ہوں۔ رب تعالیٰ نے مجھ پر یہ رحمت فرمائی کہ وہ میری دُعائیں سن لیتا ہے۔ اُس نے اپنی رحمت سے مجھے صاحب امر کر دیا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ کون ہے جس کی دُعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا۔ رب تو خورشید کی دُعا بھی قبول کرتا ہے جمیل کی بھی، نکسن کی بھی، بش کی بھی اور یحییٰ خان کی دُعا بھی قبول کرتا ہے...... کتے اور بلیوں کی کرتا ہے۔ پھر مجھ میں اور کتے بلیوں میں کیا فرق ہے؟ اگر کشف پر میں بہت خوش ہوں تو کیا پرندوں اور جانوروں کو آنے والی آفات کا وقت سے پہلے ادراک نہیں ہو جاتا؟ پھر مجھ میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟ میں اِس پر خوش کیوں ہوتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کہاں تو میں دُعا کرنے کو بہت انجوائے کرتا تھا...... بہت ذوق و شوق سے دُعا کرتا تھا۔ اب میں دُعا سے ویسے ہی بھاگتا ہوں۔ میری رُوح فنا ہو جاتی ہے اگر کوئی دُعا کا کہہ دے کیونکہ یہ منزل نہیں ہے کہ انسان مستجاب الدعوات اور صاحب کشف و کرامات ہو جائے۔

منزل تو یہ ہے کہ رب میرا ہو جائے لہٰذا اب مستجاب الدعوات، صاحب امر اور کشف و کرامات ہونے کی ساری باتیں ایک طرف ہو گئیں اور بس ایک خواہش رہ گئی کہ رب میرا ہو جائے لیکن درحقیقت یہ خواہش بھی ادھوری ہے......!

اللہ وہ وقت لے آئے کہ میں اپنے حصے کی ذمہ داری کی بھی دُعا مانگ سکوں۔ ابھی تو میں ادھوری خواہش اور دُعا کیے بیٹھا ہوں۔

یہ خواہش اُس وقت مکمل ہو گی اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں رب کا ہو جاؤں اور رب میرا ہو جائے۔ اگر ہم صرف اُسے منزل مان کر چلیں کہ رب ہمارا ہو جائے تو پھر یہ دیکھ لیجیے کہ رب تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مجھ پر ایمان لائے تو ہم اُنھیں ضرور آزماتے ہیں کہ وہ اپنی بات میں کتنے سچے ہیں۔ (قرآن کے الفاظ مختلف ہیں، میں اپنے الفاظ میں مفہوم بیان کر رہا ہوں۔) لہٰذا آپ کو آزمائش کی چکی میں ڈالا جائے گا۔ تصوف کی راہ میں اکیلی آزمائش کی چکی ہی آدمی برداشت نہیں کرتا بلکہ ٹریننگ کی چکی میں

ڈال کر اُسے سرمہ بنا کر باہر نکالا جاتا ہے۔ سرمہ بھی پتھر ہے اُسے گرائنڈ کریں تو پاؤڈر سے زیادہ باریک ہو جاتا ہے۔ جو ٹیلکم پاؤڈر ہم استعمال کرتے ہیں یہ 350 mesh پر گرائنڈ ہوتا ہے اور دیکھیے کہ کتنا ملائم ہوتا ہے جب کہ سرمہ 550 mesh پر گرائنڈ ہوتا ہے۔

تصوف کی چکی میں ڈال کر جب انسان کو پیسا جاتا ہے اور جب وہ حالات کی چکی کے پاٹوں سے باہر آتا ہے تو سرمے کی طرح پسا ہوتا ہے۔ بے پناہ ملائم اور باوجود پتھر ہونے کے ریشم کی طرح پھسل جانے والا...... ہاتھ میں آتا ہی نہیں۔ آپ آنکھ میں ڈال لیجیے تو محسوس تک نہیں ہوتا کہ آپ نے پتھر ڈالا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو بھی ایسا ہی ملائم کر دیتا ہے لیکن جو پسے جانے کی تکلیف ہے اُس کا اندازہ یوں کر لیجیے کہ کوئی اِتنے بڑے پتھر کو 550 mesh پر گرائنڈ کرے گا تو حشر کیا ہوگا......! دُنیا کا کوئی ایسا دُکھ نہیں جو آپ کو نہ دیا جائے۔ ایسا نہیں کہ (معاذ اللہ) اللہ آپ کو دُکھ دے کر خوش ہوتا ہے بلکہ یہ ایک طرح کی ٹریننگ ہے جس میں سے آپ بخیر وخوبی گزر جائیں تو اللہ آپ کو اس کا انعام دیتا ہے۔ اگر میں اپنے تجربے سے کہوں تو اس ٹریننگ کا سب سے سخت حصہ مالی مشکلات اور بدترین قسم کے مالی معاملات ہیں۔ جن دنوں میری ٹریننگ ہو رہی تھی یہ Late '70s اور Early '80s کی بات ہے۔ اِس دوران تین مہینے ایسے بھی گزرے جب لگاتار......بغیر کسی بریک کے......نوے (90) دن تک میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میری فیملی بھی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائی سب کی ذمہ داریاں مجھ پر تھیں لیکن اس کے باوجود پیسہ نہ ہونے سے جو معاملات پیش آئے اُنھوں نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ میں بڑی سہولت سے اُس میں سے گزرتا چلا گیا حتیٰ کہ مجھے دست غیب حاصل ہو گیا اور ہر روز فجر کی نماز کے بعد مین گیٹ کے نیچے مجھے پانچ روپے کا نوٹ اور چار آنے کا سکہ ملنے لگا۔ اُن پیسوں سے گزارہ ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹریننگ مکمل ہو گئی۔ رب نے رزق کھول دیا۔ دوبارہ سے پھر اپنے مقام سے آگے نکل گیا۔ جتنا پہلے تھا، اُس سے کہیں زیادہ آگے چلا گیا۔

یہ بات Man to man vary کر جائے گی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ گھر کے اندر ناچاقی ہو جاتی ہے...... اکثر اوقات میاں بیوی میں طلاق ہو جاتی ہے۔ بہن بھائی چھوٹ جاتے ہیں۔ کوئی منہ ہی نہیں لگاتا...... قریب نہیں آتا۔ سب گالیاں دیتے ہیں۔ یہ سب ہوا لیکن مجھے یہ سب چیزیں ہلا نہیں سکیں۔ آرام سے اِن میں سے نکل گیا۔

انسان پر دُنیا بھر کی تہمتیں اور الزامات لگتے ہیں لیکن فقیر پر پابندی ہوتی ہے کہ اُن تہمتوں اور الزامات کے جواب میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا...... نہ جواب دینا ہے، نہ بولنا ہے۔ بس ایک خاموشی رکھنی ہے۔ ایسے میں انسان کے اندر کیا بیتتی ہے۔ اُس کا دل کیسے دکھتا ہے۔ یہ وہی جان سکتا ہے جو اس سے گزر رہا ہو......!

مجھے اگر کسی چیز نے پریشان کیا اور اندر سے ہلایا...... اگرچہ بولا نہیں لیکن جس سے سخت تکلیف پہنچی وہ یہی پہلو تھا۔ لیکن یہ بھی Man to man vary کر جائے گا کہ کون کس پہلو سے زیادہ ہل جاتا ہے۔ خاص طور پر یہ پہلو بہت اہم ہے کہ دُنیا بھر کی تہمتیں اور الزامات آپ کے حصے میں آتے ہیں لیکن آپ نے پلٹ کر

جواب نہیں دینا...... نہ صرف جواب نہیں دینا بلکہ کسی الزام لگانے والے کو بُرا بھی نہیں سمجھنا۔ وہ سامنے آجائے تو اُسے ایسی محبت سے ملنا ہے جیسے آپ اپنے سگے بھائی سے ملتے ہیں...... بغیر دل میں کوئی کینہ رکھے۔ یہ وہ Prerequisites / preconditions ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ انسان کا دل اندر سے پھٹ رہا ہوتا ہے مگر وہ اِن بنیادی شرائط پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔ اِس کا مقصد دُکھ دینا نہیں ہوتا بلکہ یہ درحقیقت ٹریننگ کا ایک حصہ ہے۔

جب آپ اِس کیفیت سے گزرتے ہیں، آپ کا دل پھٹتا ہے لیکن کسی کو کچھ کہہ نہیں پاتے۔ اِس کے نتیجے میں دل میں گداز پیدا ہو جاتا ہے اور جس دل میں جتنا زیادہ گداز ہوگا اُتنا ہی زیادہ علم لدنی اُس میں اُترتا اور پنپتا ہے۔ جس طرح کھیت میں جتنا گہرا ہل چلایا جائے گا، زمین زیادہ گہرائی تک پھاڑی جائے گی، ہل کے ذریعے...... اُس میں ڈالا جانے والا بیج اُتنی ہی اچھی فصل دے گا۔ فصل کی Growth اتنی ہی اچھی ہوگی......! علم لدنی بھی فصل کی مانند ہے کہ جتنا زیادہ دل گداز ہوگا، اُتنا ہی علم پھلے پھولے گا۔ بندہ جس قدر تکلیف سے گزرتا ہے اُسی قدر اُس کا دل نرم ہو جاتا ہے۔ اِس نرمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کا ہلکا سا دُکھ سن کر ہی انسان زار وقطار رونے لگتا ہے۔ کسی کی ہلکی سی تکلیف دیکھ کر اپنا آپ لٹانے لگتا ہے۔ اِس کے برعکس اپنی ذات کے لیے اگر کوئی اُسے جلتی ہوئی آگ میں بھی ڈال دے تو وہ اُسے اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ یہ بات نہیں کہ اُسے تکلیف نہیں ہوتی...... تکلیف تو ہوتی ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اگر میں آگ پکڑوں گا تو ہاتھ جلے گا اور اُس سے مجھے تکلیف ہوگی۔ لیکن تصوف کی راہ پر ثابت قدم رہنے والے فقیروں کی قوت برداشت عام آدمی سے چھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ علم لدنی مل جانے کے بعد (ایک روایت کے مطابق) انسان کی تمام حسیات (Senses) اور قوت برداشت چھ گنا بڑھ جاتی ہے۔ انسان اپنے دُکھوں کے معاملے میں بہت بے پروا ہو جاتا ہے، بہت ہنس کھیل کر دُکھ برداشت کر جاتا ہے۔ ہر پیش آنے والی زیادتی اور دُکھ پر ایک قہقہہ لگا کر سب برابر کر دیا۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ بڑا ڈھیٹ اور بے حس انسان ہے...... اِس پر اثر ہی نہیں ہوتا حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ انسان اندر سے جانتا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے...... لیکن اس کے باوجود دوسروں کی ہلکی سی تکلیف سن کر وہ رونے لگتا ہے۔ یہی گداز اور نرم دلی اللہ تعالیٰ بندے میں چاہتا ہے کہ بندہ دوسروں کے لیے زندہ رہنے لگے...... یہی اصل زندگی ہے۔ جب بندہ اِس مقام پر آجاتا ہے تو پھر رب تعالیٰ اُسے یہ علم عطا فرمانے لگتا ہے۔

جہاں تک مالی تنگی کا تعلق ہے تو فقیر جس قسم کی مالی تنگی ٹریننگ کے دوران دیکھ چکا ہوتا ہے، عام زندگی میں وہ تنگی دوبارہ نہیں آسکتی۔ اِس سے انسان میں دو چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں: ایک تو مالی نقصان اُس کی نظر میں کوئی نقصان ہی نہیں رہ جاتا۔ دوسرا اِس سے مالی نقصان سے بے پروائی کا عنصر آنے لگتا ہے۔ تب انسان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیان کی گئی مومن کی تعریف پر پورا اُترتا ہے کہ جسے نہ چیز کے جانے کا غم ہوتا ہے نہ حاصل ہونے کی خوشی...... کوئی آدمی، خواہ اُس کا کتنا بڑا مالی نقصان کر جائے، وہ اُس کا دشمن نہیں بنے گا۔

ہمارے ہاں مخالفت کی تین چار وجوہات یہ ہیں کہ کسی سے ہمیں مالی نقصان پہنچ جائے...... کوئی جانی نقصان پہنچے...... کسی نے ہم پر تہمت لگا دی ہو...... غیبت کر دی ہو...... ہم پر الزام لگا کر ہماری بے عزتی کر دی ہو۔ اللہ تعالیٰ اِس ٹریننگ کے ذریعے اِن تمام پہلوؤں سے ہمیں بے نیاز کر دیتا ہے حتیٰ کہ ہمارے لیے نہ تو مالی منفعت میں کوئی کشش رہتی ہے نہ مالی نقصان کچھ معنی رکھتا ہے۔ کسی کے ساتھ مالی معاملات کی وجہ سے نہ ہماری مخالفت ہوتی ہے نہ دوستی...... یوں ہم لالچ سے بھی دُور ہو جاتے ہیں۔

بیوی بچوں کی محبت انسان سے نہ صرف غلط کام کراتی ہے بلکہ رب تعالیٰ سے بھی دُور لے جاتی ہے۔ جب انسان ٹریننگ کے دوران گھریلو ناچاقی کے دور سے گزر چکا ہوتا ہے اور دیکھ چکا ہوتا ہے کہ اُس کی اصل حقیقت کیا ہے تو پھر وہ یہ سوچ کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے کہ یہ میرے بیوی بچے ہیں، اِن کی کفالت رب نے میرے ذمہ لگائی ہے، ان کے مجھ پر حقوق ہیں...... مجھے اِنھیں وقت بھی دینا ہے، اپنے بچوں کی تربیت بھی کرنی ہے، بیوی کی دل جوئی بھی کرنی ہے...... وہ یہ سب کام فرض سمجھ کر کرتا ہے۔ پھر لگن نہیں ہوتی اور جب لگن نہیں ہوتی تو پھر وہ چیزیں اللہ کی راہ سے Distarct نہیں کر پاتیں۔

ہماری ہاں تیسری جو مشکل ہے وہ عزت اور بے عزتی کا مسئلہ ہے...... طرح طرح کی تہمتیں اور الزامات لگوا کر رب تعالیٰ بندے کو ایسا کر دیتا ہے کہ پھر کوئی کچھ کہتا رہے، آدمی ہنستا رہتا ہے۔ نہ اُس سے دشمنی پیدا ہوتی ہے...... نہ وہ اُس کے خلاف ہوتا ہے...... نہ اُس کو بُرا سمجھتا ہے۔ انسان اُس مقام پر آ جاتا ہے کہ اپنے اُوپر تہمت لگانے والے کی بھی تعریف کرتا ہے...... کہ بھائی، وہ تو بہت اچھا انسان ہے، وہ کیوں جھوٹ بولے گا میرے خلاف۔

پھر اس راہ میں قربانی ہی قربانی ہے۔ یہاں آپ صرف دیتے ہیں، لیتے نہیں۔ انسان کا ہاتھ ہمیشہ اُوپر رہتا ہے...... نیچے نہیں جائے گا۔ یہ بظاہر گھاٹے کا سودا معلوم ہوتا ہے کہ آپ دن رات محنت کر کے کمایئے اور پھر خاموشی سے دوسروں پر خرچ کر دیجیے...... اِتنی خاموشی سے کہ اگلے کو منع کرتے ہیں کہ بھائی کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تمھاری کوئی خدمت کی تھی۔ بیوی جوتے مار رہی ہوتی ہے کہ تمھاری جیب میں ایک لاکھ روپیہ تھا، کدھر ہے......؟ اُس کا سیدھا سا جواب ہے کہ تمھیں غلطی لگی مجھ غریب کے پاس ایک لاکھ روپے کا کیا کام، تمھیں غلطی لگی ہے۔ یوں وہ آدمی بیوی سے بھی جھوٹ بولتا ہے تاکہ کسی کو بھی پتا نہ چلے کہ میں نے کس کی خدمت کی ہے۔

تصوف کوئی مزے کی راہ نہیں ہے۔ اِس میں انسان کے پاؤں آزمائش کے کانٹوں سے ہر لحہ زخمی ہوتے ہیں لیکن پھر جو انعام ملتا ہے، وہ اِتنا بڑا ہے کہ دُنیا کی کوئی سلطنت اُس کو دے دیجیے وہ رب کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگا۔

میں یہ بات آپ کو ڈرانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف اِس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے دُعا کی اجازت ہوئے دسمبر 2000 میں ساڑھے چودہ سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران کئی درجن لوگ بڑے جوش اور ولولے

سے یہاں تشریف لائے کہ ہمیں تصوف کی راہ چاہیے...... اُنھیں بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے۔ وہ اس راہ پر چلے لیکن جب ذرا سا جھٹکا مالی معاملات کا آیا تو اُنھوں نے باضابطہ آ کر کہہ دیا کہ ہمیں نہیں چاہیے یہ راہ۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ پہلے آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیے کہ رب کو حاصل کرنے اور اُس کا دوست ہونے کے لیے ہمیں ان دقتوں سے گزرنا ہوگا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ مرغی کو جو خوراک دی جاتی ہے، وہ سور کی چربی سے تیار کی جاتی ہے، تو کیا مرغی حرام ہے؟

جواب: دیکھیے صاحب! جو پولٹری فیڈ پہلے بھی بن رہی ہے اُس میں بھی بہت سی ایسی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں جن کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے جیسے اس میں کافی خون استعمال ہوتا ہے۔ اسلام میں خون پینے یا اس کو استعمال کرنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ اسی طرح ایسی مچھلی جو پانی میں مرگئی ہو، اُس کا استعمال ممنوع ہے۔ پولٹری فیڈ میں تو پہلے بھی ممنوع چیزوں کا استعمال ہو رہا ہے۔ اب فرق یہ پڑ گیا ہے کہ اس میں سور کی ہڈیاں اور گوشت استعمال ہونے لگا ہے۔ میں فتویٰ دینے کا تو مجاز نہیں البتہ صرف اس کے ملکینکس آپ کے سامنے عرض کروں گا۔

ہمارے مرشد جناب سید یعقوب علی شاہ صاحب برائلر مرغ نہیں کھاتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے کبھی منع نہیں کیا کیونکہ میں اُس زمانے میں یہ بہت کھاتا تھا لیکن وہ کبھی نہیں کھاتے تھے۔ یہ اور بات کہ آہستہ آہستہ میں خود بھی بھاگ گیا۔ اب میں پولٹری کا مرغ بالکل نہیں کھاتا۔ اگر کبھی کھاؤں تو پھر دیسی مرغ کھاتا ہوں۔

گہرائی سے تحقیق کرلیں۔ گھر میں جو مرغی آپ پالتے ہیں، وہ بھی ایسی چیزیں کھاتی رہتی ہے جو حرام ہیں جیسے کن کھجورا، لال بیگ، بلغم، خون کے لوتھڑے وغیرہ...... لیکن یہ دیسی مرغی حلال ہے اور ہم کھاتے ہیں۔ گٹر نالی کے اندر سے مختلف چیزیں کھاتی رہتی ہے...... وہ بھی حلال ہے۔ اگر گھر کے باہر کوئی کوا مرا پڑا ہے یا کوئی اور جانور مردہ پڑا ہے تو پالتو مرغی بڑی بے تکلفی سے اُسے کھا آئے گی...... اگر پاکستان میں سور پلتے ہوں اور وہ مرا پڑا ہو تو یہ مرغی وہ بھی کھالے گی لیکن یہ مرغی حلال ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قبلہ مرشد صاحب برائلر مرغی نہیں کھاتے تھے۔ اِس میں وجہ شاید Feed نہیں تھی بلکہ غالباً یہ تھی کہ اس کی پیدائش نیچرل اور Organic نہیں ہے۔ اِسی وجہ سے میں بھی عموماً اب یہ نہیں کھاتا۔

آپ کسی مفتی سے معلوم کر لیجیے کہ برائلر مرغی، جسے یہ مخصوص فیڈ دی جاتی ہے، وہ حلال ہے یا حرام......؟ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اِس کے حق میں فیصلہ دیں گے کہ فیڈ نہ دیکھیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اِس کو ذبح کس طرح کیا گیا ہے...... کیونکہ کہیں یہ حکم نہیں کہ جانور ذبح کرنے سے پہلے تحقیق کر لیجیے کہ اُس نے حرام کھایا تھا یا حلال!

سوال: تصوف کی ٹریننگ کا دورانیہ کتنا ہے؟ جو لوگ کسی بھی سٹیج پر step back کر جاتے ہیں کیا اُنھیں اس کا نقصان ہوتا ہے؟

جواب: تصوف ایسی راہ ہے جس کی منزل سوائے ایک ہستی کے اور کسی کو نہیں ملی۔ اس راہ پر چلنے والے بھی

لوگ راہرو اور مسافر ہیں، منزل پر کوئی نہیں پہنچا۔ صرف آپ ﷺ کو منزل عطا ہوئی۔

اِس راہ پر جو لوگ چلے، اُن میں فرق یہ ہے کہ کون اپنی منزل سے کتنی دُور رہ گیا......! جس نے جتنا زیادہ سفر طے کیا وہ اُتنا ہی بڑا ولی اللہ ہے لیکن منزل کسی کے پاس نہیں۔

یہ ٹریننگ تو ساری عمر جاری رہتی ہے جیسے میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ Late '70s اور Early '80s میں میری ٹریننگ ہوئی تھی۔ ٹریننگ کا دوسرا Spell سن 1997ء سے سن 2000ء تک تھا۔ اگرچہ دوسرے Spell کی شدت پہلے دورانیے سے کم تھی لیکن پھر بھی یہ بہت شدید تھی۔ جب میری آخری ترقی تصوف کی راہ میں ہوئی۔ اُس سے پہلے ڈھائی سال کے عرصے میں جو کچھ میں برداشت کر گیا، وہ بے پناہ ہے۔

اِس راہ میں ٹریننگ چلتی رہتی ہے، ریفریشر کورسز ہوتے رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلی ٹریننگ اگر چھ سال کی ہوئی تو اُس کے بعد جتنے کورسز ہوتے ہیں اُن کا دورانیہ دو اڑھائی سال ہوتا ہے۔ اس طرح ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہ ٹریننگ مرتے دم تک چلتی ہے۔

جو لوگ تصوف کی راہ سے Step back ہو گئے، اسے ادھورا چھوڑ دیا اور اس راہ سے ہٹ گئے تو یہ بالکل ایسے ہے کہ ایک آدمی اس نیت سے تعلیم حاصل کرتا ہے کہ میں PhD کروں گا لیکن وہ میٹرک سے ہی بھاگ جاتا ہے اور تعلیم مکمل نہیں کرتا۔ کل کو پریکٹیکل لائف میں جائے گا تو نوکری میں اُسے دقتیں پیش آئیں گی۔ اس راہ میں بھی انسان جو Gain کر لیتا ہے، وہ ضائع نہیں جاتا۔ جس طرح میٹرک میں دوڑنے والا لڑکا کچھ نہ کچھ پڑھ تو لیتا ہے...... جو کچھ وہ سیکھ جاتا ہے، وہ اُس کے کام آتا رہے گا۔

رُموزِ فقیر

سوال: آپ نے اپنے ایک لیکچر میں فرمایا تھا کہ حضرت بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا حکم آج بھی جاری ہے۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ نیز وسیلہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: دراصل ہم "وسیلہ" کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ جس بات کو ہم وسیلہ سمجھتے ہیں وہ اکثر شرک میں چلی جاتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے مرشد یا پیر صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ ہمارا فلاں کام کر دیجیے یا صاحب مزار سے جا کر کہا کہ آپ ہمیں بیٹا عطا کر دیں، نوکری دے دیں۔ اِسے ہم وسیلہ سمجھتے ہیں لیکن اصل میں یہ شرک ہے۔ صرف اور صرف اللہ سے مانگنا اور سوال کرنا جائز ہے۔ یہ جو میں نے کہا تھا کہ بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا حکم آج بھی جاری ہے، اِس سے مراد یہ نہیں کہ ہم اُن کے مزار پر جا کر عرض کریں کہ آپ ہمارا فلاں سوال پورا کر دیں یا ہمیں فلاں چیز عطا کر دیں۔ یاد رکھیے! جب بھی اللہ کے سوا کسی اور سے سوال کیا جائے گا تو یہ شرک ہو جائے گا۔ "حکم جاری ہونے" کے الفاظ رُوحانیت کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیے گئے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک ولی اللہ جو صاحبِ ڈیوٹی بھی ہیں، بعض اوقات دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ صاحب ڈیوٹی ہی رہتے ہیں۔ ویسے تو اولیائے کرام کی تعداد بے شمار ہے...... جیسے ایک وقت میں چالیس ہزار اخیار ہوتے ہیں جن میں سے بہت سے اخیار کو اپنے مقام کا علم ہی نہیں ہوتا...... ضروری نہیں کہ سب اخیار صاحبِ ڈیوٹی ہوں۔ اُن میں سے کچھ منتخب (Selected) لوگ صاحبِ ڈیوٹی ہوتے ہیں اور ترقی پاتے پاتے وہ غوث کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب وہ اِس دُنیا سے چلے جاتے ہیں تو صاحب ڈیوٹی نہیں رہتے بلکہ اُن کی جگہ ایک زندہ ولی اللہ آ جاتا ہے۔ جیسے ایک ملک کا صدر اپنی قوم میں ہر دلعزیز اور بے حد پسندیدہ ہونے کے باوجود وفات پا جانے کے بعد کرسی پر موجود نہیں رہے گا اور اُس کرسی صدارت پر کوئی دوسرا شخص آ کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جیسے قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ جن کا احترام دُنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد بھی ہمارے دلوں میں موجود رہتا ہے۔ اب اگر ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ میں بانی پاکستان کا بیٹا ہوں اور میرا فلاں کام کر دیجیے تو لوگ اُس کا کام بہت محبت سے کر دیں گے کیونکہ دل میں قائداعظم کی محبت موجود ہے...... یوں آج بھی قائداعظم کے نام کا سکہ چلتا ہے...... اُن کا حکم جاری ہے۔ تو کچھ اولیائے کرام

جب دُنیا سے چلے جاتے ہیں تب بھی وہ صاحب ڈیوٹی رہتے ہیں اور اُن کا حکم اُسی طرح قائم رہتا ہے جیسے اُن کی زندگی میں تھا..... لیکن اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جا کر اپنی حاجت بیان کریں اور اُنھیں کہیں کہ ہمیں رزق عطا کر دیں...... یہ کھلا شرک ہے۔

ہم جب مزار پر جائیں تو دُعا کریں ''یا باری تعالیٰ! تو اپنے غفور و رحیم ہونے کے صدقے ہمارے گناہ معاف فرما دے۔ ہم پر رحم فرما اور اپنی رحمتیں نازل فرما۔ ہم مشکل میں ہیں، تو اپنے رحمٰن و رحیم ہونے کے صدقے، اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صدقے اور اپنے اِن نیک بندوں کے صدقے جو تجھے بہت عزیز ہیں ہم پر رحم اور کرم فرما دے۔''

یہ عاجزی کی اِنتہا ہے ہم گویا اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم خود کو اپنے بداعمال کی وجہ سے اِس قابل نہیں سمجھتے کہ تو ہم پر رحم کرے اور ہمارا یہ کام کر دے لیکن ہم تجھے تیرے محبوب بندوں کا واسطہ دیتے ہیں۔ تو اپنے رحیم و کریم ہونے کی صفت کے صدقے اور اپنے محبوب بندوں کے صدقے ہم پر رحم فرما دے۔ یوں ہم رب سے اُس کے نیک اور پسندیدہ بندوں کے وسیلہ سے مانگ رہے ہوتے ہیں...... یہ عاجزی کی اِنتہا ہے اور یاد رکھیے کہ عاجزی اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے۔ بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جا کر آپ بھی اِنھی الفاظ میں دُعا کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ وضع دار اور سب سے زیادہ حیا والا ہے۔ وہ تو اپنی رواداری میں یہاں تک چلا جاتا ہے کہ اگر کوئی اُسے یہ کہہ دے کہ یا اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تو میرا مالک ہے۔ میں اس رشتے کا واسطہ دے کر تجھ سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ تو رب تعالیٰ اپنے اُس گناہ گار بندے کا بھرم اِس لیے رکھ لیتا ہے کہ اِس نے مجھے اپنا بندہ ہونے کا واسطہ دیا ہے۔ ایسا واسطہ دے دیا جو میں نے اُسے سکھایا تھا۔ یہ رشتہ رب کا سکھایا ہوا ہے کہ ہم اُس کے بندے ہیں اور وہ ہمارا آقا و مالک ہے۔

کسی بھی غیر اللہ سے، خواہ وہ کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہو، سوال کرنا، کچھ مانگنا یا کوئی توقع رکھنا مسلمان کے لیے قطعاً جائز نہیں۔ یہ شرک کے زمرے میں آ جائے گا۔

''وسیلہ'' کو ہمیں اس کے اصل رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ وسیلہ اِس طرح سے ہے کہ ایک صاحب کے پاس علمِ لدنی، علمِ باطن یا رُوحانی علم ہے، اِس علم کو سیکھنے کے لیے ہمیں وسیلہ کی ضرورت ہوگی...... اگر ہم خود کتابوں سے پڑھ کر وہ علم سیکھنا چاہیں گے تو قوی امکان ہے کہ ہم بھٹک جائیں گے۔ جس طرح کٹی پتنگ بے سمت اور بے منزل ہوتی ہے اُسی طرح ہم بھی باوجود کوشش اور ریاضت کے کہیں پہنچ نہیں سکیں گے۔ یوں ہمیں ایک ایسا آدمی چاہیے جو ہماری تمام کوششوں کو ایک صحیح سمت میں لے جائے، ہماری روزمرہ کی مشقت، ریاضت اور مجاہدہ پر نظر رکھے۔ جو ہر قدم پر ہمیں بتا سکے کہ فلاں جگہ پر تم نے غلطی کی ہے۔ تمھیں یوں نہیں بلکہ یوں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں بتا سکے کہ ہماری رُوح کی کیفیت اور کیمسٹری کیا ہے۔ علم کی کتنی Dose وہ ہمیں کس وقت دے کہ وہ نہ تو ہمارے لیے بہت کم رہ جائے اور نہ اتنی

زیادہ کہ ہم اُسے Absorb (جذب) ہی نہ کر سکیں۔ یہ وہی شخص ہوتا ہے۔ جس کے پاس علم لدنی یا رُوحانی علم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اللہ کا عطا کردہ علم ہے اور اُس کی وساطت سے ہمیں ملتا ہے تو اس Sense میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ شخص اِس علم کی ہم تک ترسیل کے لیے "وسیلہ" ہے، وہ وسیلہ "مرشد" ہے۔ مرشد اس لیے وسیلہ نہیں ہوتا کہ ہماری حاجت روائی کر سکے۔ بلکہ اِس لیے ہوتا ہے کہ حصولِ علم میں ہماری کوششوں کو ایک درست سمت عطا کر سکے۔ کم کوشش کے ساتھ زیادہ علم حاصل کرنے کے لیے ہمیں وسیلہ کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے کوئی پیاسا صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ تھک کر گر جاتا ہے۔ چمکتی ریت کو پانی سمجھتے سمجھتے وہ اپنی ساری Energies (توانائیاں) ضائع کر بیٹھتا ہے اور اُسے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مرشد کے بغیر حصولِ علم کی کوشش سراب کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہے۔ جب تک اِس راہ میں مرشد وسیلہ نہیں بنے گا، توانائیوں اور محنتوں کے ضائع ہونے کا خدشہ برقرار رہے گا۔

وسیلہ کہتے کسے ہیں؟ وہ ذریعہ جس سے ہمیں کوئی چیز حاصل ہوتی ہے وسیلہ کہلاتا ہے۔ جیسے سکول میں ٹیچر ہمارے حصول علم کا وسیلہ ہیں۔ یاد رکھیے! حاجت روا صرف اور صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ باقی سب اُس کے بندے ہیں..... محتاج بندے حتیٰ کہ پیغمبر بھی اُسی کے محتاج ہیں۔ سب اُسی سے مانگتے ہیں اور وہی سب کو رزق عطا کرنے والا ہے۔ وہی سب کا حاجت روا ہے لٰہذا ہاتھ صرف اُسی کے سامنے پھیلائیے ہاں علم کے حصول کے لیے وسیلہ ضرور لے لیجیے کہ علم کے بغیر دانائی نہیں آتی اور دانائی کے بغیر رب تک نہیں پہنچا جا سکتا کیونکہ رب تعالیٰ عقل کا Gist ہے۔ Essence of wisdom ہے۔

سوال: کچھ لوگ Emails یا Text messages میں "سلام" لکھتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب: اسلام میں "سلام" کوئی لفظ نہیں۔ پورا لفظ "السلام علیکم" ہے۔ لفظ "سلام" غالباً یوں رواج پا گیا کہ یہودی ملاقات کے وقت جو Greeting word استعمال کرتے ہیں وہ "شلام" ہے۔ یورپی ممالک میں چونکہ ایک دوسرے کے ساتھ Interaction (میل جول) بہت Frequent ہوتا ہے، شاید یہ اُسی کا اثر ہے کہ اُن ممالک سے آنے والے Emails میں عموماً السلام علیکم کے بجائے "سلام" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ غیر اسلامی اور ناپسندیدہ ہے۔

بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت "السلام علیکم" کہیں اور لکھتے ہوئے وقت کی کمی کے باعث اگر اِس کو مختصر کرنا مقصود ہو تو اس انداز میں لکھ لیں A.o.A۔

سوال: سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 31 میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسما سکھانے کا ذکر ہے۔ وہ کون سے اسما ہیں؟

جواب: سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ وہ اسما تمام چیزوں کے تھے، نصف کے یا کچھ چیزوں کے تھے۔ گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مختلف چیزوں کے نام سکھائے۔ اِس آیت کی تفسیر یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وہ علم سکھایا جو فرشتوں کے پاس نہیں تھا تاکہ فرشتے جو اعتراض کرنے والے اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر نکتہ اُٹھانے والے تھے اُن کو بتایا جا سکے کہ

آدم علیہ السلام تم سے بہتر ہیں۔ چونکہ رب تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ ازل سے ابد تک کے معاملات سے واقف ہے...... وہ جانتا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر اور اُن کو سجدہ کرنے پر فرشتے ہچکچائیں گے اور کوئی نہ کوئی عرض داشت ضرور پیش کریں گے۔ اور وہی ہوا۔ فرشتوں نے کہا "اے اللہ تعالیٰ! یہ انسان تو زمین پر فساد پھیلائے گا۔" تب رب تعالیٰ نے ایک چھوٹے سے Test کے ذریعے فرشتوں پر آدم علیہ السلام کی برتری ثابت کر دی۔

حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتا دیا کہ آدم علیہ السلام تم سے کس طرح بہتر اور برتر ہیں اور جب کوئی کسی کی برتری تسلیم کرتا ہے تو پھر سجدہ کر دیا کرتا ہے۔ سجدہ ہمیشہ اپنے سے بڑے کو سزاوار ہوتا ہے۔ جب فرشتوں پر انسان کی برتری ثابت ہو گئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا "بے شک! جو تو جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے۔"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم الاسماء سے مراد چیزوں کے نام نہیں تھے کہ یہ میز ہے، یہ کرسی ہے...... بلکہ اِس سے مراد وہ علم ہے جو فرشتوں کے پاس نہیں تھا اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اِس لیے وہ علم عطا کیا تا کہ انسان کی فرشتوں پر برتری ثابت ہو جائے۔

سوال: نفس کیا ہے؟ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس راضی، نفس مطمئنہ سے کیا مراد ہے؟ کیا نفس لوامہ ہی کو نفس راضی بھی کہتے ہیں؟ مولانا طاہر القادری نے نفس کی تین کی بجائے چھ اقسام بیان کی ہیں۔

جواب: اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ "ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے......" یہ جوڑے کیا ہیں؟ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جیسے جھوٹ اور سچ، دن اور رات، سردی اور گرمی۔ اِسی طرح درختوں، جانوروں اور انسانوں میں نر اور مادہ ہیں۔ اِن دونوں کے ملاپ سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ چیزوں کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ اِسی طرح اللہ نے انسان کے اندر بھی دو چیزیں رکھی ہیں۔ ایک نیکی اور دوسری بدی۔

جب ہمارے اندر ایسی خواہشات پیدا ہوتی ہیں جو ہمیں بدی کے راستہ کی طرف لے جاتی ہیں...... ایسے کاموں کی طرف لے جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ سے دُور ہو جاتے ہیں...... تو اُس جذبہ کا نام "نفس امارہ" ہے۔

مثال کے طور پر نماز کا وقت ہے۔ ٹی وی پر میرا کوئی پسندیدہ پروگرام چل رہا ہے تو میں نماز مؤخر کر دیتا ہوں اور ٹی وی دیکھتا رہتا ہوں۔

اِسی طرح ایک صاحب میرے پاس آ کر اپنی حاجت بیان کرتے ہیں اور میں جیب میں پیسے ہونے کے باوجود اُن کو قرض نہیں دیتا...... اس خدشہ کے تحت کہ جانے یہ میری رقم مجھے واپس کریں گے بھی یا نہیں۔ یہ نفس ہے۔ ہر وہ چیز جو نیک کاموں سے اور اللہ سے دُور کر دے اور گناہوں پر اُکسائے، وہ نفس ہے۔

جب ہم اپنی منہ زور خواہشات کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ خواہشات ہمارے کنٹرول میں نہیں بلکہ ہم خواہشات کے کنٹرول میں ہوتے ہیں...... تو یہ نفسِ امارہ ہے۔

کم وبیش ہر انسان کا نفس ابتدائی طور پر نفسِ امارہ ہی ہوتا ہے لیکن جب ہم اللہ کے احکامات جان لینے کے بعد اِس خوف میں مبتلا ہوتے ہیں کہ رب تعالیٰ بے حد طاقت ور ہے...... بے حد رحیم وکریم ہونے کے ساتھ وہ قہار بھی ہے اور ہمارے غلط اعمال پر بروز قیامت باز پرس کرے گا اور ہمیں سزا دے گا تو یہ خوف طاری ہونے کے بعد ہم اللہ کے منع کردہ کاموں سے اجتناب کرنے لگتے ہیں اور اُس کے تلقین کردہ احکامات کی پیروی کرنے لگتے ہیں...... یوں ہمارا نفس نفس امارہ سے نفسِ لوامہ میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم نے اپنے نفس کو سدھا لیا ہوتا ہے۔ ہم نفس کے کنٹرول میں نہیں بلکہ نفس ہمارے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر گناہ آزردہ اور نیکی مسرور کرنے لگتی ہے۔ نفس لوامہ کو نفسِ راضی بھی کہا جاتا ہے اور اگر کسی کو اللہ نے یہ توفیق بخش دی کہ وہ شخص اللہ کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور اُس عشق کے ذریعے سے وہ اِس کوشش میں رہنے لگا کہ میں اپنے رب کو راضی کرلوں، اُس کو اپنا محبوب بنالوں تاکہ وہ مجھے اپنا محبوب بنالے کیونکہ عشق کے مکتب کا دستور نرالا ہے...... وہاں اگر میں یہ چاہوں کہ رب مجھے اپنا محبوب بنالے، مجھے اپنا دوست بنالے تو پہلے مجھے اُسے اپنا محبوب اور دوست بنانا ہوگا...... مجھے اللہ سے عشق کرنا ہوگا...... تب اِس کے جواب میں اللہ مجھ سے عشق کرے گا۔ تو یوں رب تعالیٰ کی محبت اور دوستی پانے کے لیے انسان اُس کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ رب کو خوش کرنے کی دُھن میں رہتا ہے اور رب کو خوش کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

وہ طریقہ یہ ہے کہ اُس کے محبوب ﷺ کی سنت کی پیروی کرلی جائے۔ اور جب کوئی شخص آپ ﷺ کی سنت کی مکمل پیروی کرلے گا تو اللہ کا محبوب ہو جائے گا۔ تب اُس انسان کی تمام خواہشات، ارادے اور ضروریات رب کے ارادوں اور مرضی کے تابع ہو جائیں گی۔ رب کی طرف سے جو کچھ بھی آئے گا، اُسے وہ خوش دلی سے قبول کرلے گا۔ یہ سوچ کر کہ یہ میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ پھر جسم میں کیڑے بھی پڑ جائیں تو زبان پر شکوہ نہیں آتا بلکہ بندہ اُن زخموں سے گرنے والے کیڑوں کو زمین سے اُٹھا کر دوبارہ زخموں پر رکھ دیتا ہے کہ یہ بھی رب ہی کے عطا کردہ ہیں۔ جب انسان اِس مقام پر آجاتا ہے تو یہ ''نفس مطمئنہ'' کہلاتا ہے۔ یہ نفس مطمئنہ پھر کربلا بپا کرا دیتا ہے۔ پھر میدانِ کربلا میں بھی انسان مسکرا رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے میدانِ جنگ کی طرف روانہ کرتا ہے اور پھر خیمہ کے باہر بیٹھ کر اُس کی شہادت کا نظارہ کرتا ہے...... جوان بیٹا شہید ہو جاتا ہے تو نفس مطمئنہ اپنے ہاتھوں سے میدان جنگ سے شہید جوان بیٹے کو اُٹھا کر لاتا ہے۔ یہ سب نفس مطمئنہ ہی کا خاصہ اور کمال ہے۔

جہاں تک نفس کی چھ اقسام کا تعلق ہے تو جس طرح اللہ تعالیٰ کے 99 ناموں میں سے ایک ذاتی اور 98 صفاتی نام ہیں...... لیکن اِن ناموں کی اگر Sub-classification کر دی جائے تو اسما 350 ہو جاتے ہیں...... اِسی طرح نفس کی تین ہی بڑی اقسام ہیں: نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ لیکن اِن کی مزید Classification کر کے اُن کی چھ کی بجائے نو اقسام بھی بنائی جاسکتی ہیں۔

مولانا طاہر القادری صاحب بہت اچھے عالم ہیں، اُنھوں نے نفس کی Sub-classification بالکل ٹھیک کی ہے۔

سوال: کیا نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ رکھنے والوں کے خواب بھی مختلف ہوتے ہیں؟

جواب: جو شخص خواہشات کے تابع رہا اور نفس کی مانتا رہا، اُس کے خواب عموماً ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ خوفناک چیزوں کو دیکھتا ہے۔ یہ گویا رب کی طرف سے وارننگ ہوتی ہے کہ نفس کی اتنی پیروی نہ کرو کہ دُنیا میں ڈوب جاؤ۔ اگر تم دُنیا میں ڈوبو گے تو پھر دُنیا کی ہر چیز تمھیں ڈرائے گی۔

جو لوگ اللہ کے ہو گئے، دُنیاوی چیزیں اُن کے تابع ہو گئیں۔ جس طرح آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں ولی اللہ شیر پر سواری کرتے تھے اور دیوار کو چلنے کا حکم دیتے تھے۔ جب کوئی شخص رب تعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو مٹا دیتا ہے تو پھر یہ سب چیزیں اُس کے ماتحت ہو جاتی ہیں۔ تب انسان کے دل سے ہر قسم کا ڈر اور خوف رُخصت ہو جاتا ہے صرف رب کا خوف اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت رہ جاتی ہے۔ نیک لوگ خواب میں جو کچھ دیکھتے ہیں اُس میں اُن کی رُوح سیر کر رہی ہوتی ہے۔ نیک لوگ جنھوں نے اللہ کے لیے خود کو مٹا دیا، عموماً اُنھیں اپنے خواب یاد ہی نہیں رہتے...... لیکن اگر وہ صبح کی نماز کے بعد بھی سو جاتے ہیں تو ایسے میں جو خواب دیکھتے ہیں، وہ عام طور پر ''اِطلاعی خواب'' ہوتا ہے۔

لیکن ہاتھوں کی لکیروں سے تقدیر معلوم کرنے اور خوابوں کی تعبیر جاننے کے بجائے آپ اُس مقام پر کیوں نہیں چلے جاتے جہاں رب بندے سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔

ایک بار میرا ایک دوست مجھے دست شناسی اور علم جفر کے ماہر کے پاس لے گیا اور میرا ہاتھ اُس کے سامنے کر دیا کہ ذرا اِن کا حساب کتاب لگائیے۔ وہ ماہر دست شناس میرا ہاتھ دیکھ کر کہنے لگے ہے ''یہ تو بادشاہ کا ہاتھ ہے۔ بے پناہ دولت ہے آپ کے پاس۔'' میں نے کہا ''حضور! مجھے تو یہ دولت کہیں نظر نہیں آتی، آپ نے کہاں دیکھ لی۔'' بتانے لگے کہ یہ لائن یوں دیکھیے اور یہ لکیر اس طرف کو دیکھئے۔ میں نے کہا ''میرا ہاتھ ذرا چھوڑیئے۔'' تب میں نے اپنا بایاں ہاتھ دو بار دائیں ہاتھ پر پھیرا اور کہا دیکھیے کیا لکیریں وہی ہیں یا تبدیل ہو گئیں؟ وہ دست شناس حیران ہو کر اپنے ساتھی سے بولے ''یہ دوسرا شخص ہے دُنیا میں جو ہاتھ مار کر لکیریں تبدیل کر لیتا ہے۔'' تب میں نے دوبارہ اپنے دائیں ہاتھ پر بایاں ہاتھ پھیرا اور کہا ''ذرا دیکھ کر بتائیے، دولت اُتنی ہی ہے یا کم و بیش ہو گئی؟'' پھر کہا ''آپ کیوں لوگوں کو بہکاتے ہیں، ان لکیروں پر بھروسا کرتے ہیں جنھیں میں اپنے بائیں ہاتھ سے بدل سکتا ہوں؟''

اِسی طرح مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہم خوابوں کی وجہ سے اتنا خوف زدہ اور بے چین کیوں رہتے ہیں! ایسے آدمی کو تلاش کیوں کرتے رہتے ہیں جو ہمیں خوابوں کی تعبیر بتا سکے۔ آپ اُس مقام پر چلے جانے کی خواہش کیوں نہیں کرتے کہ جہاں ایک اشارے سے اِن خوابوں کی تعبیر بدل دی جاتی ہے۔ وہ مقام اللہ اپنے بندوں کو عطا کر دیتا ہے لیکن بندگی شرط ہے۔ تو اُس مقام پر جائیے اُنگلی سے ستاروں کی چالیں تبدیل کر لیں اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی لکیریں بدل ڈالیں......!!!

یہی قصہ دُعا کے معاملہ میں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم دُعا کروانے کے لیے مارے مارے پھریں،

گھنٹوں صاحب دُعا کا انتظار کریں...... ہم خود صاحب دُعا کیوں نہیں بن جاتے......! وہ صاحب دُعا بھی تو ہماری طرح کا انسان تھا جو نفس امارہ سے نفس مطمئنہ تک جا پہنچا۔ ہم کیوں نہیں پہنچ پائیں گے؟ ضرور پہنچیں گے، اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں ہونے دیتا۔

ہم اپنے فیملی ڈاکٹر سے اپنے لیے اور اپنے تمام گھر والوں کے لیے دوا لیتے ہیں۔ اُس سے دوا لینے کی بجائے میں ڈاکٹری کا فن خود کیوں نہ سیکھ لوں تاکہ اپنا اور اپنی فیملی کا خود ہی علاج کرسکوں۔ تو بجائے صاحب دُعا سے اپنے لیے دُعا کروانے کے خود صاحبِ دُعا کیوں نہ بنا جائے تاکہ اپنے لیے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی دُعا کی جا سکے۔

سوال: بعض اوقات ہم لوگوں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں کرتے۔

جواب: ہوتا یہ ہے کہ ہم عموماً زبان سے مہربانی کر رہے ہوتے ہیں اور عمل سے نہیں کرتے۔ ہمارا دوست آتا ہے قرض لینے کے لیے تو ہم کہتے ہیں کہ اوہو! آپ دو منٹ لیٹ ہو گئے، پیسے تو جیب میں تھے، ابھی ابھی ایک صاحب ادھار لے گئے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ انسان زبان سے نہیں بلکہ دل سے مہربانی کرے۔ خواہ زبان میں تلخی ہی رہے تاکہ انسان دوسروں کی خدمت بھی کرے اور اُن کی گالیاں بھی سنے کیونکہ اُس وقت بہت تیزی سے درجات بلند ہوتے ہیں جب لوگ خدمت بھی لیتے ہیں اور جوتے بھی مارتے ہیں۔

سوال: کٹھن حالات اور تنگ دستی میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: ہمارا تو حال یہ ہے کہ جب تک رب تعالیٰ مجھے کھانے کے لیے وافر روٹی دیتا ہے تب تک تو مجھے یاد نہیں ہوتا کہ میرا رب ہے۔ میں فلموں کی باتیں کرتا ہوں۔ لیکن جب دو سے کم ہو کر پونے دو روٹی مجھے ملی تو میں پیر صاحب کے پاس جا کر شکوہ کرنے لگتا ہوں کہ کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے، میرا رزق باندھ دیا ہے۔ اب پیر صاحب دیکھ رہے ہیں کہ جب ایک کی جگہ دو روٹیاں مل رہی تھیں تب تو کبھی آپ نے رب کو یاد نہیں کیا اور اب رب تمھیں جھٹکا دینے لگا ہے تو تمھیں پیر صاحب یاد آ گئے، رب پھر بھی یاد نہیں آیا......! اب پیر صاحب کی خدمت ہو رہی ہے لیکن شکر پھر بھی غائب ہے۔ اب تو پیر صاحب کا شکر ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ گھٹتے گھٹتے روٹی پونے دو سے کوارٹر (1/4) رہ جاتی ہے تو میں ڈنڈا لے کر پیر صاحب کے پیچھے پڑ جاتا ہوں کہ آپ کے پاس آنے کے باوجود میرا رزق نہیں بڑھا۔ اب پیر صاحب مجھے سمجھا سمجھا کے تھک گئے ہیں کہ میرے پاس آنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرو اور کوارٹر (1/4) روٹی میں سے بھی پچاس فی صد (50%) کسی ضرورت مند بھوکے کو دے دو تو تمھارا رزق بڑھ جائے گا۔ دو کے بجائے تین روٹیاں تمھیں ملنے لگیں گی لیکن میں دُنیاوی تعلیم اور اس کے حساب کتاب میں اُلجھ جاتا ہوں جو مجھے بتاتا ہے کہ کوارٹر روٹی میں سے نصف روٹی دینے کے بعد تو میرے پاس 1/8 روٹی رہ جانی چاہیے...... یہ تین روٹیوں میں کیسے Convert ہو سکتی ہے......؟ چونکہ یہ نسخہ میری سمجھ میں نہیں آتا اس لیے میں اس کوارٹر (1/4) روٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہوں۔ تب مجھے پیر

صاحب بھول جاتے ہیں اور اصل معنوں میں رب یاد آتا ہے۔ میں اُسے آواز دیتا ہوں کہ میرے رب کدھر ہے تو......؟ میں مشکل میں ہوں، مدد کر دے میری۔ اور یہی تو رب سننا چاہتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ اس لیے جھٹکا دیتا ہے، کہ میرا یہ بندہ خوشی اور آرام کے وقت تو میرا شکر ادا کر رہا ہے، اب اِسے میں فاقے دے کر دیکھتا ہوں کہ یہ کیا کرتا ہے۔ جب وہ فاقے دے کر جھٹکا دیتا ہے تو ہم جھٹکوں کے عادی نہ ہونے کے باعث پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔

عرض اِتنی سی ہے کہ فاقے آ جانے کی صورت میں ہم (Double) (دوگنا) شکر ادا کریں۔ اس سے رب تعالیٰ راضی ہو گا اور ہمارے پاس پہلے سے زیادہ رزق آئے گا۔ فاقوں سے گھبرائیے نہیں بلکہ اس حال میں بھی مست رہیے اور کہیے ''یا اللہ! تیرا بڑا اکرم ہے، تو نے ہمیں لاکھوں لوگوں سے بہتر حال میں رکھا ہے۔'' اِس شکر گزاری پر نعمتیں بڑھا دی جائیں گی کیونکہ یہ قرآن پاک میں لکھا ہے کہ شکر کرنے والوں کے لیے نعمتیں بڑھا دی جاتی ہیں اور ناشکری کرنے والوں سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔

الغرض فاقے میں بھی جس نے شکر ادا کیا......زبان سے نہیں بلکہ دل سے......اُن کے لیے نعمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ یہ فارمولا بظاہر بہت عجیب ہے لیکن اِس فارمولا پر عمل کرنے والوں کی زندگی خوش حال اور آسودہ ہو جاتی ہے۔

سوال: سجدۂ تعظیمی اور سجدۂ حقیقی میں کیا فرق ہے؟ کیا سجدۂ تعظیمی کرنا، ماتھا ٹیکنا یا ہاتھوں کو بوسہ دینا جائز ہے؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ بے شک تم بُرا نہ کرو لیکن ایسی جگہ پر بھی نہ جاؤ جہاں گناہ ہوتا ہو...... ''اور اے سننے والے جب تو اُنھیں دیکھے جو ہماری آیتوں میں پڑتے ہیں تو اُن سے منہ پھیر لے جب تک اور بات میں پڑیں اور جو کہیں تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔'' (سورۃ الانعام:68) اِس کا مقصد کیا ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ انسان جتنا بھی نیک کیوں نہ ہو، اِبتدائی طور پر کہتا ہے کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا اپنے نفس پر کنٹرول کس حد تک ہے اور میں بُری جگہ پر جا کر گناہوں سے کتنا دُور رہتا ہوں؟ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ میں ایسی جگہ پر جہاں جوا کھیلا جا رہا ہے، یہ جاننے کے لیے جا رہا ہوں کہ جوا کھیلا کیسے جاتا ہے؟ پھر وہ کہتا ہے کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تاش کے پتے Shuffle کیسے کیے جاتے ہیں۔ یوں بتدریج وہ پتے تقسیم کرنا سیکھتا ہے حتیٰ کہ دو سال بعد خود بھی تاش کھیلنے لگتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف گناہوں سے منع کرتا ہے بلکہ ایسی جگہ جانے سے بھی منع کرتا ہے جہاں گناہ ہو رہا ہو...... کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان رفتہ رفتہ گناہوں سے قریب ہونے کی وجہ سے اُس طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ اِسی طرح سجدۂ تعظیمی اگرچہ سجدۂ حقیقی سے اپنی اصل رُوح میں مختلف ہے لیکن انسان تعظیمی سجدہ کرتے کرتے غیر اللہ کو سجدہ کرنے لگتا ہے۔ اِس لیے رب تعالیٰ نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع کر دیا تا کہ کوئی شخص سجدۂ تعظیمی سے سجدۂ حقیقی میں داخل نہ ہونے پائے۔ اس لیے سجدۂ تعظیمی نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کبھی لوگ تو صاحبانِ علم نہیں ہوتے۔ کون جانے کہ آپ نے سجدۂ تعظیمی کیا یا سجدۂ حقیقی کر ڈالا؟ ہوسکتا ہے کہ آپ کو دیکھ کر کوئی سمجھے کہ یہ سجدہ جائز ہے اور وہ سجدہ کرنے لگے۔ یوں وہ بندہ آپ کی وجہ سے غلط سمت میں چلا گیا۔ اس لیے غیر اللہ کو سجدہ کسی صورت نہ کیجیے۔ اِس سے دُور ہی رہیے کیونکہ سجدۂ تعظیمی میں بھٹک جانے کا احتمال بہر حال موجود ہے۔ ماتھا ٹیکنا بھی غلط ہے۔ یہ بھی سجدہ ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

کوئی بھی ایسا عمل جس سے سجدہ کا گمان ہو، اُس سے دُور رہیے کیونکہ یہ عمل گناہ کی طرف لے جائے گا۔

بزرگ یا فقیر کے ہاتھوں کو بوسہ دینا جائز ہے۔ اپنے سے بڑوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ یہ تعظیمی بوسہ ہے۔ یہ سجدہ کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ لیکن اہلِ فقر اِس تعظیمی بوسہ سے بھی دُور بھاگتے ہیں کیونکہ اِس سے انسان میں تکبر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر، بہتر اور بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن جب آپ کسی مزار پر جاتے ہیں اور اُس جگہ کو Out of love and affection بوسہ دیتے ہیں اسے علماء نے پسند نہیں کیا۔ محدث ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح عین العلم میں ہے کہ قبر، تابوت اور دیوار کو ہاتھ نہ لگایا جائے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر اطہر کے بارے میں اس طرح کرنے سے روکا اور منع کیا گیا ہے پھر باقی لوگوں کی قبور کے ساتھ یہ معاملہ کیسے روا ہوسکتا ہے؟ اور قبر کو بوسہ نہ دیا جائے: کیونکہ یہ تو ہاتھ لگانے سے کہیں بڑھ کر ہے لہٰذا اِس کے لیے نہی بطریق اولیٰ ہے۔

سوال: سعودی اور چند دیگر معاشروں میں ہاتھوں پر بوسہ دیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

جواب: مختلف معاشروں کی مختلف روایات ہوتی ہیں جیسے کچھ ممالک میں بزرگوں کے ہاتھوں پر بوسہ دینے کی روایت ہے...... بزرگ بہ لحاظ عمر، رُتبہ اور رشتہ ہوسکتا ہے۔ جیسے ایران میں والد سے ملاقات کے وقت اولاد اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کا فیض دُنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ فیض کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: فیض بمعنی فائدہ کے ہے۔ جب ہم صاحبِ مزار کے پاس حاضری دیتے ہیں تو اُن کی رُوح کبھی وہاں ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ جب ہم مزار پر جا کر فاتحہ خوانی کر کے اُس کا ثواب صاحبِ مزار کی رُوح کو بخشتے ہیں تو وہ رُوح خوش ہو کر دُعا کرتی ہے "یا اللہ تعالیٰ! جس شخص نے میرے نامۂ اعمال میں یہ ثواب لکھوایا ہے، تو بھی اُس پر رحم فرما اور کرم کر دے۔"

صاحبِ مزار چونکہ اللہ کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندے ہیں تو اللہ اُن کی دُعا قبول کرتا ہے۔ ایک تو یوں فیض حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا جب ہم وہاں مستقل جانے لگتے ہیں تو اُن صاحبِ مزار کے پاس جو علم تھا اُس کا زور تو اُس رُوح میں موجود ہے۔ اُسی علم کے زور پر تو وہ رُوح لطیف ہوئی تھی اور اُس کی پرواز بلند ہوئی تھی اور اُسی علم کے زور پر تو وہ صاحبِ مزار اللہ کے قریب ہوا تھا تو اُس کی Vibrations (لہریں) ہمارے اُوپر اثر انداز ہوتی ہیں اور ہمارے اُوپر وہ کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں جو علم و فضل کی ہیں...... کشف و کرامات کی

ہیں...... جو رُوح کی لطافت اور نیکی کی کیفیات ہیں......! جب ہم روزانہ وہاں جا کر وہ Vibrations (لہریں) اپنے اندر absorb (جذب) کرتے ہیں تو اُس کے اثرات ہماری رُوح اور جسم دونوں پر مرتب ہونے لگتے ہیں...... یہ فیض کہلاتا ہے۔

سوال: عموماً لوگ جمعرات کی شام مزارات پر جاتے ہیں۔ کیا جمعرات کو صاحبِ مزار کی رُوح کے موجود ہونے کے Chances زیادہ ہوتے ہیں؟

جواب: روایت یہی ہے کہ جمعرات کی شام کو ارواح اپنے مرقد یا مدفن سے رابطہ کرتی ہیں۔ اسی لیے عموماً لوگ جمعرات کو مزارات پر حاضری دیتے ہیں۔

سوال: نفس بدی کی طرف مائل کرتا ہے اور شیطان بھی۔ کیسے پتا چلے گا کہ بدی پر اُکسانے والا نفس ہے یا شیطان؟

جواب: یوں کہہ لیجیے کہ شیطان ہی ہمارے اندر خواہشات پیدا کرتا ہے۔ اِسی طرح ہماری بُرائیاں بھی شیطان کے ورغلانے کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ ہم اپنے کسی گناہ کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے اِس لیے سارا الزام شیطان پر دھر دیتے ہیں۔

بات ایک ہی ہے نفس اُکسائے یا شیطان...... بدی تو بدی ہے جسے ہر حال میں ختم کیا جانا چاہیے۔ اِس کا مقابلہ کیا جانا چاہیے۔

سوال: کیا قوالیوں اور نعتوں میں موجود شاعری جائز ہے؟

جواب: آپ ﷺ کے حضور ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ جو میں آپ ﷺ کہتا ہوں...... یہ بھی گستاخی ہے۔ وہاں تو اِس حد تک ادب درکار ہے کہ صرف ﷺ کہا جائے، شعر میں تو آپ ﷺ کے ذاتی اسمائے مبارکہ نہ جانے کس کس انداز میں لیے جاتے ہیں......اور آپ ﷺ کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جو سوائے گستاخی کے اور کچھ نہیں۔ اللہ کے حضور تو ایسی گستاخی چل جاتی ہے۔ کیونکہ رب کے حضور تو محبت میں دیوانگی چاہیے لیکن آپ ﷺ کے حضور ادب چاہیے جو جس درجہ کا بھی ہو...... کم ہے۔

سوال: حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کردہ علم کون سا تھا؟

جواب: اِس علم کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے نہیں کی۔ اُس نے اسے علم الاسماء کہا ہے۔ صاحبانِ علم اِسے علم سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرش پر بحرِ نور ہے جہاں سے ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم کی نہریں نکلتی ہیں۔ دُنیا کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب جو چند سال پہلے دریافت ہوئی اُس کے پاس ٹوٹل پچاس ہزار علوم تھے۔ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ علوم رُوحانی، دینی اور دُنیاوی علوم پر مشتمل ہیں۔ ایک تجزیہ کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اِن تمام علوم کا منبع ایک ہی ہے۔ جب منبع ایک ہی ہے تو End بھی سب علوم کا ایک ہی جگہ ہو رہا ہے۔ اِس لحاظ سے

دیکھا جائے تو یہ علم اُس بحرِ نور کا حصہ ہے جہاں سے علم کی نہریں نکل رہی ہیں۔ تو یوں کہہ لیجیے کہ اُس علم میں سے حضرت آدم علیہ السلام کو حصہ دے دیا گیا اور اُسی میں سے انسان باقی سب علوم سیکھتا چلا جائے گا۔ تو وہ علم جو Mother of knowledge ہے، اُس میں سے حضرت آدم علیہ السلام کو علم عطا کیا گیا۔

سوال: فرشتوں اور حضرت آدم علیہ السلام سے مختلف علم ہونے کے باوجود Test یکساں لیا گیا۔ کیا یہ Equitable justice ہے؟

جواب: سیکرٹریٹ میں ایک شخص کو گورنمنٹ کلرک اور دوسرے شخص کو سیکشن آفیسر بھرتی کرتی ہے۔ کلرک کو تھوڑی ٹریننگ کے بعد دفتر میں کام پر بٹھا دیا جاتا ہے لیکن سیکشن آفیسر تو باقاعدہ چارج لینے سے پہلے CSS اور Viva پاس (Clear) کرتا ہے اُس کے بعد اُس کی ایک سال کی سول سروسز اکیڈمی میں ٹریننگ بھی ہوتی ہے تب کہیں جا کر وہ سیکشن آفیسر کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ تو یہ کوئی equitable justice تو نہ ہوا......! کیونکہ چلانا تو کلرک نے بھی قلم ہی ہے اور سیکشن آفیسر نے بھی کاغذ پر قلم ہی چلانا ہے لیکن دونوں کی ٹریننگ میں فرق ہے۔ ایک سال کی سروس کے بعد سیکشن آفیسر کو بیرونِ ملک ٹریننگ (Training) کے لیے بھیجا جاتا ہے جبکہ کلرک دفتر ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ دُنیاوی یا دفتری نظام کے بارے میں ہم سب Clear ہیں کہ کلرک نے ہدایات کو محض Follow کرنا ہوتا ہے جبکہ سیکشن آفیسر کو ترقی کرتے کرتے کل (Policy maker) اور Decision-maker کے مقام تک جانا ہے۔ اگر بنیادیں کمزور رہ گئیں تو منصوبہ سازی اور فیصلہ سازی میں وہ کمزور رہ جائے گا جو Disaster (تباہی) کا سبب بنے گا۔ اِس لیے سیکشن آفیسر کو بہت ناپ تول کر لیا جاتا ہے اس کی ہر طرح کی Qualification کرائی جاتی ہے پھر سخت Training کرائی جاتی ہے۔

فرشتوں نے اللہ کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے صرف تعمیل کرنی ہے۔ اُن کے ہاں Application of mind نہیں ہے۔ اس لیے اُن کو سول سروسز اکیڈمی میں ایک سالہ ٹریننگ نہیں کرائی گئی اور نہ ہی وظیفہ دے کر امریکہ اور برطانیہ سے پڑھایا گیا...... جبکہ انسان نے چونکہ زمین میں اللہ کے نائب کا کردار ادا کرنا تھا اور فیصلے بھی کرنا تھے اِس لیے اُس کو وہ علم دے دیا گیا جس میں Application of mind تھی تو یوں یہ عین Equitable justice ہے۔

ہر انسان کے نزدیک چھوٹی یا بڑی بات کا معیار مختلف ہوتا ہے جیسے ایک دو سالہ بچے کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے کہ بلی اُس کے پچکارنے پر اُس کے پاس آجاتی ہے لیکن اُس بچے کے 50 سالہ باپ کے لیے بڑی بات یہ ہے کہ اس احتیاط سے چلا جائے کہ انڈیا اور پاکستان جنگ سے محفوظ رہیں۔ یوں بچہ اور باپ دونوں کے نزدیک عقل کی نسبت سے بڑی بات کا معیار مختلف ہو گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ہماری فطرت بھی جانتا ہے، ہمارے ذہنی معیار اور علم کی سطح سے بھی واقف ہے اس لیے وہ نہیں پوچھے گا کہ اُس سے کس بندے نے کیا

سوال کیا......! کیونکہ وہ انسان کی ذہنی سطح اور استطاعت، علم کی سطح اور عقل و سمجھ کے لیول سے بخوبی واقف ہے۔ میرے نزدیک تو وہ میرا مالک اور پالن ہار ہے لہٰذا میں تو اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا کرتا ہوں۔ آپ بھی ایسا کرلیا کیجیے لیکن اِس بات کا دھیان رکھیے کہ اُس میں مان ہو، گستاخی نہ ہو کیونکہ رب تعالیٰ مان کو بے حد پسند کرتا ہے۔

سوال: کیا نفس اور شیطان دو مختلف Entities ہیں یا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟

جواب: میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہر چیز کے جوڑے ہیں۔ ہر انسان کے اندر بھی نیکی اور بدی کا جوڑا ہے۔ نیکی کو آپ رحمانیت اور بدی کو شیطانیت کہہ لیجیے۔ نیکی کو قلب اور بدی کو نفس کہہ لیجیے۔

یوں سمجھ لیجیے کہ نفس شیطان کے تابع ہے اور نیکی کا جذبہ رحمان کے تابع ہے۔ جب ہم شیطان کے تابع ہونے لگتے ہیں تو اللہ نے جو رحمانیت ہمارے اندر رکھی ہے، وہ گرد آلود ہونے لگتی ہے اور شیطانیت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے نتیجتاً ہم بُری خواہشات کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں...... لیکن جب ہم اپنے آپ کو مضبوط کرلیتے ہیں اور خواہشات کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں...... مثلاً میرے نفس نے کہا کہ کھانا کھانا ہے لیکن جیب میں رقم نہیں، تو میں نفس کی خواہش سے مغلوب ہوکر کسی کی جیب کاٹ لیتا ہوں۔ یہ ایک شیطانی عمل ہے۔ بھوکا رہنا گوارہ کرلیتا ہوں لیکن گناہ اور شیطانی کام میں ملوث نہیں ہوتا...... تو یوں میں شیطانیت کو مغلوب کرلیتا ہوں اور رحمانیت کو گرد آلود ہونے سے بچالیتا ہوں۔ اس کا ثواب میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے گا کہ میں نے ایک بُرائی کو دبا دیا اور نفس کی خواہش کو کچل دیا۔

یہ نہیں کہ ہم نفس کی مانتے رہیں اور بُرائیاں کرتے چلے جائیں کیونکہ وہ شیطان نہیں کہہ رہا...... اور جب شیطان کوئی کام کہہ دے تو اُس سے لڑ پڑیں۔ بُرائی تو بُرائی ہے...... خواہ کسی بھی سوچ کے تحت کی جائے۔

سوال: صاحبِ دُعا اگر کسی شخص کی کسی کام پر ڈیوٹی لگاتے ہیں اور وہ شخص کچھ عرصہ مستقل مزاجی سے وہ کام کرتا ہے۔ پھر وقفہ یا ناغہ کے بعد دوبارہ ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔ تو کیا ناغہ سے ساری سابقہ محنت ضائع ہو جاتی ہے؟

جواب: جب کوئی انسان نیکی کرتا ہے تو اُس کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ صاحبِ دُعا کے کہنے پر آپ نے کسی کو روزانہ کھانا کھلانا شروع کردیا تو اُس کا اجر روزانہ آپ کے نامۂ اعمال میں لکھا جانے لگا۔ جس روز آپ کھانا نہیں کھلا سکے اُس روز ثواب نہیں لکھا جائے گا۔ البتہ وظائف کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اگر آپ کوئی ذکر وظیفہ کے طور پر کریں تو وہ ایک مخصوص وقت پر کیا جانا چاہیے...... مخصوص تعداد میں کیا جانا چاہیے بغیر ناغہ کے روزانہ کیا جانا چاہیے...... کیونکہ اِس میں سانپ اور سیڑھی کے کھیل جیسا سلوک ہوتا ہے۔ جس طرح اس کھیل میں کھیلتے کھیلتے آپ Home سے ایک ڈگری پہلے اچانک سانپ کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور نتیجتاً زیرو پر پہنچ جاتے ہیں، اِسی طرح فرض کیجیے کہ ایک وظیفہ کا دور 10 سال ہے۔ آپ اس وظیفہ کو نو سال

گیارہ ماہ اور اٹھائیس دن پابندی سے کرتے ہیں اور 29 ویں روز ناغہ کر جاتے ہیں تو آپ زیرو پر پہنچ گئے...... وہ دور مکمل نہیں ہوا۔اب یہ دور آپ کو نئے سرے سے شروع کر کے مکمل کرنا پڑے گا۔لیکن یاد رکھیے! یہ پابندی محض مخصوص وظائف کی حد تک ہے لیکن نوافل، تلاوت قرآن پاک، کسی کو کھانا کھلانے، لباس فراہم کرنے کا ثواب فوراً نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ اِس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے جبکہ مخصوص وظائف کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔

رُوح کی بالیدگی کے لوازمات

سوال: انسانی زندگی میں ضمیر کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز اُس کی ضد کے ساتھ پیدا کی...... اچھائی کے ساتھ بُرائی، نیکی کے ساتھ بدی، خوش حالی کے ساتھ تنگ دستی، صحت کے ساتھ بیماری۔ اسی طرح دن رات، گرمی سردی اور خزاں کے ساتھ بہار ہے۔ انسان کے اندر ایک چیز نفس ہے جس کی زیادہ تر خواہشات اُس طرف لے جاتی ہیں جو مسلمانوں کے لیے ممنوعہ علاقے یا Don'ts ہیں۔ اِس لیے صاحب علم سب سے پہلا وار اپنے نفس پر کرتے ہیں۔ نفس کو رب تعالیٰ نے انسان کے اندر ضمیر رکھ کر Balance کیا ہے۔ جہاں نفس ہمیں بھوک کی صورت میں چوری کرنے اور کسی کی جیب کاٹنے پر اُکساتا ہے وہاں ضمیر ہمیں فوراً لعن طعن کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔ نفس ہمیں انتقام پر اُبھارتا ہے کہ اُس شخص نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے میں اُسے نہیں چھوڑوں گا۔ لیکن فوراً اندر سے ضمیر کی آواز آتی ہے کہ قتل کا بدلہ قتل سے لینا تو کوئی بڑا کام نہیں۔ بڑا پن تو یہ ہے کہ خوش دلی سے دشمن کو معاف کر دو۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اُس کے نفس کے خلاف ضمیر کی صورت میں ایک Counterbalance یا Counterweight رکھ دیا۔

جب کوئی چیز Rotate کرتی ہے تو اُس کی ایک سائیڈ میں Weight زیادہ ہونے کی صورت میں ایسی تباہ کن Vibrations پیدا ہوتی ہیں کہ جن سے چیزیں عموماً ٹوٹ جاتی ہیں۔ اِس Vibration کو روکنے کے لیے Counterweight باندھ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چیز اُسی رفتار سے گھوم رہی ہوتی ہے لیکن Vibration پیدا نہیں ہوتی۔ اس کو انجینئرنگ کی زبان میں Counterweigth کہا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی کے کرین شافٹ (Crankshaft) کو غور سے دیکھیں تو اُس میں بہت سے U بنے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دراصل اُن کے Different angles ہیں۔ آپ کی چار سلنڈر والی گاڑی میں وہ چار Us آپ کو مختلف Angles سے دکھائی دیتے ہیں اور اُن کے Opposite موٹے Ends دکھائی دیں گے۔ یہ دراصل Counter- weights ہیں جو U کے Weight کو Balance کرتے ہیں جس سے Vibration بہت کم ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے اندر نفس کا Counter ضمیر کر دیا۔ انسان اپنے فائدہ کے لیے اپنے پڑوسی کو تنگ کرتا ہے...... یہ نفس ہے...... لیکن ہمارا ضمیر اس کو فوری طور پر روک دیتا ہے...... دراصل ضمیر ہمیں سیدھی راہ پر رہنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن ہم اس کا کیا کریں کہ اکثر ہم نفس کی پرورش کرنے لگتے ہیں اور ضمیر کو مارنے لگتے ہیں...... کیونکہ ضمیر قربانی مانگتا ہے جو بظاہر گھاٹے کا سودا ہے اور انسان عموماً گھاٹے کا سودا کرنا نہیں چاہتا...... اِس لیے اکثر ضمیر کی آواز دبا دیتا ہے۔

دیانت داری کی دو بڑی قسمیں ہیں:

1۔ Physical honesty

2۔ Intellectual honesty

Physical honesty یہ ہے کہ میں چوری نہ کروں، کسی کا حق نہ ماروں، کسی کی چیز بغیر اجازت کے استعمال نہ کروں وغیرہ۔

Intellectual honesty یہ ہے کہ میں جب بھی بات کروں، حق کی بات کروں، کوئی ایسی بات نہ کروں جس سے کسی کی توہین ہوتی ہو یا کسی کا راز عیاں ہوتا ہو۔ میں دوسرے کا بُرا نہ سوچوں۔

میرے نزدیک Physical Dishonesty اتنا بڑا جرم نہیں جس قدر Intellectual Dishonest ہو جانا کیونکہ جو شخص Intellectually honest ہے وہ Physically dishonest ہو ہی نہیں سکتا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ضمیر دراصل Intellectual honesty کا نام ہے کہ جب ہم کسی کے خلاف کوئی ایسی بات سوچ ہی نہیں سکتے جو اخلاق سے گری ہوئی ہو یا انسانیت کے ضابطے سے نیچے ہو...... تو یہ ضمیر ہے۔ جب انسان بُری بات سوچے گا ہی نہیں تو پھر وہ کوئی بُرا عمل بھی نہیں کرے گا۔ یوں وہ Physical dishonesty کی طرف بھی نہیں جائے گا۔

سب سے پہلی چیز ہے سوچ، پھر ارادہ اور اُس کے بعد عمل۔ جب سوچ پر ہی انسان نے قدغن لگا دی اور وہ بُری بات سوچ ہی نہ سکا تو ایسے میں بُرا ارادہ یا عمل کیا کرے گا۔ اِس لیے ضمیر کی انسانی زندگی میں بے حد اہمیت ہے کیونکہ یہی ہمیں سیدھی راہ پر رکھے گا۔ لہٰذا رُوح کی پرورش کی جانی چاہیے۔ لفظ پرورش سے مجھے اپنی سٹوڈنٹ لائف کی ایک بات یاد آ گئی۔ میں میٹرک میں تھا جب مجھے فیروز سنز کے مال روڈ والے شوروم پر ایک کتاب خریدنے کے لیے جانا پڑا۔ فیروز سنز کی Entrance پر Fresh arrivals میں ایک کتاب نے اپنے مختصر سائز کی وجہ سے مجھے متوجہ کیا...... وہ دراصل علامہ اقبال کی ڈائری تھی۔ میں نے اُسے کھولا تو پہلے ہی صفحہ پر ایک Saying (قول) تھی ''اگر انسان اپنی رُوح کی پرورش کرنا چاہے تو اُسے اپنے جسم کو Ignore کرنا ہوگا اور اگر جسم کی پرورش مقصود ہو تو پھر رُوح کو نظر انداز کرنا ہوگا۔''

یہ بہت اُونچی بات تھی جو علامہ اقبال نے کہی۔ جب انسان رُوح کو پروان چڑھائے گا تو جسم تو دُبلا ہوگا

اِس لیے فقیر موٹے نہیں بلکہ دُبلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم اپنے رُوح کی پرورش کریں گے تو نفس خود بخود کمزور ہو جائے گا...... پھر وہ سر نہیں اُٹھائے گا۔

سوال: مختلف ممالک میں لیلتہ القدر مختلف اوقات اور راتوں میں آتی ہے تو کیا اُن تمام اوقات اور راتوں میں زمین پر بسنے والے لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہوتا ہے؟

جواب: لیلتہ القدر میں Timing کا Confusion پیدا کیا جا رہا ہے۔ اِس کے بارے میں مختصراً عرض کر دوں۔ ہم جس جس ملک میں رہتے ہیں اُس ملک کے سورج کے ٹائم کے مطابق ہم اپنے اپنے علاقہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ ہر ملک میں زوال اور طلوع و غروب آفتاب کا وقت مختلف ہے۔ روزہ ہم اپنے ملک کے وقت کے مطابق شروع کرتے ہیں اور افطار کرتے ہیں۔ ماہِ رمضان کا براہِ راست تعلق چاند سے ہے لیکن افطار و سحر کا تعلق سورج سے ہے۔ عید ہم اپنے ملک کے چاند کے مطابق مناتے ہیں۔ لیلتہ القدر بھی تو قمری مہینے کے حساب سے ہوتی ہے، پھر یہ کیسے مختلف ہو سکتی ہے؟

یورپی ممالک میں لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کی تقدیر میں Alterations اور Additions آسمانوں پر ہوتی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تین دن تک انسانوں کی تقدیر کا ہی فیصلہ ہوتا رہے گا کیونکہ وہ ایک مبارک رات مختلف ممالک میں مختلف دنوں یا اوقات میں آئے گی؟

اِس کا بڑا آسان سا جواب ہے۔ یہ درست ہے کہ لیلتہ القدر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں ہوتی ہے اور اُس شب جو شخص رب تعالیٰ کو یاد کر رہا ہوتا ہے...... اور اُس سے سوال کر رہا ہوتا ہے...... رب تعالیٰ اپنی رحمتوں کے صدقے اُس کی جھولی بھر دیتا ہے بشرطیکہ اُس کا سوال خلافِ فطرت نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ کی ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق خلافِ فطرت دُعا قبول نہیں ہوتی۔

اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سارے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں...... لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہی آسمان تمام ممالک کو نہیں ڈھانپے ہوئے؟

جب فیصلے ایک ہی آسمان پر کیے جا رہے ہیں اور وہی آسمان تمام دُنیا کو ڈھانپے ہوئے ہے تو پھر کس بات کا Confusion؟ ذرا سوچیے! کیا اللہ کی کرسی تمام کائنات پر محیط نہیں ہے۔؟ جب سبھی ممالک اس کی کرسی کے پائے کے نیچے آ گئے تو پھر وہاں کیا دشواری آئے گی۔ لہٰذا یوں سمجھ لیجیے کہ جس ملک میں لیلتہ القدر آئے تو اُس رات میں اُس ملک کے انسانوں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہو گا۔ ہمیں اس شک و شبہ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ سعودی عرب میں تو لیلتہ القدر فلاں دن ہو چکی، اپنے ہاں تو ہم نے اُسے ضائع کر دیا۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے سر پر جو آسمان ہے اُسی کا حساب رہے گا اور فیصلہ اُسی رات میں ہو گا جو ہمارے ہاں لیلتہ القدر ہو گی۔ لہٰذا اس وہم میں نہ پڑیئے۔ آپ بس ماہِ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں عبادت کر کے شبِ قدر ڈھونڈیئے۔ اللہ سے دُعا مانگیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دُعائیں ضرور سنے گا اور آپ کی حاجات پوری کرے گا۔

سوال: ماہِ رمضان میں نیکی کے حصول کے لیے کون سا خاص عمل اور وظیفہ کیا جانا چاہیے؟

جواب: ابھی جب میں آ رہا تھا تو ریڈیو پاکستان لاہور پر نیکی کے حوالے سے ایک لیکچر نشر ہو رہا تھا جس میں ایک خاتون فرما رہی تھیں کہ خواتین جب اکٹھی بیٹھتی ہیں تو عموماً Gossip کے نام پر کسی نہ کسی کی بُرائی ضرور کرتی ہیں۔ اگر ہم نیکی کی راہ اپنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ماہِ رمضان میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ہماری زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

میں اِس میں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ پیدائش سے لے کر آخری سانس تک ہم آپ ﷺ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے کوشش کریں کہ ہماری زبان اور ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ہم سب کے ساتھ اچھا سلوک کریں لیکن ترجیحاً مسلمان کو Look after کریں۔ مثلاً اگر کبھی ایسا ہو کہ ہمارے وسائل کم ہوں اور ایک طرف مسلمان ضرورت مند ہو اور دوسری طرف غیر مسلم تو ہم پہلے مسلمان کو Look after کریں گے لیکن اگر وسائل اجازت دیتے ہوں تو سبھی کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ اِسی طرح بالعموم تمام انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں کو ہماری زبان و ہاتھ سے ایذاء نہ پہنچے۔ اِسی لیے تو کہتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی سراسر جہاد ہے۔ جہاد کی دس قسمیں ہیں اور اُن میں جہاد بالسیف آخری نمبر پر ہے۔ پہلے نمبر پر جہاد بالنفس ہے۔ مسلمان نہ صرف ماہِ رمضان میں بلکہ ساری عمر نیکی کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ساری عمر بدی سے دُور بھاگتا ہے ہاں البتہ اس مبارک مہینے میں نیکی کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح آپ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بڑھ کر سخی تھے لیکن اس مہینے میں آپ ﷺ کی سخاوت اور بھی بڑھ جایا کرتی...... سخاوت کے چشموں میں اور زور آ جایا کرتا تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان ساری عمر نیکی کی راہ پر چلنے اور بدی کے راستے سے بچنے کی کوشش میں لگا رہے۔ لیکن ماہِ رمضان میں اپنی اِس کوشش کو فزوں تر کر دے۔

سوال: وسوسہ اور اِلہام میں کیا فرق ہے؟

جواب: اِلہام اللہ کی طرف سے انسان کو علم ٹرانسفر کرنے یا خبر پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

وحی تو نبوت تک محدود ہے۔ نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ کے تشریف لانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اِس کے ساتھ ہی وحی کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب وحی کبھی کسی پر نازل نہ ہوگی۔ اب اطلاع یا خبر کے لیے دو ذرائع رہ جاتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے اولیا کو نوازتا ہے۔ جیسے انسان کے ذہن میں بیٹھے بٹھائے ایک خیال آئے گا کہ شاید فلاں صاحب تشریف لا رہے ہیں، وہ اُٹھ کر باہر دیکھے گا تو واقعی وہ صاحب آتے دکھائی دیں گے...... یہ بڑی ابتدائی شکل ہے۔ اِسے اِلقا کہتے ہیں۔

وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں ڈوب جاتے ہیں، اُن کے دل و دماغ میں اللہ کی قدرت کے سوا کچھ نہیں بستا۔ تب وہ ایک مقام پر پہنچتے ہیں اور اُس مقام پر پہنچنے کے بعد اُن پر یہ اِلقا جاری ہوتا ہے۔ اِس سے اگلا مقام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ انسان کو خواب میں گزری ہوئی باتیں اور آنے والے واقعات دکھانے لگتا ہے۔

انسان کو لوگوں کے احوال خواب میں معلوم ہونے لگتے ہیں...... یہ عالم رویا ہے۔ اِس سے اگلا مقام وہ ہے جہاں انسان کو کشف حاصل ہو جاتا ہے۔ کشف دو طرح کا ہے:

1۔ بیٹھے بٹھائے کبھی بھی کشف جاری ہو جائے گا...... یہ عموماً اولیائے کرام کو حاصل ہوتا ہے۔

2۔ کچھ اولیائے کرام پر اللہ تعالیٰ خاص رحمت فرماتا ہے اور وہ جب چاہیں کشف میں داخل ہو سکتے ہیں۔

کشف سے اگلی چیز اِلہام ہے۔ اِلہام کے مقابلہ میں وسوسہ ہے جس کا تعلق شیطان سے بھی ہے اور ہمارے نفس سے بھی۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ انسان جسے اپنے نفس پر کوئی قابو نہیں ہوتا، اُسے اگرچہ کشف تو حاصل ہے لیکن منہ زور بے قابو نفس کی وجہ سے شیطان اُسے کچھ چیزیں دکھاتا ہے یا اُس شخص کے دل میں القا کے ذریعے کچھ خیالات آنے لگتے ہیں۔ تب انسان سمجھتا ہے کہ مجھے اِلہام ہو رہا ہے اور مجھے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ دکھا رہا ہے حالانکہ حقیقت میں اُسے یہ سب کچھ نفس دکھا رہا ہوتا ہے اور یہ اُس کی خواہشات ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب انسان اپنی خواہشات کی تکمیل دیکھنے لگے اور یہ سمجھے کہ شاید مجھے اِلقا، کشف یا اِلہام کے ذریعے یہ Information مل رہی ہے جبکہ دراصل وہ اُس کے نفس کی خواہشات ہوں تو یہ وسوسہ ہے۔ یہ وسوسہ کسی بھی Stage پر انسان کی جان نہیں چھوڑتا۔ اِس کے بارے میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اگر آپ حالتِ کشف میں گئے تو اُس میں یوں ڈوبنا پڑے گا کہ نفس سے آپ کا تعلق ٹوٹ جائے۔ یہ چیز Practice سے حاصل ہوتی ہے۔ جب تک یہ پریکٹس نہیں ہوگی وسوسہ دھوکا دیتا رہے گا!

قصہ مختصر، وہ اطلاعات جو نفس یا نفس کی خواہشات پر مبنی ہیں...... وہ وسوسہ، اور جو رب کی طرف سے دکھایا جاتا ہے وہ اِلہام، کشف یا اِلقا ہے۔

سوال: ضربِ مومن سے کیا مراد ہے؟

جواب: اِس کی بڑی سادہ تعریف یہ ہے کہ جو مردِ مسلمان، مردِ مومن ہو گیا اور پھر اُس نے کسی بڑی بُرائی کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم اُٹھایا، وہ ضربِ مومن ہے۔ ضربِ مومن میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا کیونکہ مومن رب کی فراست سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ اب حالات اُس نہج پر پہنچ چکے ہیں جہاں مردِ مومن کی نہیں بلکہ ضربِ مومن کی ضرورت ہے، اُس سے میری مراد یہ تھی کہ اب نہ شخصیات سے کام چلے گا اور نہ خواہشات سے...... اب کام اگر سنور سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف سچے عمل سے...... اور وہ سچا عمل ہی ضربِ مومن ہے۔

سوال: کشف اور اِلہام میں بنیادی فرق کیا ہے؟

جواب: انگریزی کی Grammar میں تین Degrees ہیں جیسے Good, better, best...... حالانکہ لفظ ایک ہی ہے لیکن ڈگری کا فرق ہے اِسی طرح کسی بھی Information کے کسی نیک اور مومن انسان تک پہنچنے کا ذریعہ تو ایک ہے لیکن Degree کا فرق ہے۔ یہ Depend کرتا ہے کہ کوئی شخص رُوحانی لطافت کے کس مقام پر ہے...... جتنا وہ رُوحانیت کے بلند مقام پر ہوگا اُس کو پہنچائی جانے والی Infromation کا

ذریعہ اُتنا ہی Clear ہوگا۔ معاملہ صرف ڈگری کا ہے ورنہ القا، عالم رویا، کشف اور اِلہام ...... یہ سب اطلاع ہی کے ذرائع ہیں۔

سوال: قطب شمالی وجنوبی پر نمازوں کے اوقات کس طرح مقرر کیے جاتے ہیں؟

جواب: قطب شمالی اور جنوبی پر نمازوں کے اوقات اجتہاد کے ذریعے یوں مقرر کیے گئے کہ ایک اندازہ کرلیا گیا کہ جس طرح زمین پر فرضی خطوط Draw کیے گئے ہیں اور ہر خط کا درمیانی فاصلہ 24 میل کا ہے اور ایک خط سے دوسرے خط کے درمیان 4 منٹ کا فرق ہے۔ (یہی Method ہوائی جہاز اور بحری جہاز کی Navigation میں استعمال کیا جاتا ہے۔)

جب معلوم ہوگیا کہ طول بلد اور عرض بلد (Longitude and latitude) کے درمیان 4 منٹ کا فرق ہے اِس سے اجتہاد کے ذریعہ مسلمانوں نے Work out کرلیا۔ اُنھوں نے خانہ کعبہ کو Benchmark مان کر Calculation کی اور وہ ممالک جو قطب شمالی پر ہیں یا قطب شمالی کے بالکل پاس ہیں جنھیں Scandinavian countries کہا جاتا ہے اُن کے لیے نمازوں کے اوقات طے کرلیے۔ اِسی اُصول پر اُنھوں نے سحر و افطار کے اوقات مقرر کیے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ شریعت کی بنیاد چار ستونوں پر ہے۔ اِن میں اجتہاد چوتھا ستون ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس پر قرآن وحدیث اور سنت خاموش ہو تو حکم یہ ہے کہ اجتہاد کرلیا جائے۔ اجتہاد کی بنیادی شرائط میں علما کا مستند ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ لوگ جن کے نیک ہونے پر کسی کو کوئی شک وشبہ نہ ہو...... اگر ایسے لوگ مل کر بیٹھیں۔ معاملہ یا مسئلہ کا کلی طور پر جائزہ لینے کے بعد اُس کا حل نکالیں اور مسلمان اُس پر عمل کریں تو یہ جائز ہوگا۔

نفلی روزے اور مجاہدہ وقربانی

سوال: رُوحانیت میں ستائیس رجب اور شعبان کے نفلی روزوں کی اہمیت وفضیلت کیا ہے؟

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا رجب کا مہینا اللہ کا مہینا ہے۔ شعبان میرا مہینا اور رمضان اُمت کا مہینا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی تو وہ ستائیس رجب کا دن اور پیر کا روز تھا۔ پیر کا دن بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ ﷺ پیر ہی کے روز دُنیا میں تشریف لائے۔ اُسی روز آپ ﷺ کا وصال ہوا۔ پیر ہی کے روز آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی۔

ستائیس رجب کے روزے کی بہت زیادہ فضیلت ہے۔ یہ روزہ چھ مہینوں کے روزوں کے برابر ہے۔ ستائیس رجب کی شب کی عبادت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو شخص اِس رات عبادت کرے اور اِس کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں تو وہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق شب بیدار کے نہ صرف گزشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں بلکہ اُس کی آنے والی عمر کے دوران رب تعالیٰ اُس شخص کے گناہوں پر نگہبان ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رحمت اُس شخص پر نازل ہونے لگتی ہے اور وہ گناہوں سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر ہم ستائیس رجب کا روزہ رکھیں اور ستائیس رجب کی شب عبادت میں گزار دیں تو یہ ہماری بخشش کا سبب بن جائے گی کیونکہ جب ستائیس رجب کی ایک تہائی شب گزر جاتی ہے تو تمام فرشتے خانہ کعبہ کے اردگرد اکٹھے ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ اُن سے مخاطب ہوتا ہے اور فرشتوں سے پوچھتا ہے ''تم کیا چاہتے ہو؟'' تب وہ فرشتے سفارش کرتے ہیں ''یا اللہ تعالیٰ! روئے زمین پر آج کی شب جو بھی تیری عبادت کر رہے ہیں تو اُن کو بخش دے۔''

روزہ کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تمام عمر روزے رکھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے آدھی عمر روزے رکھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عمر بہت پابندی سے ایامِ بیض کے روزے رکھتے رہے۔ یاد رہے کہ ہر قمری مہینے کی 13، 14 اور 15 تاریخ کے روزوں کو ایام بیض کے روزے کہا جاتا ہے اور جو شخص یہ روزے رکھے اُس کے چہرے پر نور برسنے لگتا ہے۔

شعبان کے روزوں کی بھی بہت فضیلت ہے۔ آپ ﷺ ماہِ شعبان میں کثرت سے روزے رکھتے تھے

اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی تلقین فرماتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک عمر رسیدہ صحابیؓ نے عرض کی "اگر میں شعبان کے پورے ماہ کے روزے رکھنے کی ہمت خود میں نہ پاؤں تو کیا کروں؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم شعبان کا پہلا، درمیان والا اور آخری روزہ رکھ لیا کرو، اس سے تمھیں پورے مہینے کے روزوں کا ثواب مل جائے گا کیونکہ شعبان میں ایک روزے کا ثواب دس روزوں کے برابر ہے۔" رُوحانیت ایسی Dimension ہے جس میں فرائض سے بڑھ کر کی جانے والی عبادات بہت رنگ لاتی ہیں۔ جیسے کسی فوجی کو سروس کے دوران میڈل اُسی صورت میں ملتا ہے جب وہ اپنی ڈیوٹی سے بڑھ کر کوئی کام کرتا ہے Beyond the call of his duty کوئی کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔ رُوحانیت بھی یوں سمجھ لیجیے کہ مومن کا ایک میڈل ہے جو اُس وقت ہمیں ملے گا جب ہم اپنی فرض عبادات سے Beyond چلے جائیں گے۔ نفلی روزہ بھی انہی عبادات میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ایک احتیاط ہمیں ضرور کر لینی چاہیے کہ جب ہم روزہ سے ہوں، ہمارا وہ دن عام دنوں سے مختلف ہونا چاہیے......!

کچھ چیزیں جن کی اِسلام میں ممانعت ہے وہ ہماری روزمرہ زندگی کا اِس قدر حصہ بن چکی ہیں کہ ہمیں اُن کے حوالے سے ناپسندیدگی کا ویسے احساس نہیں ہوتا جیسے کہ ہونا چاہیے...... ایسی باتیں عموماً روزے پر اثر انداز ہوتی ہیں مثلاً غیر متحمل مزاجی اور عجلت پسندی وغیرہ۔ چند روز پیشتر مغرب کے وقت سے کچھ پہلے میں Drive کر رہا تھا کہ ٹریفک سگنل پر رُکنا پڑا۔ میرے پیچھے ایک مولانا صاحب آ رہے تھے، وہ مسلسل ہارن بجانے لگے اور اشارہ سے مجھے کہنے لگے کہ راستہ چھوڑو، مجھے نکلنا ہے اور جا کر روزہ افطار کرنا ہے۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ مجھے احساس ہے کہ آپ کے افطار کا ٹائم ہو رہا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ملک کا قانون مجھے سگنل توڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ تحمل سے کام لیجیے، اگر اِسی ٹریفک سگنل پر آپ کا روزہ افطار کرنے کا ٹائم آ گیا تو آپ کی روزہ کشائی میرے ذمہ ہے لیکن خدارا ہارن بجانا چھوڑ دیجیے۔ افطار کا وقت ہونے سے پہلے ٹریفک سگنل کھل گیا اور وہ مولانا صاحب Lane کی پروا نہ کرتے ہوئے گاڑی دوڑا کر لے گئے۔

داڑھی رکھنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حد پسندیدہ سنت ہے۔ جب ہم داڑھی رکھتے ہیں تو دراصل اپنی شکل کی مشابہت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ سنت رکھنے کے بعد ہم سے کوئی بھی ایسی حرکت سرزد ہوتی ہے تو یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس عزیز ترین سنت پر عمل کرتے ہیں تو ہمیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ غیر مسلم پر تو صرف ملکی قوانین کی پابندی ہے جبکہ ایک مسلمان کا اوّلین فرض قانونِ الٰہی کی پابندی ہے...... اور اِس کے بعد وہ اُس ملک کے قوانین کی پیروی کرے گا جس میں وہ رہتا ہے...... اور وہ پیروی بھی اُس وقت تک جب تک وہ ملکی قوانین اللہ کے احکامات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

رُوحانیت تسبیح کے دانے رولنے سے نہیں آتی...... رُوحانیت چلہ کاٹنے سے بھی نہیں آتی...... یہ مجاہدہ کرنے سے آتی ہے اور مجاہدہ اپنے اُوپر پابندیاں نافذ کرنے کا نام ہے...... جب آپ اپنے نفس سے جہاد کرتے ہیں، اُس سے لڑتے ہیں تو یہ مجاہدہ ہے۔

روزہ خواہ نفلی ہو یا فرض، کوشش یہی کرنی چاہیے کہ ہمارا روزے کا دن عام دنوں سے مختلف ہو...... روزہ میں یہ سب احتیاطیں لازم ہیں۔

سوال: بچوں کے نام عموماً استخارہ کر کے رکھے جاتے ہیں، اِس کے باوجود نام تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

جواب: جب ہم استخارہ کرتے ہیں تو دیکھنا یہ ہوگا کہ اُس وقت ہماری رُوحانی کیفیت کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ کہیں ہم Tension کا شکار تو نہیں۔ ایک شخص جو Frustrated ہے، کون جانے کہ اُس کو رات میں نظر آنے والا خواب وسوسہ تھا یا اطلاع؟ امکان تو یہی ہے کہ وہ وسوسہ ہوگا؟ فرسٹریشن کے نتیجے میں یا تو ہمارا Defence system ہماری فرسٹریشن کو ختم کرنے کے لیے خواب میں خوش فہم چیزیں دکھا رہا ہوگا۔ یہ بھی اللہ کی رحمت ہے کہ جب ہماری ذہنی ٹینشن اِتنی بڑھ جائے کہ وہ ہمارے سسٹم پر اثر انداز ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ایسے خواب دکھا دیتا ہے...... اُن خوش آئند خوابوں سے ہماری ٹینشن Release ہو جاتی ہے۔ اِس کا ایک اور رنگ بھی ہے...... ادھوری خواہش جو ہمارے لیے بے پناہ ذہنی دباؤ کا سبب بن جائے خواب کے ذریعے وہ خواہش یا تمنا پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے اور یوں وہ پریشانی یا ذہنی دباؤ ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس Tension کے خاتمہ کے لیے ایک اور رنگ ہمارے اندر رکھا ہے اور وہ ہے Day dream انسان چلتا جا رہا ہے سوچتا ہوا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوتا ہے جس سے اِس کی Tension ختم ہونے لگتی ہے۔

خواب رات کے کس حصہ میں دیکھا، اِس کا تعبیر سے بہت گہرا تعلق ہے...... اگر اِن چیزوں کو جانے بغیر خواب کی تعبیر جاننے کی کوشش کریں تو بعض اوقات ہم غلط نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ استخارہ اگر کسی نیک آدمی نے کیا ہے تو اُس کو ملنے والی Indications عموماً ٹھیک ہوں گی۔

سوال: درودِ ابراہیمی میں آپ ﷺ، آپ ﷺ کی آل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر جن برکتوں کا ذکر ہے، اُس سے کیا مراد ہے۔

جواب: ربِ تعالیٰ خود کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ کام کرنے کا سوچتا ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صرف ایک ہی مصروفیت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے محبوب ﷺ پر درود بھیجتا ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں...... ہم Innocently ایک گستاخی کرتے رہتے ہیں (کوئی اتنا گیا گزرا نہیں کہ جان بوجھ کر ایسا کرے۔ ہم معصومیت میں ایسا کر بیٹھتے ہیں۔)

ہم جب نوافل پڑھتے ہیں تو Innocently کہتے ہیں کہ یا اللہ! اِن نوافل کا ثواب ہم نے آپ ﷺ کی رُوح کو بخشا۔ یاد رکھیے کہ آپ ﷺ کا مقام اتنا بلند ہے کہ ہماری تو یہ حیثیت ہی نہیں کہ ہم آپ ﷺ کو کوئی چیز یا ثواب بخش سکیں۔ سرِدست جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں کوئی چیز بطور نذرانہ پیش کر دیں...... وہ بھی اگر اجازت ہو جائے تو۔ وہ بارگاہ اِتنی بلند ہے کہ وہاں تک ہماری رسائی ممکن ہی نہیں۔ یہ تو سراسر آپ ﷺ کی مہربانی ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہر اُمتی کو رحمت ہی کی

نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہماری یہ مجال نہیں کہ اُس بارگاہ میں اجازت کے بغیر ہم حاضری دے سکیں۔ یہ آپ ﷺ کی عنایت ہی کے سبب ممکن ہے۔ اگر ہم نوافل پڑھ کر اس کا ثواب آپ ﷺ کی رُوحِ مبارک کو پہنچانا چاہتے ہیں تو اِس کے لیے ہمیں یوں عرض کرنا ہوگا ''یا اللہ! میں نے یہ جو تیرے نام کے نوافل پڑھے، یہ تیرے اور تیرے پیارے محبوب ﷺ کے حضور بطور نذرانہ پیش کیے...... تو اِنھیں اپنی بارگاہ میں قبول فرمالے۔''

ہمارا یہ انداز ظاہر کرے گا کہ ہم اُس بارگاہ کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہیں...... شہنشاہ اور بادشاہ جتنا بڑا ہوگا، حاضری کے آداب اُسی قدر سختی سے پورے کیے جائیں گے۔ جب ہم کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے...... کچھ نہ کچھ نذرانہ لے کر جاتے ہیں۔ آپ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بڑی ہستی ہیں۔ آپ ﷺ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا...... آپ ﷺ بالکل معصوم ہیں۔ وہ تو خود تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں تو ہم آپ ﷺ کی خدمت میں کیا پیش کر سکتے ہیں......؟ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں نوافل کا ثواب بطور نذرانہ پیش کر دیں۔

رب تعالیٰ جب آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو وہ Out of love and affection ایسا کرتا ہے۔

فرشتے آپ ﷺ پر Out of respect درود بھیجتے ہیں۔

اُمتی جو درود پاک آپ ﷺ پر بھیجتے ہیں وہ Out of gratefulness ہے۔ یہ اظہارِ تشکر اِس لیے کہ آپ ﷺ نے ہمیں اللہ کے سچے دین سے روشناس کرایا۔

آپ ﷺ پر درود شریف بھیجنا ایک عملِ مسلسل ہے...... یہ جاری و ساری ہے۔ اِسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی آل پر درود بھیجنے کا عمل بھی جاری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل کون ہیں؟ خود آپ ﷺ اُن کی آل ہی تو ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں سے آل چلی اور دونوں طرف پیغمبر آئے۔ اُن پر مسلسل سلامتی اور درود بھیجا جا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک زمانہ میں درود بھیجا جاتا رہا اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے...... بلکہ یہ عملِ مسلسل ہے۔

سوال: نورِ نبوت کیا ہے؟

جواب: نبوت کے نتیجے میں جو تعلیم پھیلی اور آپ ﷺ نے جو وحی ہم تک پہنچائی، وہی نورِ نبوت ہے۔

سوال: اُصولِ ملکیت سے کیا مراد ہے؟ فلسفۂ قربانی اور اُصولِ ملکیت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

جواب: جتنی زمین آپ خود کاشت کر سکتے ہیں وہ آپ رکھ سکتے ہیں۔ زائد زمین دوسرے مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

اسلام کی بنیادیں رُوحانی اور اخلاقی کیفیات پر مبنی ہیں۔ یاد رکھیے کہ اسلام کی اساس ایثار و قربانی پر ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے بارے میں

سوچنے لگتا ہے۔ عفو و درگذر کیا ہے؟ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر اگر نظر ڈالیں تو تمام صفات بدرجۂ اتم دکھائی دیتی ہیں لیکن اِن میں بھی عفو و درگذر اور تحمل و برداشت کی صفات بے حد نمایاں ہیں۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ عملی قرآن ہے۔ اسلام کے ہر حکم اور تلقین کی تہ میں ایثار و قربانی ہی نظر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو تین چیزیں بہت پسند ہیں۔

1۔ کسی غلام یا قیدی کی رہائی...... موجودہ دور میں ایسے قیدی جو جرمانہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ان کا جرمانہ ادا کر کے ہم اُن کو رہائی دلا سکتے ہیں۔

2۔ کسی مقروض کا قرض ادا کرنا۔

3۔ کسی مسافر یا بھوکے کو کھانا کھلانا۔

اِن تینوں چیزوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ پوشیدہ ہے کہ ہم اپنی محنت کی کمائی دوسروں پر خرچ کر دیں۔

ایثار اور قربانی میں کیا فرق ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس سو روپے ہیں، اُن میں سے پچاس روپے وہ اپنی ضرورت کے لیے رکھ لیتا ہے اور بقیہ پچاس روپے کسی مسلمان بھائی کو دے دیتا ہے تو یہ ایثار ہے اور اگر وہ سو کا سو ہی کسی حاجت مند کو دے دے اور کہے کہ میرا اللہ وارث ہے...... تو یہ قربانی ہے۔

آپ کا پڑوسی آپ کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ تحمل و برداشت سے کام لے رہے ہیں۔ اُف نہیں کرتے۔ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ آپ کو اپنے پڑوسی کے رویے سے کیا نقصان ہو رہا ہے...... یہ قربانی ہے۔ ہم خود بھوکا رہ کر پڑوسی کو کھانا کھلا رہے ہیں...... یہ قربانی ہے۔ جب ہمارے ذہن میں اسلام کا بنیادی فلسفہ جو ایثار و قربانی پر مشتمل ہے واضح ہو جاتا ہے تو پھر اسلام کا اُصولِ ملکیت بھی ہمیں سمجھ آنے لگتا ہے۔ ہم محنت کر کے پیسہ کماتے اور جائداد حاصل کرتے ہیں لیکن جب وہ جائداد ہماری ضرورت سے زائد ہو جائے تو ہم وہ دوسرے مسلمانوں کو دے دیں گے۔ زمین بھی اِسی حکم کے تحت آتی ہے کہ زمین کا وہ ٹکڑا جو ہم خود کاشت کر سکتے ہیں وہ اپنے پاس بطورِ ملکیت رکھ لیں اور زائد زمین دوسروں کو کاشت کاری کے لیے دے دیں۔ اسی طرح ضرورت سے زائد مکان بھی ہم اپنے مسلمان بھائی کو دے دیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ یہ سب Beyond the call of duty والی بات ہے۔ یہ تکمیلِ فرض کی نہیں بلکہ اللہ کو راضی کرنے کی بات ہے کیونکہ اگر ایک شخص کفایت شعاری اور عقل مندی سے اپنی آمدنی خرچ کرتا ہے اور بُرے وقت کے لیے کچھ رقم جمع کر لیتا ہے تو یہ بھی غلط نہیں کیونکہ اگر اس کی اجازت نہ ہوتی تو پھر قانونِ وراثت بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ قانونِ وراثت کا اِطلاق اُس جائداد پر ہوتا ہے جو انسان مرتے وقت اپنے لواحقین کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

جب فرائض سے بڑھ کر کوئی عمل کیا جاتا ہے تو یہ بہت پسندیدہ اور پاکیزہ عمل ہے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے، اپنی ضرورت کے مطابق اپنے پاس رکھ کر زائد کو ضرورت مند مسلمانوں میں تقسیم کر دیجیے کیونکہ فقیر خالی ہاتھ اور خالی جیب کے ساتھ رات کو سوتا ہے۔ لیکن بُرے وقت کے لیے بچا کر رکھنا بھی مسلمان کی فراست ہے

تاکہ مستقبل میں اگر کوئی اچانک ضرورت درپیش ہو، اولاد کی شادی کا معاملہ ہو تو لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔ اللہ کے ہاں یہ ناپسندیدہ ہے کہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے۔ اگر آپ بچت نہیں کریں گے تو آڑے وقت میں اپنی ضروریات کیسے پوری کر پائیں گے......؟ لیکن اگر آپ رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے Beyond the call of duty والے فارمولے پر عمل کر رہے ہیں تو پھر آپ اپنے لیے رب ہی کو کافی سمجھتے ہوئے ضرورت سے زائد مال و دولت اور چیزیں اپنے مسلمان بھائیوں میں بانٹ دیجیے۔

سوال: ماہِ رمضان کی برکات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جواب: عام دنوں میں بالعموم اور ماہِ رمضان میں بالخصوص اوامر و نواہی پر بڑی سختی سے عمل کریں۔ روزے کے آداب کا خیال رکھیں گے تو اُس کا اجر بڑھ جائے گا آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ہم اِس ماہِ مبارک میں سخاوت بہت بڑھادیں اور عفو و درگزر کی صفات بھرپور طریقے سے اپنالیں۔ اپنا مال و زر کم وسائل کے حامل لوگوں پر لٹادیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں ماہِ رمضان کے فیوض و برکات سے نواز دے گا۔

سوال: قبائلی علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، اِن حالات میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے؟

جواب: اِن حالات میں ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مسلمانوں نے غزوۂ بدر، اُحد اور خندق میں کیا۔ اِن غزوات میں مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں تھے، اُن کے پاس مادی وسائل بے حد کم تھے لیکن جب کفار نے اُن کے گرد گھیرا تنگ کیا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے کفار کی بڑی تعداد کے سامنے بھرپور ایمانی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہی سب آج ہمیں کرنا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا، وہ جنت میں جائے گا اِس کی وضاحت فرمادیجیے۔

جواب: کلمہ پڑھنے کے ساتھ اسلام کے بنیادی ارکان پر عمل کرلیا جائے تو یہ ایمان کی ابتدائی Stage ہے اور اِس پر عمل پیرا انسان بخشا جائے گا۔ جس شخص نے سچے دل سے اللہ کو وحدہ لاشریک مانا اور آپ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی مان لیا وہ انشاء اللہ تعالیٰ بخش دیا جائے گا۔ اخلاص بہرحال بنیادی شرط ہے۔

علم الغیب اور عالم اسرار

سوال: کہا جاتا ہے کہ دوستی پیاز کی مانند ہے اس کی وضاحت فرمادیجیے۔

جواب: حضرت علیؓ نے پیاز کو تشبیہ دی تھی دوستی سے کہ دوستی پیاز کی مانند ہے۔ پیاز کے مختلف پرت ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے جڑے رہتے ہیں اُنھیں کسی اور Bond کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اگر آپ اس پیاز کو کاٹ دیں تو سوائے آنسوؤں کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ میرے خیال میں دوستی کی اِس سے زیادہ خوب صورت تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

سوال: علم الغیب کی کتنی اِقسام ہیں اور علم لدنی میں حروف مقطعات کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: اللہ کے نور کے سمندر سے نہریں نکلی ہیں اور اُن نہروں سے علوم پھوٹے ہیں۔ ان نہروں میں سے چار صرف اللہ کے لیے مختص ہیں۔ اِن میں سے ایک علم الغیب ہے جو صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے ہاں البتہ وہ جسے جتنا چاہے یہ علم عطا کر دیتا ہے۔

دُنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب جس کے آثار مصر میں ملے ہیں اور ماہرین آثارِ قدیمہ اُن کی ترقی پر حیران ہیں، اُن کے پاس چھپن ہزار (56,000) علوم تھے۔ ہم جو اپنے آپ کو آج بہت ترقی یافتہ تصور کر رہے ہیں ہمارے پاس صرف آٹھ ہزار ایک سو گیارہ علوم ہیں۔ لیکن وہ قوم چھپّن ہزار علوم جانتی تھی۔ شاید وہ قوم علم کی زیادتی کی وجہ سے بھٹکی۔ اُس پر عذاب نازل ہوا اور وہ تباہ کر دی گئی۔

جس طرح کل علوم میں سے چھپن ہزار علوم اُس مصری قوم کے علم میں آ گئے اِسی طرح علم باطن کی ایک سو اٹھارہ (118) اقسام ہیں (علم باطن یا علم لدنی تمام علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے) جن میں سے علم غیب کی چار اقسام کے علاوہ بقیہ 114 نہریں اللہ تعالیٰ انسان کو کسی نہ کسی انداز میں عطا کرتا ہی رہتا ہے کیونکہ انسان بہر حال زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔

کچھ لوگوں کی طرف سے یہ نکتہ اُٹھایا جاتا ہے کہ انسان کو یہ سب کچھ کیوں عطا ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے دُنیاوی نظام میں حکم تو محکمہ کے سربراہ کا چلتا ہے لیکن اُس سربراہ کا نمبر ٹو (2) بھی بے اختیار نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ تو سب سے اعلیٰ اور سب سے بہتر ہے، منصف بھی ہے تو وہ اپنے خلیفہ کو کیسے بے اختیار کر

دیتا...... اِس لیے اُس نے علمِ غیب کا کچھ نہ کچھ حصہ انسان کو عطا فرمایا۔ جو انسان پارسائی اور نیکی کے جس مقام پر ہے اُسے اللہ تعالیٰ نے اُسی لحاظ سے علم الغیب عطا فرمایا ہے۔

علم الغیب کی پہلی قسم تو علم الغیب الہامی ہے۔ یہ عام طور پر پیغمبروں کو عطا ہوتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام اکٹھے ہوئے تو حضرت خضر علیہ السلام کو کشتی میں سوراخ کرنے کا حکم ہوا، اُنھوں نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ یہ حکم صادر ہوا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے سوال پوچھے اور ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگروں کے مقابلہ پر جو عصا پھینک دینے کا حکم ہوا تھا، وہ علم الغیب الہامی ہی تھا۔

علم الغیب کی دوسری قسم علم الغیب القائی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا۔

علم الغیب کی تیسری قسم علم الغیب امتناعی ہے۔ اِس طریقہ سے اطلاعات کسی شخص کو اُس وقت بہم پہنچائی جاتی ہیں جب کسی صاحبِ علم کے اندر اِس وجہ سے جلال کی کیفیت پیدا ہو جائے کہ کوئی اُسے Challenge کر دے، للکار دے یا اُس کا شدت سے انکار کرنے لگے۔ تب جلال میں آنے کی وجہ سے اُس صاحب علم سے جو معجزات یا کرامات سرزد ہوں گی وہ علم الغیب امتناعی کے زمرے میں آئیں گی۔ علم الغیب کی چوتھی قسم علم الغیب عطائی ہے۔ یہ قسم مشروط ہے دُعا اور رضا کے ساتھ کہ کوئی صاحب علم دُعا کرے اور دُعا سننے والا اُس کی دُعا قبول کر لے۔ اِس کے نتیجہ میں جو معجزہ یا کرامت سرزد ہوگی وہ علم الغیب عطائی کے زمرے میں آئے گی۔ جس طرح آپ ﷺ نے دُعا فرمائی، وہ قبول ہوئی اور آپ ﷺ نے اُنگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے۔

علم الغیب کی یہ چاروں اِقسام آپ ﷺ کو عطا ہوئیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دین کو مکمل کرنا تھا۔ قرآنِ پاک کے نزول کے بعد دین کا سلسلہ مکمل ہو گیا تھا اور کسی نبی کی مزید ضرورت نہیں رہی تھی۔ آپ ﷺ نبی آخر الزماں ہیں۔ چونکہ دین کو مکمل کیا جانا تھا اِس لیے اِس سے منسوب تمام علوم کو بھی مکمل کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ علوم آپ ﷺ کے پاس ہیں۔ ہم جب وجہ بیان کیے بغیر محض عقیدت کے تحت یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس یہ تمام علوم تھے تو غیر مسلم عموماً اس بات پر قائل نہیں ہوتے لیکن جب ہم اُنھیں یہ دلیل دیتے ہیں کہ آپ ﷺ دین اور علوم دونوں میں مکمل تھے...... اس کی وجہ یہ ہے کہ دین مکمل کر دیا گیا اور قرآن پاک اور دین کے نزول کے بعد آپ ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے کی دلیل بھی یہی ہے کہ دین کی تکمیل کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہ رہی۔

ایک اور علم بھی ہے جو کائنات کو چلائے رکھنے کی کنجی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ کاروبار کائنات اس محور پر کام کر رہا ہے، وہ کارخانہ قدرت کا Essence ہے۔ یہ حروف مقطعات کا علم ہے جو کلی طور پر آپ ﷺ کو عطا کر دیا گیا۔ اِس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ علم سکھایا گیا تھا۔ قران پاک میں بھی اس کا ذکر ہے اور اسے علم الاسماء کہا گیا ہے۔ یہ دراصل حروف مقطعات ہی کا علم تھا۔

علم حروف مقطعات علم لدنی میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی صاحبان علم گزرے ہیں اُن سب کے پاس علم حروف مقطعات ہوتا تھا۔ کشف و کرامات کا تعلق بھی براہِ راست علم حروف مقطعات سے ہے۔ مستجاب الدعوات ہونے کا تعلق بھی اس علم سے ہے۔ لیکن اس میں بنیادی چیز اللہ کی رضا ہے...... اگر اللہ چاہے تو ہی یہ ممکن ہے ورنہ آپ حروف مقطعات جس ترتیب سے بھی پڑھ لیں، کچھ حاصل نہیں ہو گا...... رب کچھ دینا چاہے گا تو ہی عطا ہو گا۔

حروف مقطعات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی...... لیکن اگر ہم محنت کرتے رہیں، نیکی کو اپنا شیوہ بنالیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید واثق ہے کہ اپنے مہربان اور رحمٰن و رحیم ہونے کے صدقے ہماری ذراسی کوشش کے جواب میں وہ انعامات کے منہ کھول دے گا۔ اگر ہم نیکی کی راہ پر چلتے رہیں تو اللہ ہم پر ضرور رحم اور فضل کرے گا اور ہمیں علومِ باطنی سے نواز دے گا۔ جب علومِ باطنی عطا ہوتے ہیں تو علم حروفِ مقطعات خود بخود عطا ہو جاتا ہے۔ جب یہ علم عطا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کی نظر آسمانوں پر جاتی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ سات زمینیں اور سات آسمان ہیں۔ کچھ لوگ سات براعظموں کو سات زمینیں قرار دیتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

جوب: سات براعظموں کو سات زمینیں قرار دینا درست نہیں کیونکہ یہ سات براعظم اِسی Planet earth کا حصہ ہیں اور اِن کے نظام کو چلائے رکھنے کے لیے اِن کے حاکم اِسی زمین کے اولیائے کرام ہیں۔ آسمان بہرحال سات ہی ہیں اور ہر آسمان کے حاکم مختلف پیغمبر اور ایڈمنسٹریٹو فرشتے ہیں۔ جس طرح سات آسمان تہ در تہ ہیں اِسی طرح زمین کے بھی سات پرت ہیں اور یہ بھی تہ در تہ ہیں۔ اِن پر مخلوق کا ذکر ہم کتابوں میں بھی پڑھتے ہیں۔ اِس کائنات میں ستر ہزار جہان اور بیس ہزار عالم ہیں۔ اللہ کا امر زمینوں اور آسمانوں تک محدود نہیں بلکہ تمام جہانوں اور عالمین تک ہے اور ہر ہر ذرے میں اللہ کا امر جاری و ساری ہے۔ عام طور پر سائنس دان اللہ کے منکر (Atheist) ہوتے ہیں لیکن حال ہی میں اُنھوں نے ایک ذرہ دریافت کیا ہے جو Further تقسیم نہیں ہو پا رہا۔ اِس ذرے کی Omnipresence سائنس دانوں نے Discover کر لی ہے اور اِس سے نکلنے والی Energy بے پناہ ہے۔ اُن سائنس دانوں کا کہنا یہ تھا کہ اِس ذرہ کی دریافت سے (معاذاللہ) اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کو Discover کر لیا ہے اُس اللہ کو جس کا قرآن میں ذکر ہے کہ وہ ہر جگہ موجود اور Omni-present ہے۔

سوال: "رب زدنی علما" علم کے حصول کے لیے اس دُعا کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: رب تعالیٰ نے جتنی ارواح پیدا کیں، اُن کی کیمسٹری ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر رُوح ایک مختلف حرف کے تحت پیدا ہوتی ہے جیسے تخلیقِ کائنات کا Key word کُن ہے۔ اِسی طرح ہر رُوح کا Key word مختلف ہے۔ ہر رُوح کا رنگ اور خوشبو مختلف ہے۔ چونکہ ہر رُوح کی کیمسٹری مختلف ہے اس لیے جب ہم کسی قرآنی لفظ، آیت یا سورۃ کو ایک مخصوص وقت میں، مخصوص تعداد اور انداز میں پڑھتے ہیں تو اس کے

اثرات رُوح کی کیمسٹری کے مطابق ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں...... لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں وظیفہ کے اثرات سب پر یکساں مرتب ہوں گے، درست نہیں۔ ہر وظیفہ کا اثر ہر رُوح پر مختلف ہو گا اس لیے کہ General statement نہیں دی جا سکتی کہ اِس دُعا کا سب پر کیا اثر ہو گا...... البتہ اِس کا ایک اثر سب پر مشترک (common) ہے۔ اگر وظیفہ ذکرِ الٰہی کا حصہ ہے تو اُس کا ذکر کرنے سے رب تعالیٰ بھی متوجہ ہو گا اور ثواب بھی ملے گا لیکن اِس دُعا کا اثر Soul to soul اور Man to man مختلف ہوتا چلا جائے گا۔

سوال: کیا تمام علوم کی Ultimate منزل اللہ کی ذات کو پہچاننا ہے؟

جواب: جیسا کہ آپ جانتے ہیں جب کسی رُوح سے متعلقہ جسم زمین پر تیار ہو جاتا ہے تو اُس کو زمین کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ روانگی کے وقت اُسے مینڈیٹ (Mandate) دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھے گی۔ جب وہ رُوح اپنے جسم میں داخل ہوتی ہے تو پھر وہ انسان اگر سرسری انداز میں بھی اپنے خالق کی طرف رُجوع رکھے تب بھی رب تعالیٰ اُسے قبول کرتا ہے اور اِس کا انعام اُسے گھر کی آسائش کی صورت میں عطا کرتا ہے۔

جو رُوح زیادہ شدت سے رب کی طرف رُجوع کرتی ہے، اُسے انعام کے طور پر دُنیا کا مال و زر اور عیش و عشرت عطا کیا جاتا ہے۔ جو رُوح اِس سے بھی زیادہ شدت سے اپنے مالک کی طرف رُجوع رکھتی ہے، اُسے علم عطا کیا جاتا ہے اور جو رُوح کلیتہً اپنے رب کی ہو کر رہ جاتی ہے، اُسے فراست (Wisdom) عطا کی جاتی ہے اور Essence of Wisdom خود رب ہے۔ اِس لیے آپ ﷺ کا فرمان ہے ''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔'' فراست سے مراد عقل بھی ہے۔ جب کسی کو علم حاصل ہوتا ہے اُسے عقل حاصل ہوتی ہے اور عقل کے حصول کے بعد انسان کو اچھے اور بُرے کی تمیز کرا دی جاتی ہے اور جسے اچھے بُرے کی پہچان کرا دی جاتی ہے اُسے رب کی پہچان کرا دی جاتی ہے۔ تو علم باعثِ حصولِ عقل ہے اور عقل رب تک لے جاتی ہے۔

سوال: سورۃ الکہف میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں علمِ لدنی کا ذکر ہے۔ آپ کے پاس آ کر ہمیں بھی بہت سے سوالوں کے جوابات ملتے ہیں۔ آپ کے پاس جو علم ہے کیا وہ بھی اسی علم کی کوئی شکل ہے؟

جواب: اللہ مجھے معاف فرمائے! آپ نے میرے بارے میں کیا گمان کر لیا! میں صاحبِ علم ہوں نہ صاحبِ عقل...... میں آپ کو نہایت سچائی سے بتا رہا ہوں کہ میں اُمی مطلق اور جاہلِ مطلق ہوں۔

حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی جہاں تک بات ہے تو کسی کے پاس اُتنا ہی علم عطا ہوتا ہے جتنا اللہ اُسے عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کارخانۂ قدرت کو چلائے رکھنے کے لیے حضرت خضر علیہ السلام کو اُن تمام سوالوں کے جواب کا علم عطا فرما دیا جو اُن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیے تھے۔

اللہ نے دُنیا میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیہم السلام بھیجے جن میں سے چالیس کا ذکر قرآن

مجید میں بھی موجود ہے۔ یہ سب پیغمبر اُمی تھے...... دُنیاوی علوم سے بے بہرہ۔ چونکہ دُنیاوی اُستاد خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ اُس کا علم اور عقل دونوں ناقص ہوتے ہیں۔ اِس لیے کسی دُنیاوی اُستاد کے ذریعہ پیغمبروں علیھم السلام کی تعلیم کا انتظام کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ اُنھیں اِن پڑھ رکھتا ہے اور وقت آنے پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اُنھیں خود علم سکھاتا ہے...... کیونکہ اُمت کے لیے نبی یا رسول کا ہر لفظ اور فعل دلیل بنتا ہے۔ جب انبیا کو وحی یا الہام کے ذریعہ علم سکھایا جاتا ہے تو وہ علم کسی بھی غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ نبی یا رسول کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اور سرزد ہونے والا ہر فعل من جانب اللہ ہوتا ہے۔ اسی لیے انبیا معصوم کہلاتے ہیں۔ اللہ کے عطا کردہ علم ہی کے ذریعے وہ اُمت کے سوالوں کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بھی اُسی علم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوالوں کے لیے بطور جواب استعمال کیا...... اِسی لیے اُن کے جوابات بہت جامع اور مکمل تھے۔

سوال: آپ جس علم کے ذریعے ہمیں جواب دے رہے ہیں، یہ کون سا علم ہے؟ کیا یہ رُوحانیت کا علم ہے؟

جواب: اِس علم کا نام ہے اٹکل پچو۔ کئی مواقع پر میں نے ذکر کیا تھا کہ اگر آپ مجھ سے پوچھیں اور میں سچ بولنے پر آمادہ ہو ہی جاؤں تو وہ سچ یہ ہوگا کہ میں مداری ہوں جو ڈگڈگی ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے۔ لوگوں کو کھیل تماشا دکھا کر اردگرد اکٹھا کر رہا ہے تاکہ لوگ مجھے سلام کریں۔ اِس سے میرا نفس پھلتا پھولتا ہے......اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے ڈھونگ یہ سب رچایا ہے۔ اِس ڈھونگ کو قائم رکھنے کے لیے جب آپ میں سے کوئی مجھے بیعت کے لیے کہتا ہے تو میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں کیونکہ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں تو خود اُمی ہوں کسی کو کیا علم سکھاؤں گا......! آپ بامروت لوگ ہیں، میرے اٹکل پچو جواب چپ چاپ سن لیتے ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ جب چاہے پلک جھپکنے میں ہر کام ہو جائے۔ پھر کائنات کی تخلیق چھ راتوں اور سات دنوں میں کیوں؟

جواب: قرآن پاک میں دو طرح کی آیات ہیں:

1۔ بینات

2۔ متشابہات

اِسی طرح جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو کچھ باتیں محاورتاً اور کچھ واقعتاً کہہ رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے ملازم سے کہتے ہیں کہ فلاں چیز بازار سے پلک جھپکنے میں لے آؤ۔ تو وہ حقیقتاً پلک جھپکنے میں تو نہیں واپس آجائے گا۔

بلاشبہ رب تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو فوری طور پر کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو توڑتا نہیں۔ یاد رکھیے! اللہ کے ہاں Evolution (ارتقا) ہے Revolution (انقلاب) نہیں۔ اللہ کے تمام کام Based on evolution ہیں...... جیسے ایک مثال تو آپ نے خود دے دی کہ یہ کائنات چھ راتوں اور سات دنوں میں تخلیق ہوئی۔ پہاڑ سینکڑوں صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ بیج

سے درخت بننے اور اُس پر پھل آنے میں ایک طویل وقت لگتا ہے۔ دن اور رات بدلتے ہیں...... اندھیرا بتدریج پھیلتا ہے...... اُجالا بتدریج ختم ہوتا ہے۔ جب صبح نمودار ہوتی ہے تو آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹتا اور سویرا آتا ہے۔ موسم بدلتے ہیں۔ اِس میں بھی ایک تدریج ہے، یکلخت یہ تبدیل نہیں ہوتے۔ اللہ کے ہر کام میں ایک تدریج ہے۔ اُس کا کوئی کام بھی abrupt اور یک لخت نہیں ہوتا۔ ایک چیز جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ جو چیز وجود میں آنے میں جتنا طویل وقت لیتی ہے، وہ اُتنی ہی مضبوط ہوتی ہے...... جیسے پہاڑ کئی سو صدیوں میں بنتے ہیں، مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ اُنھیں توڑنا محال ہوتا ہے۔ اِسی طرح ہاتھی ہے اُس کا Gestetion time دو سال ہے۔ آپ اُس کا جثہ اور طاقت دیکھ لیجیے۔ گھوڑے کا Gestetion time ایک سال ہے اس کی طاقت دیکھ لیجیے۔ انسان کا Gestation time نو مہینے ہے اس کو دیکھ لیجیے۔ جبکہ خرگوش کا Gestation time اکیس دن ہے، وہ اِتنا کمزور ہوتا ہے کہ بعض اوقات خوف سے اُس کا دل بند ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ خرگوش کا Life span کم ہوتا ہے۔ اللہ کے کاموں میں پائیداری اور تدریج ہمیں نظر آئے گی اور تدریج کے مختلف مراحل کے مشاہدے میں انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ وہ پلک جھپکنے میں ہر کام کر سکتا ہے تو اِس سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز اُس کی قدرت سے باہر نہیں...... وہ جب چاہے، جو چاہے کر دے۔

سوال: کچھ دُعائیں بہت تاخیر سے پوری ہوتی ہیں۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: دُعا کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ نے فرمایا ''میں دُعا کا سننے والا ہوں۔'' یا یہ فرمایا ''میں دُعا قبول کرنے والا ہوں۔'' اب دُعا کو سننے، قبول کرنے اور پورا کرنے میں فرق ہے۔ اللہ دُعا کو سنتا اور قبول کر لیتا ہے لیکن وہ دُعا پوری اُس وقت ہوتی ہے جب وہ رب تعالیٰ کے کارخانۂ قدرت میں اور نظامِ کائنات میں Fit ہو رہی ہو۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ میں آپ کے پاس آ کر کہوں کہ میں فلاں محکمہ میں کلرک ہوں۔ میری ترقی تو کروا دیجیے۔ آپ مجھے پکڑ کر محکمے کے سربراہ کے پاس لے جاتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں۔ سربراہ آپ کو تسلی دیتا ہے کہ بے فکر ہو کر تشریف لے جائیے، اِن کی ترقی کر دی جائے گی۔ بعد میں باس ایڈمنسٹریشن انچارج کو بلا کر میری ترقی کی ہدایت جاری کرتے ہیں۔ انچارج سارا حساب کتاب لگانے کے بعد بتاتا ہے کہ اِس بجٹ میں Provision نہ ہونے کے سبب یہ ترقی نہیں ہو سکے گی۔ اگلے مالی سال کے بجٹ میں اس پروموشن کی Financial provision رکھ کر یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ اب میں چونکہ اِن سارے مراحل سے ناواقف ہوں اِس لیے بار بار پریشان ہو کر آپ کے پاس آتا ہوں اور آپ کے کان کھاتا ہوں کہ آپ کی سفارش کے باوجود اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میری ترقی نہیں ہوئی۔ انہی شکوہ شکایات اور اُمید و نا اُمیدی کی کیفیت میں جولائی کا مہینا آ جاتا ہے۔ نئے مالی سال کا بجٹ آتا ہے جس کو Release ہوتے ہوتے ماہِ ستمبر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تب مجھے Promotion letter مل جاتا ہے اور میں مسکراتے چہرے کے ساتھ آپ کے پاس آتا ہوں کہ صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہتے تھے کہ آپ کی ترقی ہو جائے گی...... آج

میری پروموشن ہوگئی ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ سفارش کے سُن لینے، مان لینے اور اُس کے پورا ہونے میں کتنا ٹائم لگ گیا۔ حالانکہ سفارش کرنے والے صاحب کی نیت بھی درست تھی، نیت سفارش سننے والے کی بھی درست تھی لیکن کچھ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے معاملات میں Delay (تاخیر) آیا لیکن بالآخر کام ہمارا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اِس نظامِ کائنات کو Delicate balance پر چلا رہا ہے۔ وہ اِس میں رخنہ نہیں ڈالتا۔ وہ آپ کا کام اُس وقت کرے گا جب وہ اُس کے نظام میں Fit ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پلک جھپکنے میں ہر کام کرنے پر قادر ہے لیکن وہ کرے گا اُسی وقت جب وہ کام کائنات کے نظام میں خلل ڈالنے کا باعث نہیں بنے گا۔

انٹرویو

شخصیت: سرفراز اے شاہ

پینل: غلام محی الدین، محمد عامر ہاشم خاکوانی

عامر خاکوانی: رُوحانیت سے کیا مراد ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ''رُوحانیت'' جیسا کہ اپنے لفظ اور نام سے پوری طرح عیاں ہے کہ اِس کا تعلق انسانی رُوح سے ہے۔ جس طرح ہمارے جسم کی غذا مادی خوراک ہے، اچھی خوراک سے جسم صحت مند رہتا ہے اِسی طرح رُوح کی غذا Moral values (اخلاقی اقدار) ہیں۔ اسلام سے زیادہ Moral values کسی اور مذہب نے متعارف نہیں کروائیں۔ اگر ہم Moral values پر عمل کرتے ہیں تو ہماری رُوح ترقی کرے گی۔ رُوح کی ترقی درحقیقت اِس دُنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جو شخص رُوحانی طور پر جس قدر تندرست ہوگا اُس کی Moral values اُتنی ہی زیادہ بہتر ہوں گی اور جتنی کسی شخص کی Moral values اچھی ہیں وہ دُنیا و آخرت میں اُسی قدر کامیاب ہے۔ اِسی لیے تمام فقرا Moral values اور حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں حقوق العباد کی ادائیگی اُس حد سے ذرا زیادہ ہے جو اُن پر فرض ہے۔ آخرت میں بھی اِس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بے حد مہربان ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میں اپنے حقوق تو معاف کر دوں گا لیکن حقوق العباد اُس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک وہ بندہ خود معاف نہ کر دے۔

رُوحانیت دراصل رُوح کی ترقی کو کہتے ہیں یعنی وہ معاملات جن کا تعلق رُوح سے ہے۔ انسان بعض اوقات حقوق العباد کی ادائیگی میں دقت محسوس کرتا ہے کیونکہ اُن کی ادائیگی میں قربانی زیادہ ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ قربانی سے دُور بھاگتا ہے لہٰذا اِس دقت پر قابو پانے کے لیے وہ عبادات کا سہارا لیتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عبادت سے پارسائی آتی ہے اور نیکی سے رب ملتا ہے۔ عبادات سے جو پارسائی ملتی ہے وہ ہمیں قوت اور ڈسپلن عطا کرتی ہے کہ ہم نیکی کی راہ پر چل سکیں...... اِسی کا نام رُوحانیت ہے۔

عامر خاکوانی: کیا رُوحانیت ماضی کی نسبت آج کے دور میں زیادہ Organised ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: آج کل تو نہیں...... لیکن ماضی میں یہ سلسلہ بہت Organised تھا۔ تب خانقاہی نظام رائج تھا جہاں تزکیۂ نفس کی مشقیں کرائی جاتی تھیں۔ تزکیۂ نفس کے بعد حقوق العباد کی ادائیگی کے طور طریقے اور آداب سکھائے جاتے تھے...... فرض اور نفلی عبادات کے ذریعے لوگ Strength derive کرتے اور اس Strength کے ذریعے تزکیۂ نفس کرتے تھے جس سے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد صحیح طریقے سے ادا کرنے کے قابل ہو جاتے۔

پھر کچھ لوگوں نے ایسا معمول بنا لیا جس سے بظاہر یہ لگتا تھا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے لیکن کچھ بزرگانِ دین جیسے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اولیاء اللہ کی زندگیاں اتباعِ سنت کا نمونہ تھیں۔ وہاں سنتِ رب اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ خانقاہی سسٹم واقعتاً اپنے اندر ایک Institute تھا اور اُس کا سلیبس Very well thought out تھا۔ انسان کی تربیت ایک نوزائیدہ بچے کی طرح کی جاتی تھی اور سب سے پہلے اُس کی انا ماردی جاتی تھی۔ انا مر جائے تو انسان بہت سی بُرائیوں سے بچ جاتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ خانقاہی سسٹم ختم ہو گیا اور اِس کی جگہ گدی نشینی اور مجاوری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بہت سی خامیاں اِس میں عود آئیں، جن کی وجہ سے عوام میں سلسلۂ تصوف بدنام ہونے لگا اور مختلف شکوک وشبہات جنم لینے لگے۔ اِس میں کچھ قصور اُن عقیدت مندوں کا بھی تھا جو عقیدت میں اِس حد تک آگے چلے گئے کہ اُن کے طور طریقوں پر شرک کا گمان ہونے لگا۔ آج ہم مزاروں پر جو کچھ ہوتا دیکھتے ہیں، وہ اُس سے بالکل مختلف ہے جو اُن صاحبانِ مزار کی تعلیمات تھیں۔

عامر خاکوانی: کیا خانقاہی نظام کا Revival (احیا) ممکن ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اب شاید خانقاہی نظام کو اُس کے پرانے رنگ اور طریقہ کے ساتھ واپس لانا ممکن نہ ہو۔ یہ سنتِ رب ہے کہ جس دور میں جس علاقہ میں پیغمبر بھیجا گیا وہ اُس دور کے لوگوں کے مزاج اور معاشرتی اقدار کے مطابق تھا۔ اُس پیغمبر کا تعلق اُسی علاقہ سے ہوتا۔ وجہ یہ تھی کہ جو شخص اُنہی میں سے ہے، وہ بہتر انداز میں اُنھیں بات سمجھا سکے گا۔ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا باقی تمام پیغمبر اپنے اپنے خطے اور علاقے میں بھیجے گئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام عالموں کے لیے پیغمبر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پوری کائنات میں بسنے والے لوگوں کے لیے ہے۔

اب جو فقرا آئیں گے وہ درحقیقت ایسے ہوں گے کہ پڑھے لکھے لوگوں اور مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کو اُن کی بات کو سمجھنے، اُسے Follow کرنے اور اپنی بات کہنے میں دقت محسوس نہ ہو۔ اِسی طرح مغرب میں رہنے والے لوگ بھی اُن کی بات آسانی سے سن اور سمجھ سکیں۔ اگر تین چار سو سال قبل رائج خانقاہی نظام اپنی پرانی

شکل میں دوبارہ قائم ہو جاتا ہے تو پڑھے لکھے لوگوں تک پیغام پہنچانا اور اپنی بات واضح کرنا فقرا کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

اُن کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان، لہجہ اور Terms میں بات کرنا دشوار ہو گا۔ اِس لیے شاید تین چار سو سال قدیم خانقاہی سسٹم تو دوبارہ نہ آئے لیکن اس نظام میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ Revival ممکن ہے۔

عامر خاکوانی: کیا رُوحانی سلسلوں میں ارتقا کا عمل جاری ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ارتقا کا عمل تو ہر چیز میں جاری رہتا ہے۔ رُوحانیت میں بھی اِرتقائی منازل طے ہوتی ہیں۔ یہ سلاسل یونہی رہیں گے بس بات کرنے کا ڈھنگ آج کی Requirement کے مطابق ہو جائے گا۔

عامر خاکوانی: آج کل اعتراض کیا جاتا ہے کہ تصوف یا رُوحانیت دین کے متوازی ایک نظام ہے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: میں نے عرض کیا ہے کہ رُوحانیت میں کچھ چیزیں در آئی ہیں جو سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہیں۔ اس میں Role عقیدت و محبت میں شدت رکھنے والے اور کچھ اناڑی لوگوں نے Play کیا ہے۔

تصوف دراصل اسلام سے کچھ علیحدہ چیز نہیں۔ شریعت بنیادی چیز ہے لیکن شریعت پر عمل بہت دشوار ہے۔ کوئی شخص شریعت پر سو فی صد عمل نہیں کر پاتا ماسوائے اُن ابتدائی مسلمانوں کے جو آپ ﷺ کے یا پھر صحابہ کرامؓ کے تربیت یافتہ تھے۔ اُن کے اندر اخلاقی قوت بے پناہ تھی اور اُس اخلاقی قوت کے باعث وہ باآسانی شریعت پر عمل کر لیتے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ہماری یہ اخلاقی قوت کمزور ہوتی چلی گئی اور شریعت پر عمل کرنا ایک عام آدمی کے لیے دشوار ہوتا گیا۔ اِس لیے فقرا نے تصوف کا یہ راستہ نکالا تاکہ اِس کی پہلی منزل پر تزکیۂ نفس ہو جائے اور انسان میں اخلاقی جرأت و طاقت پیدا ہو جائے اور وہ حقوق العباد پر عمل کرنے کا عادی ہو جائے۔ جب انسان میں یہ سارے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں تو اِس کے بعد وہ شریعت پر سو فی صد عمل کرتا ہے۔

خانقاہ میں بھی شریعت پر عمل کرنا ہی سکھایا جاتا تھا۔ اگر ہم اس نظام کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ وہاں توحید پر زور تھا۔ آپ ﷺ کو اللہ کا سچا اور آخری نبی ﷺ مانا جاتا تھا، عہد کی پاسداری کی جاتی تھی، امانت داری کی تعلیم دی جاتی، مہمانوں کی خدمت کی جاتی، دوسروں کی مدد کا جذبہ وہاں عروج پر دکھائی دیتا، روزہ کی پابندی کی جاتی اور وسائل ہوتے تو حج پر بھی جایا جاتا۔ چونکہ اہلِ فقر دولت جمع نہ کرتے تھے اِس لیے اکثر زکوٰۃ کی نوبت نہ آتی۔ لیکن اگر کبھی وہ صاحبِ نصاب ہو جاتے تو بروقت زکوٰۃ بھی ادا کرتے۔ یوں خانقاہوں میں شریعت کی پابندی بھی کروائی جاتی تھی۔ وہاں پر آپ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہونے پر بہت زور دیا جاتا۔ آپ ﷺ کی سنت آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر مبنی ہے اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ عملی قرآن اور عملی اسلام ہے۔

اہلِ فقر درجہ بدرجہ اور بتدریج اپنے شاگردوں کو شریعت کی سو فی صد پابندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کے ہاں جبر نہیں بلکہ وہ Systematically تربیت کرتے ہیں کہ سیکھنے والا رضا کارانہ طور پر ایک قدم آگے بڑھتا اور شریعت پر عمل کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ شریعت کا کافی زیادہ پابند ہو جاتا ہے۔

غلط فہمی کا اصل سبب خانقاہ کے لوگوں کا طرزِ رہن سہن اور طور طریقے بنے۔ لیکن تمام اہلِ فقر نے یہ طرزِ زندگی نہیں اپنایا جیسے حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ زندگی شاہانہ تھا جس پر اکثر اولیاء اللہ نے اعتراض بھی کیا کہ آپ کیسے فقیر ہیں کہ جن کے پاس اتنی دولت جمع ہے۔ لیکن جب قحط پڑا تو حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گوداموں کے منہ حاجت مندوں کے لیے کھول دیے اور ثابت کر دیا کہ اُنھوں نے دولت کو دل میں جگہ نہیں دی تھی اور وہ مال و دولت مخلوقِ خدا کے لیے ہی تھا۔

اسلام ہے کیا؟ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کا نام اسلام ہے۔ اہم ترین عبادت نماز ہمیں کیا سبق دیتی ہے؟ پابندی وقت کا، امیر کی اطاعت کا، ڈسپلن کا، دوسروں کے لیے ایثار کا کہ بعد میں آنے والوں کو جگہ دینے کے لیے ہم سکڑ جائیں۔ آدابِ محفل کا کہ تاخیر سے آنے کی صورت میں صفیں پھلانگنے کے بجائے جہاں جگہ ملے، بیٹھ جائیں، ایسی چیزیں کھا کر نہ جائیں جن کی وجہ سے منہ سے بو آئے مثلاً لہسن، پیاز اور مولی وغیرہ...... یہ سب آدابِ محفل ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں تو کون سی ایسی عبادت ہے جو دوسروں کے ساتھ بھلائی کا درس نہیں دیتی۔ رب تعالیٰ کو تو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں۔ وہ اِن چیزوں سے بہت بلند ہے۔ اُس نے تو یہ عبادات بھی ہماری بھلائی کے لیے ہم پر فرض کی ہیں تاکہ ہمارے اندر بندگی کا احساس پیدا ہو جائے کہ ہم اُس رب کے بندے اور غلام ہیں جس کی شریعت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم آپس میں بھلائی، قربانی اور ایثار کا سلوک کریں۔

زکوٰۃ کیا ہے؟ اللہ کو تو ہمارے روپے پیسے کی ضرورت نہیں! یہ تو ہم اپنے دوسرے بھائی کی خدمت کرتے ہیں۔ صدقہ و خیرات جس کا اِتنا اجر ہے...... وہ کیا ہے......؟ دوسروں کی مدد ہی تو ہے......!

عامر خاکوانی: کیا عمل کے اعتبار سے بنیادی ترجیح سماجی خدمت کو حاصل ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: آپ اس کو حقوق العباد کہہ سکتے ہیں کیونکہ سماجی خدمت یا بھلائی شاید اِتنا وسیع المعنی لفظ نہ ہو۔ ہمارے ذمہ جو ایک دوسرے کے حقوق ہیں اسلام میں بھی اس کی اہمیت ہے۔ دیکھیے! شہید کو کتنا بڑا اللہ نے مقام دیا ہے کہ وہ بغیر حساب کتاب کے سیدھا جنت میں جائے گا ماسوائے ایک چیز کے حساب کتاب کے...... اور وہ ہے قرض۔ اِس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ نے حقوق العباد کو کتنا اہم قرار دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہم عبادات پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسلام کو محض عبادات کا مجموعہ سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام کے اندر دین اور دُنیا دو علیحدہ حصے نہیں ہیں بلکہ یہ Well-integrated دین ہے۔ اسلام سے پہلے کے مذاہب میں عبادات اور معاملات کو الگ رکھا جاتا تھا لیکن اسلام میں عبادات اور دُنیاوی زندگی ایک دوسرے سے مربوط

ہیں جس کی ایک مثال یہ ہے کہ نماز جس کی روزِ حساب سب سے پہلے پوچھ گچھ ہوگی، اُس میں بھی رب نے ایک چیز واضح کردی کہ نماز بُرائیوں سے روکتی ہے۔ اگر ایک شخص عبادات کررہا ہے لیکن وہ کم تولتا ہے، وعدہ کی پاسداری نہیں کرتا۔ ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے۔ تو وہ ہرگز ہرگز رب کا پسندیدہ آدمی نہیں ہوگا۔ اُس کی یہ کوتاہیاں معاف نہیں ہوں گی۔ اُسے ان کا روزِ حساب جواب دینا ہوگا۔ اسلام میں عبادات اور معاملات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم لوگوں کے ساتھ اپنے حسب منشاء سلوک کریں اور محض عبادات کے بل بوتے پر خود کو نیک سمجھنا شروع کردیں۔

عامر خاکوانی: کچھ لوگ وظائف اور چلّوں کے ذریعے رُوحانی کمالات حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو تعویذ وغیرہ لکھ کردینا شروع کردیتے ہیں کیا ایسے لوگ بھی رُوحانیت کی صف میں کہیں آتے ہیں؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اگر تو کوئی خدمت خلق کررہا ہے اور اِسے اُس نے مالی منفعت اور دُنیاوی نفع کے ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اِس خدمت خلق کو وہ اسلام کی ترویج کا ذریعہ بنارہا ہے تو پھر یہ پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن اگر اُس کا مقصد مالی منفعت اور دُنیاوی فائدہ کا حصول ہے اور اُس کے اِس عمل میں اسلام کی خدمت کا پہلو نہیں ہے تو پھر یہ پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

عامر خاکوانی: کیا ایسے لوگ رُوحانی کمال حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں؟

سرفراز اے شاہ صاحب: رُوحانی کمال تو دور کی بات ہے وہ رُوحانی کمال کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکے گا جس نے ایک بھی سنت ترک کی اور سنت آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔ یہ بھی آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک معجزہ ہے کہ کلاس فائیو میں پڑھی جانے والی حیاتِ طیبہ 50,55 سال گزر جانے کے بعد بھی ہمارے ذہن میں تازہ رہتی ہے۔ اُس حیاتِ طیبہ کا ایک بڑا حصہ مشتمل ہے دوسروں کے ساتھ آپ ﷺ کے سلوک اور رویہ پر...... دشمنوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ، دوستوں، صحابہ کرامؓ ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک...... کاروبارِ حکومت، کاروبارِ دُنیا دورانِ جنگ اور جنگ کے بعد آپ ﷺ کا رویہ یہ سب آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا حصہ ہے۔ لہٰذا کوئی شخص رُوحانیت کی خوشبو تک بھی نہیں سونگھ سکتا تاوقتیکہ وہ سنت پر عمل پیرا نہ ہوجائے۔ چلّوں اور وظیفوں سے رُوحانیت حاصل نہیں ہوتی اور جن چیزوں کو عرفِ عام میں رُوحانی کمالات کہا جاتا ہے وہ تو غیر مسلموں کو بھی حاصل ہیں۔ اُن کے ہاں اِس کو "اِستدراج" کہا جاتا ہے۔ یہودی کاہنوں، عیسائی راہبوں اور ہندو سادھوؤں میں بھی یہ اِستدراج ہمیں نظر آتا ہے۔

ہاں! آپ نے اگر کسی رُوحانی شخصیت کو دیکھنا ہے تو عقیدت مندوں کی نہیں بلکہ بزرگانِ دین جیسے خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خود اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اِن مستند اولیاء کرام کی کتابوں میں کرامات کا ذکر نہیں ملتا۔ اُنھوں نے اپنی کتابوں میں کرامات کا نہیں بلکہ اس اُسلوب زندگی کا ذکر کیا جس نے اُنھیں فقیر بنادیا۔

برصغیر میں رہتے ہوئے ہم پر ہندو معاشرہ کا جو اثر آیا اُس نے ہمیں کرامات کی طرف راغب کر دیا۔ معاشرتی اقدار میں گزشتہ چالیس سال میں آنے والی تبدیلی کی وجہ سے ہم پر مادیت پسندی غالب آ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اُن لوگوں کو سب کچھ مان لیا جن کے پاس جانے سے ہمیں دُنیاوی فائدے کا حصول اور مسائل کا حل ممکن نظر آیا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ کوئی ولی اللہ کشف و کرامات کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اِن کو مداری کے کرتب سے زیادہ اہم نہیں گردانتا۔ اِن کشف و کرامات کے حصول پر وہ اللہ کا شکر گزار تو ہوتا ہے لیکن درحقیقت اِن کو اپنے راستہ کی رُکاوٹ سمجھتا ہے کیونکہ فقیر کی منزل یہ کشف و کرامات نہیں بلکہ رب کی دوستی اور قرب ہے۔ یہ کشف و کرامات اُس کی راہ اِس طرح کھوٹی کرتی ہیں کہ اِن سے متاثر ہو کر دُنیا ایک بڑی تعداد میں اُن کے پاس آنے لگتی ہے جس کی وجہ سے اُن کے معمولات بگڑنے لگتے ہیں اور کوئی بھی فقیر اپنے پاس آنے والے لوگوں کو دھتکار نہیں سکتا کیونکہ یہ رویہ رب کو پسند نہیں۔

عامر خاکوانی: کشف سے کیا مراد ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: کشف کے لغوی معنی تو "کھل جانا" کے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں کشف سے مراد ہے کہ رب تعالیٰ کسی شخص کی بندگی یا عمل سے خوش ہو کر جب اُس پر عنایات کرتا ہے تو اُن عنایات کے نتیجہ میں وہ شخص Time and space سے Beyond چلا جاتا ہے۔ تب رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقہ کچھ حد تک چیزیں اُس پر منکشف کر دیتا ہے۔ تب وہ شخص "صاحب کشف" کہلاتا ہے۔

عموماً ہم کسی "صاحب کشف" کو "صاحب کمال" سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر مستقبل کے بارے میں اِدراک کر لینا ہی کمال ہے تو پھر بلیاں اور کتے بھی صاحبِ کمال ہیں کیونکہ اُنھیں زلزلہ اور طوفان کی آمد کا پہلے سے اِدراک ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح چیونٹیاں بارش آنے سے پہلے ہی اپنا سامان جمع کرنے لگتی ہیں۔ مینڈک ٹرٹرانے لگتے ہیں۔ یہ تو کوئی کمال نہیں......! یہ صلاحیت اور حس تو رب نے اپنی بہت سی مخلوقات کو عطا فرمائی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کوئی شخص خلقِ خدا پر مہربان کتنا ہے...... مخلوق کو اُس سے کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے...... وہ سایہ دار درخت ہے یا نہیں...... کیونکہ سایہ دار گھنا درخت کبھی یہ نہیں دیکھتا کہ اُس کی چھاؤں میں بیٹھنے والا وہ لکڑہارا ہے جو اُس کے تنے پر کلہاڑا چلا رہا تھا یا وہ شخص ہے جو اُس کی جڑوں کو گرمی میں پانی دے رہا تھا۔ وہ سب کو یکساں سایہ اور پھل فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ صاحب کشف سے نیکی کتنی Emit ہو رہی ہے۔

عامر خاکوانی: کچھ رُوحانی شخصیات جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اپنے مقام کے بارے میں دعویٰ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کیا اُس وقت وہ کسی خاص کیفیت میں ہوتی ہیں؟

سرفراز اے شاہ صاحب: رُوحانی شخصیت تو دُور کی بات ہے، دعویٰ کسی کو بھی سزاوار نہیں۔ دعویٰ صرف اور صرف رب کو سزاوار ہے۔ اہلِ فقر اور اولیاء کرام کبھی دعویٰ نہیں کرتے۔ اِسی طرح یہ کبھی کرامت نہیں دکھاتے، یہ سرزد ہوتی ہے۔ جو فقیر کرامت دکھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ذلیل ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ

اور کچھ دیگر بزرگان اپنے کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ایسے بھی کچھ فقیر گزرے ہیں جو حالت جذب میں اپنے مقام کا ذکر کر بیٹھے۔ وہ دعویٰ نہیں تھا۔ اُن کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آیا جب وہ عشقِ الٰہی میں اس قدر دُور چلے گئے کہ ذہن اور جسم پر اُن کا کنٹرول ختم ہو گیا اور اُس کیفیت میں وہ اپنا مقام بیان کر گئے۔ جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مسجد میں خطاب کرتے کرتے اِس قدر جذب کی کیفیت میں چلے گئے کہ آپ نے فرمایا "میرا پاؤں تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے۔" یوں وہ اپنے مقام کا اظہار کر گئے لیکن یہ دعویٰ کے زمرے میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ سب اُنھوں نے حالت جذب میں کہا ورنہ دعویٰ تو اگر ایک عام آدمی بھی کرے تو رب تعالیٰ اُس کو جھوٹا کر دیتا ہے۔ ولی اللہ تو دعووں سے بہت دُور بھاگتا ہے۔

عامر خاکوانی: راضی بہ رضا ہونے سے کیا مراد ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ولایت یا اللہ کی راہ میں مختلف مقام اور درجات ہیں۔ پہلا مقام تو یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے لڑتا ہے، نفسانی خواہشات کو قابو میں لاتا ہے تاکہ اللہ کی دی ہوئی Dos اور Don'ts کی لسٹ سے وہ Step over نہ کر جائے۔ جب انسان اپنے نفس کو قابو میں لے آتا ہے اور خواہشات کو کنٹرول کرنا سیکھ جاتا ہے تو پھر وہ اگلے مقام کے لیے جدوجہد شروع کر دیتا ہے اور وہ اگلا مقام یہ ہے کہ جو رب نے اُسے دے دیا، جو اُس کے لیے فیصلہ کر دیا، جو اُسے عطا کر دیا، وہ اُس پر راضی ہو گیا۔ یہ راضی بہ رضا ہونا ہے۔

اِس سے آگے ایک اور مقام آتا ہے جہاں انسان کے تمام ارادے، خواہشات، تمام افعال رب کے ارادوں کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ انسان جب نفس امارہ سے نفس لوامہ میں جاتا ہے تو وہ راضی بہ رضا کے درجہ پر ہوتا ہے۔

آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ اگر ہم اِس راز سے واقف ہو جائیں کہ ہمارا کام صرف اور صرف اللہ کی عطا کردہ ذہنی وجسمانی قوتوں سے بہترین کام لے کر محنت کرنا ہے۔ اِس کے بعد ہمیں چاہیے کہ رب کے حضور عرض کریں "یا باری تعالیٰ! تو نے مجھے جتنی ذہنی وجسمانی قوتیں اور عقل وعلم عطا فرمایا تھا میں نے اُن کا حق المقدور استعمال کر کے محنت کی ہے۔ اب اس کا پھل تیرے ذمہ ہے۔ تو میرے مفاد میں جو بہترین جانتا ہے، وہ مجھے عطا فرما دے!

اِس کے بعد جو بھی نتیجہ سامنے آئے خواہ کامیابی ہو یا ناکامی، ہم اُسے خوش دلی سے قبول کر لیں...... یہی راضی بہ رضا ہونا ہے۔

عامر خاکوانی: کوئی شخص اپنے اُوپر وارد ہونے والی مشکلوں، بیماری یا تنگ دستی سے چھٹکارے کے لیے جب دُعا کرتا ہے تو کیا یہ راضی بہ رضا ہونے کا مقام ہے یا پھر نفس سے لڑنے کا مقام ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جب انسان پر کوئی مشکل، مصیبت یا تکلیف آئے تو وہ فوراً اللہ سے توبہ کرے کیونکہ رب نے قرآن میں فرمایا "انسان پر کوئی مصیبت نہیں آتی ماسوائے اُس کے ہاتھ سے۔" جب اللہ نے یہ فرما دیا تو اللہ سے معافی مانگی جائے "یا باری تعالیٰ! یقیناً مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی

ہے جس کی وجہ سے میں مصیبت میں آ گیا ہوں۔ تو معاف فرمانے والا ہے، میری کوتاہیوں اور خطاؤں کو معاف فرمادے اور مجھ سے اس مشکل کو ٹال دے۔"

اِس طرح دُعا کرنے سے رب راضی ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ مشکلات کے خاتمہ کے لیے بھی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ رب کو وہ لوگ بے حد پسند ہیں جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک Approach بہت غلط ہے کہ جب ذرا مشکل یا مصیبت آئے تو لوگ وظائف کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ یہ بے عملی کی راہ ہے۔ دُعا مسلمان کا Main weapon نہیں بلکہ Supporting weapon ہے۔ Main weapon انسان کی محنت اور جدوجہد ہے۔

ہجرت کے فوراً بعد جب مسلمان ابھی انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے، کفار کی طرف سے اُن پر ایک جنگ مسلط کردی گئی۔ تب آپ ﷺ نے اعلان کرایا کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ موجود ہے اُس کے ساتھ جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔ اِس اعلان کے بعد مسلمان کھجوروں کی ٹہنیوں تک کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ اُن 313 مسلمانوں نے ایسی جگہ پڑاؤ کیا جو حکمتِ عملی کے لحاظ سے بہترین تھی۔ پھر اُس میدان میں بھی Military strategy کے مطابق بہترین جگہ کا انتخاب کیا کہ جہاں پانی نزدیک تھا۔ جب آپ ﷺ نے جنگی ترتیب کے لحاظ سے مسلمانوں کی صف بندی فرمائی تو اس کے بعد رات کو جانماز بچھایا اور اللہ کے حضور گڑگڑاتے اور دُعا کرتے رہے۔

ہمیں تو ہر قدم پر آپ ﷺ سے سبق لینا چاہیے کہ کس موقع پر آپ ﷺ کا عمل کیا تھا۔ اگر ہم آنکھیں بند کر کے اُس پر عمل کرلیں تو کامیابی یقینی ہے۔ اِس لیے پہلے جدوجہد اور محنت کریں، اُس کے بعد دُعا کریں۔ مشکل حالات میں وظائف کی تلاش مسلمان کی راہ نہیں ہے۔

عامر خاکوانی: احادیث میں ذکر ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے تنگ دستی کے خاتمہ کے لیے سورۃ الواقعۃ پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ اِسی طرح تھکن کے علاج کے لیے تسبیح فاطمہؓ ہے جس کو ایک مخصوص تعداد میں پڑھا جاتا ہے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: ہم بھول رہے ہیں کہ کن حالات میں آپ ﷺ نے تسبیح فاطمہؓ بی بی صاحبہؓ کو دی تھی۔ بے پناہ محنت ومشقت اور چکی چلانے کے باعث بی بی صاحبہؓ کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کی مشک اُٹھا اُٹھا کر کندھوں پر Strap کے نشان پڑ گئے تھے۔ اتنی محنت کر چکنے کے بعد اُنھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آسانی کی درخواست کی تھی جس پر آپ ﷺ نے اُنھیں نصیحت کے بعد یہ تسبیح عطا فرمائی تھی۔

ہمیں ہر چیز کی Background دیکھ لینی چاہیے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی صحابیؓ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم بازو کو سر کے نیچے رکھ کر سوتے رہو اور سورۃ الواقعۃ پڑھ لیا کرو، تمھیں بہت رزق مل جائے گا...... آپ ﷺ نے تو ہمیشہ عمل اور جدوجہد کی تلقین فرمائی ورنہ آپ ﷺ کے لیے کیا دشوار تھا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر

بجائے اس قدر مشقت اُٹھانے کے اگر دُعا فرما دیتے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی دُعا قبول نہ فرماتا......؟ آپ ﷺ کی دُعا سے قریش گھر بیٹھے بیٹھے تباہ و برباد نہ ہو جاتے......؟ آپ ﷺ نے تو مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ پیش کیا کہ پہلے کوشش اور جدوجہد کرو پھر رب کے حضور دُعا کرو۔

عامر خاکوانی: اگر ایک مسلمان کسی رُوحانی سسٹم کا حصہ بنے بغیر بھی حقوق العباد ادا کرتا ہے تو کیا اُس کی کامیابی اور نجات ممکن ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اگر کوئی بھی مسلمان فرض عبادات کر رہا ہے اور اُن کے ساتھ حقوق العباد کو Beyond the call of duty جا کر ادا کرتا ہے تو وہ یقینی طور پر اللہ کی رضا اور خوشنودی پا لے گا اور جس سے رب راضی ہو جاتا ہے، اُسے وہ اپنا دوست بنا لیتا ہے اور یہ کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔

عامر خاکوانی: کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: میں بنیادی طور پر Business Administration کا آدمی ہوں۔ 1966ء میں عملی زندگی کا آغاز کیا۔ مختلف قومی اور بین الاقوامی اداروں میں کام کرتا رہا۔ گورنمنٹ آف پاکستان کے لیے بھی کام کیا۔ آج کل ایک پرائیویٹ گروپ آف کمپنیز میں بطور وائس چیئرمین کام کر رہا ہوں۔ الحمدللہ شادی شدہ ہوں، تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

عامر خاکوانی: کیا آپ کا تعلق لاہور سے ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: میرا تعلق تو لاہور سے ہے لیکن میرے والدین 1947ء میں جالندھر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔

غلام محی الدین: خاندانی History کے بارے میں کچھ بتائیے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: میرا تعلق سید گھرانے سے ہے جو عرب سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا۔ میری والدہ جناب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی لڑی سے ہیں۔ میرے والد سید ممتاز احمد سید امام موسیٰ کاظمؑ کی اولاد سے ہیں۔

غلام محی الدین: عام طور پر سید گھرانوں میں گدی نشینی کا سلسلہ رائج نظر آتا ہے تو کیا آپ کے خاندان میں بھی کچھ ایسا سلسلہ رہا؟

سرفراز اے شاہ صاحب: (مسکراتے ہوئے) بات یہ ہے کہ میں اتنا خوش نصیب نہیں تھا کہ مجھے گدی نصیب ہو جاتی۔ میرے پردادا تک تو گدی نشینی کا سلسلہ نظر نہیں آتا کیونکہ وہ سول سروس میں تھے۔ میرے دادا بھی ملازمت پیشہ تھے۔ میرے والد کا تعلق فوج کی انجینئرنگ برانچ سے تھا۔ میں بھی ملازمت کر رہا ہوں اور میرے دونوں بیٹے بھی ملازم ہیں۔

میرے والد اگر زیادہ دیر زندہ رہتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے رُوحانیت کی اِس راہ پر نہ آنے دیتے۔
ہمارے ہاں پیری مریدی کا سلسلہ نہیں پایا جاتا۔ میرے نانا بھی ریلوے میں ملازم تھے اور میرے پر نانا صاحب جائداد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھے۔ ذاتی طور پر میں بھی پیری مریدی پر یقین نہیں رکھتا اور اِس سے دُور بھاگتا ہوں۔

غلام محی الدین: کیا آپ کے بھائیوں میں سے بھی کوئی رُوحانیت کی اِس راہ پر آیا؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اپنے بہن بھائیوں میں تو میں اکلوتا ہوں جو اِس راہ کی طرف آیا۔

غلام محی الدین: رُوحانیت کی نظر میں پاکستان کا مستقبل بہت روشن اور خوش آئند ہے۔ اس خوش خبری کو ہم کن اشاریوں کی بنیاد پر Prove کر سکتے ہیں؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اِس ملک کی کچھ Peculiarities ہیں جو میرے علم کے مطابق کسی اور ملک کی نہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ یہ شب قدر میں وجود میں آیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک فردِ واحد کی Exclusive محنت سے وجود میں آیا۔ تیسری وجہ ہے کہ اس کے قیام کے Process میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں بہا (البتہ ہجرت کے عمل میں بے تحاشا خون ضرور بہا)۔ چوتھی وجہ اِس کا بانی ایک لمحہ کے لیے بھی جیل نہیں گیا۔ یہ واحد ملک ہے جس کی اتنی طویل سرحدیں کسی غیر مسلم ملک سے ملتی ہیں۔ یہ واحد ملک ہے جسے روزِ اوّل ہی سے ایک کافر ملک کے ساتھ ایک Disputed territory حاصل ہوگئی۔ اِس کا پانی کا جھگڑا رہا...... یہ سب اگر نہ ہوتا تو شاید ہم وہ سب نہ کر پاتے جو ہم نے مجبور ہو کر کر دکھایا۔ اپنی بقا کے لیے وسائل نہ ہونے کے باوجود ہم نے اسلامی دُنیا کی سب سے بڑی Ordnance factory قائم کر لی۔ وسائل کے نہ ہوتے ہوئے بھی دُنیا کی Largest, professionally-trained standing army بنا لی۔ یہ سب ہم گزرے۔ انڈیا کے ساتھ ہم نے تین جنگیں لڑیں۔ تینوں کے نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں نکلے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم نے Russia جیسی Superpower پر ہاتھ ڈالا تو رب تعالیٰ نے ایسے اسباب بنا ڈالے کہ وہ ہمارے ہاتھوں ٹوٹ گیا۔ اگر ذرا بیٹھ کر سوچیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انڈیا سے ہم لڑے تو کوئی زیادہ حتمی نتائج برآمد نہ کر سکے لیکن جب Russia جیسی سپر پاور سے لڑے تو ایسے وسائل میسر آ گئے کہ وہ ہمارے ہاتھوں ٹوٹ گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے کاموں میں ایک ترتیب ہے۔ وہ اِس ترتیب کو کبھی نہیں توڑتا۔ سپر پاور روس ایک Atheist (دہریہ) ملک تھا۔ رب تعالیٰ نے ہمارے ذریعے وہ کام لیا جس کے لیے یہ خطہ ارض پاکستان وجود میں آیا تھا کہ منکر ملک کا وجود ہی ختم کر دیا۔ اِس کے ٹوٹنے کے بعد جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ مسلمان یا عیسائی ہیں......منکر نہیں ہیں۔ اب ترتیب کے لحاظ سے اگلی باری مشرکین کی ہے اور وہ آپ کے مشرق میں بستا ہے۔ اب جب آپ اُس مشرک ملک سے لڑیں گے تو ان شاء اللہ فتح یاب ہوں گے۔ لیکن جیسے اِتنے بڑے منکر ملک سے لڑنے کے لیے اللہ نے ہمارے لیے وسائل پیدا کیے تھے، اُسی طرح اب بھی وہ وسائل پیدا کر رہا ہے۔ یہ تو ہے ایک Logical بات۔ دوسری چیز کلیتہً تاریخی ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کی چودہ سو سالہ

History دیکھیں تو مسلمانوں کے پاس جب بھی دُنیاوی مال وزر بہت کم تھا تو انھوں نے ہمیشہ فتح پائی اور جب بھی دُنیاوی آرام و آسائش اُنھیں حاصل ہو گیا، وہ زوال کو چلے گئے۔ پاکستان آج جس حال میں ہے اِس سے بُرے حالات میں پہلے کبھی نہ تھا۔ اب پھر ان شاء اللہ ہم اُٹھیں گے اور اپنے عروج پر جائیں گے۔

غلام محی الدین: اس سے تو یوں لگتا ہے کہ ترقی پانے کے لیے ہمارا لڑاکا یا پھر بھوکا ہونا بہت ضروری ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: بھوکے تو ہم ہو رہے ہیں۔ غربت کی آخری حدوں تک تو ہم چلے گئے ہیں۔ مسلمانوں کا عروج غربت کے نتیجہ میں آیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہم ہر روز 220 مربع میل کا علاقہ فتح کر رہے تھے۔ وہ وقت بھی آیا جب ہم آدھے فرانس پر قابض تھے۔ اُس زمانہ میں ترقی سائنس دانوں اور ریاضی دانوں کی بدولت ہوئی۔ تب ہم سب سے زیادہ خوش حال تھے۔ پھر ہمارا زوال شروع ہو گیا۔ آج ہم سائنس اور دیگر بنیادی علوم میں بالکل نیچے چلے گئے ہیں۔ وہی حالات پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے ہم اُٹھے تھے۔ اب پھر ہم اُٹھیں گے اور علم کے چشمے ان شاء اللہ ایک بار پھر ہمارے ہی اندر سے پھوٹیں گے۔

غلام محی الدین: لاشعوری طور پر ہم شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں۔ حالات میں تبدیلی کے لیے ہم کسی محمود غزنوی اور محمد بن قاسم کا انتظار کرتے ہیں۔ کیا موجودہ دور میں اُن جیسا Potential کسی میں موجود ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ہمارا تعلق چونکہ Subcontinent سے ہے اور یہاں بت پرستی سدا سے ہی ہے۔ ہماری اکثریت ہندو سے مسلمان ہوئی۔ ہم نے اپنا عقیدہ تو بدلا لیکن معاشرتی اقدار نہ چھوڑ سکے۔ بت پرستی تو حرام ہونے کی وجہ سے ہم نے چھوڑ دی لیکن شخصیت پرستی ابھی تک اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اب شخصیت پرستی کو بھی توڑنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ جن شخصیات کے بت تراش کر ہم نے محاورتاً اُن کی پوجا کی، رب اُن سب کی آہستہ آہستہ قلعی کھولتا جا رہا ہے۔ جب یہ سب چیزیں رفتہ رفتہ Unfold ہو جائیں گی تو رب تعالیٰ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا۔ جب ہمیں نفسیاتی طور پر کچھ جھٹکے لگیں گے، تب ہم اُس شخصیت پرستی سے دُور بھاگیں گے اور ہم ہی میں سے ایک آدمی اُٹھے گا جو اِس قوم کو آئینہ دکھائے گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ترقی کی طرف چلے جائیں گے۔

عامر خاکوانی: ممتاز مفتی نے اپنے ایک مضمون میں آپ کے حوالے سے کہا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خون ریز جنگ ہو گی جس کے بعد پاکستان کا عروج شروع ہو گا۔

سرفراز اے شاہ صاحب: آیندہ آنے والی پاک بھارت جنگ خون ریز ہو گی۔ مسلمانوں کا اِس میں کافی جانی و مالی نقصان ہو گا لیکن پاکستان ان شاء اللہ ایک فاتح کی صورت سامنے آئے گا اور وہی نقطۂ آغاز ہو گا ہمارے عالمی عروج کا...... جہاں ہم عالم اسلام کی لیڈر شپ سنبھالیں گے اور وہی ہمارے دُنیاوی عروج کی ابتدا ہو گی۔

غلام محی الدین: جاگیردارانہ نظام کی مانند خانقاہی نظام کی اثر پذیری تو کم ہو گئی ہے لیکن جبر کا شکنجہ اور اُس کے اثرات اب بھی بہت گہرے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اِس راہ کو کوئی بھی نام دے دیجیے، اب اِس کا شکنجہ ہمارے ذہنوں پر اتنا Strong نہیں جتنا ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ Strong ہو جائے۔ ہم مشکل میں ہوتے ہیں، ہمارا بچہ روتا ہے یا ٹھیک طریقہ سے پڑھائی نہیں کرتا تو ہم پیر صاحب کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں کہ دم کر دیجیے۔ ہم اِس شکنجہ کو مضبوط کرنے کی دعوت تو خود دے رہے ہیں۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب آپ بیمار ہوں تو علاج کرائیں۔ ہم آپ ﷺ کے فرمان پر عمل پیرا ہونے کے بجائے دم درود کو ترجیح دیتے ہیں۔ یوں ہم خود چاہتے ہیں کہ یہ شکنجہ مضبوط ہو جائے۔ تو بجائے ہم اپنی خواہشات کے غلام ہونے کے اور لوگوں کے مشورے پر عمل کرنے کے آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کیوں نہ کریں......؟

غلام محی الدین: اسلام تو محبت اور پیار و امن کا درس دیتا ہے۔ اسلام کا نام لے کر خودکش دھماکے کرنے والوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: اِس کا جواب بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ ہم تو آپ ﷺ کے اُمتی اور پیروکار ہیں۔ آپ ﷺ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا۔ ساری دُنیا کے لیے آپ ﷺ کا عملی پیغام محبت کا تھا حتیٰ کہ جنگ کے لیے طے کردہ پیرامیٹرز کو غور سے دیکھ لیجیے مسلمان کسی ایسے مرد پر ہتھیار نہیں اُٹھائے گا جو جنگ کے قابل نہیں...... کسی بچے اور عورت پر مسلمان ہتھیار نہیں اُٹھا سکتا۔ حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں اگر دشمن ہاتھ کھڑے کر دے یا تلوار نیام میں ڈال دے تو اُس پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان فتح یاب ہو جائے تو وہ گھروں اور فصلوں کو جلا نہیں سکتا، درختوں کو کاٹ نہیں سکتا۔ یہ کیا تھا؟ جنگ کی صورت میں بھی محبت کا پیغام ہی تو تھا۔

مسلمان کا ہتھیار صرف اُس وقت تک اُٹھتا ہے جب تک وہ جنگ کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک اور بہت زیادہ زبردست پیغام دیا کہ جب آپ کسی سے معاہدہ کر لیں تو وہ معاہدہ خود نہ توڑیں تاوقتیکہ دوسرا فریق اس کو توڑ دے۔ فقیر آپ ﷺ کا محبت کا یہ پیغام ہی آگے بڑھاتا ہے۔ آپ ﷺ کا رویہ تو یہ رہا کہ باوجود یہود و نصاریٰ کی اصلیت اور سازشیں معلوم ہونے کے آپ ﷺ نے کبھی اُن پر ہتھیار نہ اُٹھایا تاوقتیکہ وہ آمادۂ جنگ نہیں ہو گئے...... لہٰذا کسی بھی ایسے انسان کے خلاف جنگ کرنا جو آپ سے جنگ نہیں کر رہا جائز نہیں چہ جائے کہ وہ مسلمان ہو۔

غلام محی الدین: غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: عہدِ نبوی دیکھیے...... زمانہ امن میں مسلمان اور یہود و نصاریٰ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے تھے۔ مسلمانوں کا اُن کے ساتھ اچھا رویہ رہا۔ اُن کے ساتھ لین دین بھی ہوتا، سودا سلف بھی اُن سے خریدا جاتا۔ مسلمانوں نے کبھی اُنھیں اُن کے سامنے لعن طعن نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے

خدمت گاروں میں ایک یہودی نوجوان بھی تھا۔ جب وہ ایک بار بیمار پڑ گیا تو آپ ﷺ خود چل کر اُس کے گھر تشریف لے گئے اور اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کی عیادت کی۔ آپ ﷺ کا تو اخلاق یہ تھا......!

ہم یہود و نصاریٰ پر بھروسا نہ کریں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم اُنھیں ہمہ وقت اپنا دشمن سمجھیں۔ ہمارے رویہ سے اعلیٰ ظرفی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار جھلکنی چاہییں۔ جب تک غیر مسلم آمادۂ جنگ نہ ہوں تب تک ہمارا اُن کے ساتھ رویہ بہت مشفقانہ اور بہت Accommodating ہونا چاہیے۔

غلام محی الدین: ماضی میں اکثر یہ نعرہ ہم سنا کرتے تھے "اسلامی انقلاب"۔ پھر دوسرا نعرہ آیا "رُوحانی انقلاب"۔ یہ رُوحانی انقلاب کیا ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: یہ نعرہ لگانے والے غالباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سنت کو اپنی روزمرہ زندگی میں اپنا لیا جائے تو یہ رُوحانی انقلاب ہے۔

غلام محی الدین: خود شناسی خود بخود آ جاتی ہے یا اِس کے لیے غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: خود شناسی بہت مشکل مرحلہ ہے۔ جس نے خود کو پہچان لیا، اُس نے رب کو پہچان لیا۔ خود شناسی کے لیے ضروری ہے کہ فرصت کے اوقات میں انسان غور و فکر کرے اور اپنی اصلیت جاننے کی کوشش کرے کہ ایک نجس قطرہ سے اللہ مجھے عالمِ وجود میں لایا۔ پیدائش کے وقت میرے جسم پر کپڑے کا ایک چیتھڑا تک نہ تھا...... میں جسم پر سے مکھی اُڑانے تک پر قادر نہ تھا۔ یہ رب تعالیٰ ہی تو ہے جس نے میرے والدین کے دل میں میری محبت ڈال دی۔ باپ نے خون پسینے کی کمائی مجھ پر خرچ کی۔ ماں نے اپنے خون سے بنا ہوا دودھ پلا کر مجھے پروان چڑھایا۔ اِس حقیقت کا اِدراک ہو جانے کے بعد ہمیں سمجھ آئے گی کہ رب تعالیٰ نے ہمیں اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا۔ جب انسان اپنی تخلیق کے مراحل پر غور کرے گا تو اُس کی اکڑ ختم ہو جائے گی اور یہ اکڑ ہی دراصل بہت سے مسائل اور مصائب کی جڑ ہے۔

غلام محی الدین: آپ کا پسندیدہ ادیب کون ہے؟ کن مصنفین کو آپ زیادہ پڑھتے ہیں؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ایسی تمام کتابیں مجھے پسند ہیں جن میں مصنفین نے اپنے تجربات بیان کیے ہیں خواہ وہ سفرنامے ہوں، مہم جوئی کی داستانیں یا پھر سوانح عمریاں...... کیونکہ اُن میں مصنفین نے اِک عمر گزارنے کے بعد زندگی کے نشیب و فراز سے جو کچھ سیکھا ہوتا ہے، وہ تمام فارمولے اور Lessons ہم بغیر زیادہ مشقت اُٹھائے چند سو روپے کی ایک کتاب خرید کر سیکھ لیتے ہیں۔ اِسی طرح لاکھوں خرچ کر کے مستنصر حسین تارڑ سفر کرتے ہیں، سفر کی صعوبتیں بھی اُٹھاتے ہیں۔ ہم گھر بیٹھے وہ سفرنامہ پڑھتے ہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دُنیا کی سیر بھی کر لیتے ہیں۔ اِسی طرح سوانح عمری بھی تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے اور مہم جوئی پر مشتمل کتابیں پڑھ کر بھی انسان بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔

میرے پاس زیادہ تر کتابیں 1966ء سے پڑی ہیں۔ ایسٹ پاکستان ٹریجڈی پر تقریباً 60 سے 70 کتابیں میرے پاس موجود ہیں جن میں ایک ہی Topic پر بہت باریک باریک Points موجود ہیں۔

یوں میں کسی ایک مصنف کو ہی نہیں پڑھتا البتہ قمر علی عباسی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کی ساری Collection میرے پاس موجود ہے۔ امجد اسلام امجد کا سفرنامہ بھی زیرِ مطالعہ رہا۔

میری دل چسپی کے مضامین ملٹری اور تاریخ (Military & history) ہیں۔ اگر موقع ملتا تو میں پارٹ ٹائم Defence analyst ہوتا۔

غلام محی الدین: میڈیا میں صحافیوں کو کبھی واہ واہ کرکے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے تو کبھی انہی لوگوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایسے میں میڈیا کا کیا رول ہونا چاہیے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: جب آپ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے کیونکہ Sooner or later (جلد یا بہ دیر) بھی لوگ آپ کی سچائی کے قائل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ دشمن بھی کہنے لگتے ہیں کہ ہے تو سخت آدمی لیکن ہے سچا...... کبھی غلط اور ناحق بات نہیں کہتا۔ اِس بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے کہ کون، کب سر پر بٹھاتا اور کب زمین پر لا پٹختا ہے۔ شکسپیئر نے کہا تھا:

''جب کسی آدمی کے مخالفین بہت زیادہ ہوں تو سمجھ لو کہ وہ ایک بااُصول آدمی ہے۔''

غلام محی الدین: سیاست دانوں یا لیڈر میں کس خوبی کا ہونا ضروری ہے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: رچرڈ نکسن نے ایک چھوٹا سا قصور کیا تھا...... واٹر گیٹ سکینڈل اور اُسے استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ میں لندن میں تھا تب ایک شور و غوغا اُٹھا۔ ایک انگریز خاتون وزیر سے مستعفی ہونے کو کہا جا رہا تھا لیکن وجہ کسی کو سمجھ نہ آتی تھی...... اگلے دن اخبار میں ایک مختصر خبر تھی کہ اُنھوں نے ایک پرائیویٹ جگہ پر ایک Racist لطیفہ سنایا تھا جو وزیرِاعظم کو Report ہو گیا اور اُس نے خاتون وزیر سے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا۔

اسی طرح وہاں ایک اور وزیر بھی نکال دیے گئے تھے کیونکہ اُن کا قصور یہ تھا کہ اُنھوں نے دو بھائیوں کا پاسپورٹ Out of turn پہلے Process کروایا تھا۔ یہ تو مغرب کی مثال ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''کسی شخص کا آج جاننے کے لیے اُس کا گزرا ہوا کل دیکھ لو۔''

لہٰذا میں تو اُسے اپنا لیڈر بنانا چاہوں گا جو جھوٹ نہ بولتا ہو...... بدقسمتی سے ہم جھوٹ کو بُرائی نہیں سمجھتے۔ آج تک ہم نے اپنے کسی لیڈر کو اِس زاویۂ نگاہ سے چیک نہیں کیا۔ اگر کبھی ہم نے ایسا لیڈر چن لیا جو جھوٹ نہ بولتا ہو تو ہم سب کی زندگیاں آسان ہو جائیں گی...... ایسا لیڈر ہی صحیح معنوں میں لیڈر ہو گا۔

غلام محی الدین: Stress کے لمحوں میں تفریح کے لیے کیا کرتے ہیں؟ گارڈننگ، ڈرائیونگ یا پھر بچوں اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔

سرفراز اے شاہ صاحب: میری زندگی کی سب سے بڑی تفریح ڈرائیونگ ہے۔ میں جب کبھی Under stress ہوں گا تو کسی ویران سنسان روڈ پر بہت آہستہ رفتار میں آدھا گھنٹہ گاڑی چلانے کے بعد جب واپس آؤں گا تو بالکل Stress free ہوں گا۔

غلام محی الدین: زندگی میں جب بھی دکھ کے لمحات میں مرہم کی ضرورت پڑی تو اپنا دُکھ کس کے ساتھ Share کیا؟

سرفراز اے شاہ صاحب: میں بہت Introvert قسم کا آدمی ہوں۔ میں کبھی اپنے دُکھ کا اظہار اپنی والدہ، وائف یا اولاد کے سامنے نہیں کر سکا کیونکہ ایمان کی حد تک میرا ایک اُصول ہے کہ میرے دُکھ صرف میرے ہیں لیکن میری خوشیاں سب کی ہیں۔ میں چوبیس گھنٹوں میں کئی بار رب کو مخاطب کر کے اُس سے گفتگو کر لیتا ہوں کیونکہ اللہ ہی تو وہ ہستی ہے جس سے بندہ جب چاہے بات کر سکتا ہے۔ یوں تنہائی میں جب بھی رب سے گفتگو کرتا ہوں، دل سے غبار نکلتا جاتا ہے۔ کسی اور کے ساتھ اپنا دُکھ Share کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

غلام محی الدین: آپ کی زندگی میں کوئی ایسی شخصیت جو دُور رہ کر بھی آپ کو پاس لگی ہو؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ہماری پرائمری کلاس کا سلیبس بہت Thoughtful تھا۔ مثال کے طور پر 1955ء میں اپنی پانچویں کی کتاب میں سے پڑھی گئی کہانی مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک صحابیؓ کے دروازے پر رات کو بہت تیز دستک ہوئی۔ اُنھوں نے دروازہ کھولا تو خون آلود لباس میں ملبوس اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ایک شخص کھڑا تھا جس نے کہا کہ میرے پیچھے دشمن لگے ہیں اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ وہ صحابیؓ اُنھیں اندر لے آئے۔ پہننے کے لیے لباس دیا اور اُن کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اِتنے میں دروازے پر شور سنائی دیا۔ باہر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُنہی کے بیٹے کو قتل کر کے کوئی شخص فرار ہو گیا ہے اور قبیلے کے لوگ اُس مفرور کو تلاش کر رہے ہیں۔ صحابیؓ نے مفرور سے لاعلمی کا اظہار کیا اور اندر آ کر اُس شخص سے کہا "جس شخص کو تم نے قتل کیا ہے وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ اِس سے پہلے کہ میرا صبر جواب دے جائے، ان گٹھڑیوں میں کچھ اشرفیاں اور کھانے پینے کا سامان ہے، اصطبل میں میرا تیز رفتار گھوڑا موجود ہے...... اِن سب کے ساتھ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرے قبیلے کے لوگ تمھیں پکڑ کر قتل کر دیں گے۔" اِسی طرح اُس دور میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں بہت سی کہانیاں پڑھنے کے بعد سنی العقیدہ ہونے کے باوجود میں اُنھیں Idealise کرنے لگا اور میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قصے کہانیوں سے بہت روشنی حاصل کی۔

غلام محی الدین: کچھ مذہبی رہنماؤں میں شقاوت اور Superiority complex بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

سرفراز اے شاہ صاحب: ہماری جوانی میں ایک صاحب کے بارے میں لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ بہت بڑی رُوحانی شخصیت ہیں۔ اُن صاحب کا اپنے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ نہ تھا...... وہ تو بس چپ چاپ خدمت خلق میں مصروف رہتے۔

میں بھی اُن کے پاس بیٹھنے لگ گیا۔ ایک بار پشاور میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا تھا تو وہ بھی میرے ساتھ روانہ ہوئے۔ ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اگلی صبح جب میں اُن کے کمرے

میں یہ دیکھنے گیا کہ اُن کی رات کیسی گزری......! تو اُن سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک سلسلۂ گفتگو روک کر وہ کہنے لگے...... ''آج میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنا ظاہر ایسا بنائے رکھنا کہ کسی کو تمھارے باطن کی خبر نہ ہو۔''

کافی دن کی سوچ بچار کے بعد میں اِس بات کی رُوح سمجھ پایا کہ اگر کسی کو یہ پتا چل جائے کہ یہ شخص نماز پابندی سے پڑھتا ہے، روزے باقاعدگی سے رکھتا ہے اور دین کی باتیں کرتا ہے تو لوگ اُس کی عزت کرنے لگتے ہیں اُسے سلام کرنے لگتے ہیں جس سے اُس شخص کا نفس پھلنے پھولنے لگتا ہے اور انسان Superiority complex میں چلا جاتا ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے۔ اِس سے بچنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان بہت خاموشی سے اپنے رب کو پکارتا رہے اور کسی پر اپنے اندر کا حال ظاہر نہ ہونے دے۔

عامر خاکوانی: بڑے شاہ صاحب سے کیسے ملاقات ہوئی؟

سرفراز اے شاہ صاحب: جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میں نے کلاس فائیو ہی میں حضرت علیؓ کو Idealise کر لیا تھا۔ اِس کے بعد کچھ Textbooks میں حضرت بوعلی قلندر رحمتہ اللہ علیہ، حضرت علاؤالدین صابر رحمتہ اللہ علیہ اور بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں پڑھا تو تجسس پیدا ہوا کہ یہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔

میں جب گورنمنٹ آف پاکستان کے لیے کام کر رہا تھا تو میری رہائش کیولری گراؤنڈ کی آفیسرز کالونی میں تھی جہاں ایک میجر صاحب بھی رہتے تھے۔ ایک روز وہ میرے پاس آ کر کہنے لگے ''آپ کو اولیاءاللہ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ ایک ایسے ہی شخص کو میں بھی جانتا ہوں، اُن سے اجازت لے کر آپ کو اُن سے ملوانے لے چلوں گا۔'' اگلے روز وہ اجازت کے بعد مجھے اُن کے پاس لے گئے۔ مجھے وہ صاحب بظاہر اُس حلیے اور Standard پر Fit نظر نہ آئے جو ہم قصے کہانیوں میں پڑھتے ہیں لیکن مجھے اُن میں ایک کشش محسوس ہوئی اور جی چاہا کہ اُن سے دوبارہ ملا جائے۔ وہ ایسے بھلے انسان تھے کہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں چائے بنا کر پلاتے اور جھوٹے برتن بھی خود ہی دھوتے۔ یوں اُن کے پاس جانے کا سلسلہ شروع ہوا تو رفتہ رفتہ باتیں کھلنے لگیں اور پتا چلا کہ وہ اللہ کے بہت نیک بندے تھے اور اُن میں دکھاوا بالکل نہ تھا۔ اُن کا تعلق انبالہ سے تھا اور وہ صابریہ سلسلہ میں بیعت تھے۔

اُن کے مرشد نے اُنھیں سلسلۂ وارثیہ کے ایک بزرگ کے پاس تربیت کے لیے بھیجا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ گوجر خان میں رہنے لگے جہاں وہ لوہار کا کام کرتے رہے۔ پھر گوجر خان سے لاہور کے علاقہ سنت نگر میں باتھ روم سائز کے ایک ساڑھے پانچ بائے ساڑھے تین فٹ کمرے میں رہائش پذیر ہو گئے۔ لاہور میں اُنھوں نے جلیبی اور بعد ازاں شربت کی ریڑھی لگائی۔ کسی سے کچھ لیتے یا مانگتے نہ تھے، محنت کرنا پسند کرتے اور کما کر اخراجات پورے کرتے۔

13 اگست 1986ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

عامر خاکوانی: رُوحانیت کے حصول کے لیے بنیادی چیز کیا ہے؟ کیا رُوحانی تربیت کے حصول کے لیے کسی بزرگ کے پاس جانا ضروری ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: دو بنیادی چیزیں ہیں...... فرض عبادات اور نیکی۔ مختصر لفظوں میں انسان خلق خدا پر مہربان ہو...... یہ نیکی ہے۔ نیکی کی مختصر ترین تعریف یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات، خواہشات اور آرام کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی ضروریات، خواہشات اور آرام کو ترجیح دے۔ جب انسان یہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو رب اُس پر مہربان ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث مروی ہے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اللہ پاک بندہ کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعا والتوبۃ، حدیث 7028، صفحہ 71، جلد 8) جہاں تک تربیت کے لیے کسی بزرگ کے پاس جانے کی بات ہے تو ایک سادہ سی مثال ہے کہ ایک بچہ اُردو بازار سے کتابیں لا کر پرائیویٹ تیاری کر کے میٹرک کا امتحان دیتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتا ہے۔ دوسرا بچہ ٹیوٹر سے پڑھ کر امتحان میں Appear ہوتا اور 1st division میں پاس ہو جاتا ہے۔ تیسرا بچہ باقاعدہ سکول میں داخلہ لیتا ہے۔ سارا سال پڑھائی کرتا ہے اور سال کے اِختتام پر امتحان دیتا ہے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتا ہے۔

اب پاس تو تینوں بچے ہو گئے لیکن تینوں بچوں کے رویے اور مزاج میں فرق ہو گا۔ محض کتابیں پڑھ کر پاس ہونے والا بچہ Shy (شرمیلا) ہوتا ہے۔ دوسروں سے بات کرتے وقت ہچکچاتا ہے۔ ٹیوٹر سے پڑھنے والا بچہ قدرے پُر اعتماد ہے جبکہ سکول میں پڑھنے والے بچے میں سپورٹس مین سپرٹ اور ٹیم سپرٹ بھی ہو گی اور ڈسپلن کے ساتھ ساتھ وقت کی پابندی بھی اُس میں نظر آئے گی۔

اِسی طرح اگر رُوحانیت کی راہ میں آپ کو اچھا گائیڈ مل گیا ہے تو وہ آپ کو تعلیم بھی دے گا اور تربیت بھی کرے گا کیونکہ تعلیم کے بغیر تربیت بے سود ہے۔

عامر خاکوانی: Historically علما اور صوفیا میں ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: ایسا ہونا نہیں چاہیے لیکن ہے۔ عالم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ کیا چیز کیا ہے۔ صوفیاء یہ بتاتے ہیں کہ اِن چیزوں کو Implement کیسے کرنا ہے......! ایک تھیوری ہے، دوسرا پریکٹیکل۔ دُنیا کے تمام علوم میں بھی یہ چیز نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ گاڑی ورکشاپ لے کر جاتے ہیں اور مکینک جب اُس کا Carburettor کھولتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ فلاں آٹو موبیل انجینئر نے تو کہا تھا کہ اس کا Carburettor نہیں کھولنا چاہیے۔ لیکن یہاں مکینک اپنے آپ کو درست سمجھ کر وہ عمل کر رہا ہے۔ دوسری طرف جب آپ آٹو موبیل انجینئر سے اِس صورت حال پر بات کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ مکینک کو کیا پتا کہ گاڑی کیا ہوتی ہے میں نے اِس فیلڈ میں چار سالہ ڈگری لی ہوئی ہے۔ تو فرق محض پریکٹیکل اور تھیوری کا ہے!

عامر خاکوانی: علم لدنی تمام علوم پر حاوی ہے۔ کیا یہ Established fact ہے؟

سرفراز اے شاہ صاحب: یہ بالکل Established fact ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں میٹرک میں سائنس

پڑھ رہا ہوں۔ میں آپ سے Subjects پوچھتا ہوں تو آپ کہتے ہیں سائنس، ڈرائنگ اور Maths اب سائنس میں فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی ہے۔ اِسی طرح Maths میں Mathematics، Arithmatics الجبراء جیومیٹری اور Trigonometry آ گئی۔ اب مضامین تو آپ کے سائنس اور Maths ہیں لیکن اس میں آپ بیسیوں مضامین اور چیزیں پڑھ رہے ہیں۔ اِسی طرح علم لدنی بہت سے علوم کا مجموعہ ہے آپ رب کا علم حاصل کرنے کے لیے علم لدنی سیکھنے جاتے ہیں تو بہت سے دوسرے علوم خود بخود اِس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

(روزنامہ ایکسپریس میں مورخہ 12-05-2010 کو شائع ہوا)

قوالی

سوال: بعض علما و صوفیا قوالی کے سخت مخالف ہیں جبکہ کچھ حق میں ہیں۔ صحیح کیا ہے؟

جواب: کچھ مکتبۂ فکر قوالی کے حق میں ہیں اور کچھ مخالف ہیں۔ درحقیقت ایسے تمام شغل جو انسان کو رب کی یاد سے غافل کر دیں، وہ اسلام میں جائز نہیں ہیں۔ تفریح کی اسلام میں اجازت ہے۔ آپ کوئی بھی Hobby اور شغل اپنانے میں آزاد ہیں۔ رب نے اِس کی ایک Broad outline دے دی کہ کوئی بھی ایسا شغل جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے، وہ مناسب نہیں اور جو شغل انسان کو اللہ کی یاد دلا دے وہ مباح ہے۔

موسیقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسی موسیقی جو دل پر رقت طاری کر دے اور انسان کو رب کی یاد دلا دے، مباح ہے جبکہ ایسی موسیقی جو انسان کو رب کی یاد سے غافل کر دے، وہ جائز نہیں ہے۔ اِس کا اطلاق قوالی پر بھی ہے۔

اگر انسان قوالی سن کر رب کی یاد میں کھو جاتا ہے تو وہ جائز ہے اور اگر انسان قوالی سن کر غیر اللہ کی یاد میں کھونے لگے یا اُسے غیر اللہ کی یاد زیادہ ستانے لگے تو قوالی سننا مناسب نہیں ہے۔

یہ انسان کے اپنے مزاج کی بات ہے۔ کچھ لوگ فلمی گانے سنتے ہیں اور اُن سے وہ ایسا مطلب اخذ کرتے ہیں کہ رب کی یاد میں ڈوب جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ قرآنِ پاک کی قرأت کو بھی میوزک بنا لیتے ہیں۔

یہ انسان کی اپنی سوچ پر منحصر ہے لہٰذا قوالی کے جائز یا ناجائز ہونے پر حتمی رائے دینا مناسب نہیں کیونکہ معلوم نہیں کہ کوئی شخص اِسے کس انداز میں لے۔

سوال: کچھ صوفیا کرام قوالی میں رب اور آپ ﷺ کو ملا دیتے ہیں...... اور کہتے ہیں کہ دونوں میں فرق ہی کوئی نہیں۔ یہ مقامِ عشق ہے یا گمراہی؟

جواب: یہ معاملہ بہت نازک ہے......! اگر ہم یوں کہیں کہ آپ ﷺ رب تعالیٰ کے محبوب ہیں...... جو کہ ہیں...... اور آپ ﷺ کا مقام اِتنا بلند ہے کہ اللہ کے بعد سب سے بڑی ہستی آپ ﷺ ہیں۔ اسی طرح اگر ہم یہ جانیں کہ علم میں رب کے بعد اگر کوئی انسانوں میں یکتا ہے تو وہ آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ سے

بڑھ کر علم سوائے رب کے اور کسی کے پاس نہیں۔ اس کے ساتھ اگر ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ انسان ناقص العقل ہے، By designاس میں خامیاں موجود ہیں اس کا علم بھی نامکمل اور عقل و نگاہ بھی محدود ہے۔ رب تعالیٰ تک انسان اپنے علم، عقل اور محبت سے اس طرح نہیں پہنچ پائے گا۔ یہ بات بالکل وہیں چلی گئی جو پہلے بھی کسی نشست میں زیرِ بحث آئی تھی کہ اللہ تک پہنچنے کے تین راستے ہیں:

1. Will
2. Knowledge
3. Love

جب ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہماری نظر اور عقل بھی محدود ہے اور ہم خطا کے پتلے ہیں تو رب تعالیٰ تک علم اور عقل کے ذریعے ہم کیسے پہنچ پائیں گے......؟ اِس کے لیے ہمیں ایک پڑاؤ چاہیے ہوگا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ اگر ہمیں سیڑھیوں کے ذریعے پچاس منزلہ عمارت پر چڑھنا ہو تو ہم لگاتار نہیں چڑھ پائیں گے...... راستے میں کہیں نہ کہیں ٹھہر کر سانس لینا ہوگا تبھی ہم خیریت سے منزل پر پہنچیں گے۔ اگر ہمیں اللہ تک پہنچنا ہے تو ہمیں آپ ﷺ کی دہلیز کو پکڑنا ہوگا۔ پہلے ہمیں آپ ﷺ کی محبت دل میں پالنا ہوگی...... اور اپنی محبت، توجہ اور نگاہ کا مرکز آپ ﷺ کی ذات کو بنانا ہوگا۔ آپ ﷺ کے ساتھ غیر مشروط محبت و عقیدت رکھنا ہوگی...... اِس کے ساتھ ہمیں دل میں یہ جذبہ احسان مندی پالنا ہوگا کہ آپ ﷺ ہی ہیں جنھوں نے اللہ کا سچا دین ہم تک پہنچایا۔ جب ہم آپ ﷺ کو اپنی محبت، توجہ اور نگاہ کا مرکز بنالیں گے تو آپ ﷺ کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ جب ہم اس دائرے میں پہنچ جائیں گے تو پھر آپ ﷺ ہمیں رب سے ضرور ملا دیں گے ان شاء اللہ۔ جب ہم آپ ﷺ کی دہلیز پر پہنچتے ہیں تو وہاں سے ہمیں رب سے ملا دیا جاتا ہے۔ جب ہم رب کا آپ ﷺ سے پیار دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں دوئی نہیں یک جائی نظر آتی ہے۔ جب ہم آپ ﷺ سے عشق کرتے ہیں تو ہمیں آپ ﷺ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں ہم کہنے لگتے ہیں کہ آپ ﷺ اور رب ایک ہی ہیں لیکن یہ بات تمثیلاً کہی جاتی ہے اور کہنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ ﷺ سے غیر مشروط پیار کرنے لگیں اور لامحالہ رب تک چلے جائیں۔

جہاں تک قوالی میں آپ ﷺ کو رب سے ملانے کی بات ہے تو ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں اپنے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ تب اُنھوں نے ایک ایسی بات کہی جسے میرے ذہن نے تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا۔ دراصل وہ ایسا دور تھا کہ باوجود مرشد پکڑنے اور رُوحانیت کی راہ پر چلنے کے میرے ذہن پر مغربی تعلیم کا اثر نمایاں تھا...... اُن کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ انھوں نے کیا کہہ دیا۔ کافی غور و فکر کے بعد حقیقت کھلی کہ اُنھوں نے بالکل صحیح کہا تھا، میں ہی اپنی کم علمی کی وجہ سے اسے غلط سمجھا تھا اور اصل بات کو گرفت میں نہ لے سکا تھا۔ مرشد صاحب نے فرمایا تھا:

"میاں! مرشد کو تو رب کا درجہ دینا پڑتا ہے۔"

اِسی طرح ایک روز کہنے لگے:

''میں تو کہتا ہوں کہ علیؑ ہی رب ہے۔''

میں یہ سن کر پھر بدک گیا کہ یہ کیا شرک کر دیا اُنھوں نے۔ لیکن بعد ازاں عقدہ کھل گیا اور بات واضح ہو گئی کہ مرشد صاحب کا یہ فرمانا کہ مرشد کو رب کا درجہ دینا پڑتا ہے، دراصل تمثیلاً تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مرشد کا احترام یوں کرنا پڑتا ہے اور اُن کا حکم ایسے ماننا پڑتا ہے جیسے آپ رب کی بات مانتے ہیں۔

کیونکہ جب آپ کسی کو مرشد مان لیتے ہیں تو آپ کی ڈکشنری سے پانچ ''ک'' نکل جاتے ہیں.....

''کیوں، کب، کیسے، کیا، کہاں۔'' مرشد سے سوال نہیں پوچھے جاتے۔ ہم اپنے مرشد سے کوئی سوال نہیں پوچھتے حتیٰ کہ سوچتے ہی نہیں کہ اُنھوں نے کیا کہا، بس اُس کی تعمیل کرتے ہیں خواہ جان چلی جائے۔ کیونکہ اگر ہم نے یہ سوچا کہ مرشد کے حکم کی تعمیل میں میری جان چلی جائے گی یا مجھے نقصان ہو جائے گا تو پھر ہم نے مرشد کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔

اِسی طرح قبلہ مرشد صاحب کے فرمان کہ ''علیؑ ہی رب ہے''، سے مراد بھی یہی تھی۔ درحقیقت وہ طریقت و تصوف کے ایک واسطے اور زینے کو Explain کر رہے تھے جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمیں رب سے محبت کرنے سے پہلے آپ ﷺ سے غیر مشروط محبت کرنا ہو گی۔ بلکہ غیر مشروط محبت بھی شاید کافی نہ ہو۔ ہمیں آپ ﷺ سے ایسا عشق کرنا ہو گا کہ آپ ﷺ ہمیں اپنی ذات، جان، اولاد، ماں باپ غرض ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو جائیں...... یہ شریعت کا راستہ ہے۔

طریقت میں ایک زینہ اور بڑھ جاتا ہے کہ ہمیں رب تک پہنچنے کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ بھی عشق پالنا ہو گا...... وہاں سے ہم آپ ﷺ کی دہلیز تک پہنچا دیے جائیں گے۔ اِسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا ''میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ۔''

دروازے سے داخل ہوئے بغیر ہم شہر میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ یہاں کچھ لوگوں کے ذہن میں، ہو سکتا ہے یہ سوال پیدا ہو کہ شاید میرا تعلق اہلِ تشیع سے ہے۔ لیکن وضاحت کر دوں کہ میں اہلِ سنت سے ہوں اور جناب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا پیروکار ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہم اُن ہستیوں کی دہلیز مضبوطی سے نہیں پکڑتے، رب تک پہنچنا دشوار ہے۔ ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سے اِس درجے کا پیار کرنا ہو گا جو عشق میں بدل جائے۔ مرشد صاحب کا مطلب یہی تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرمودات کو Blindly (آنکھیں بند کر کے) Follow کر لو تو آپ ﷺ کی دہلیز تک پہنچ جاؤ گے۔ جب آپ ﷺ کی دہلیز پر پہنچ جاؤ گے تو رب تک پہنچا دیے جاؤ گے۔

یہ مقامِ عشق کا ہے۔ لیکن احتیاط رہے کہ یہ عشق جنون نہ بننے پائے کیونکہ جنون میں انسان ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ وہ کمتر درجے کا مقام ہے۔ جب تک عشق، عشق رہتا ہے۔ انسان تلوار کی دھار پر چلتا ہے...... لیکن جب انسان جنون میں داخل ہو جائے تو اُس کا ذہن کنٹرول کھو دیتا ہے۔ اِس لیے تصوف میں سالک کو مجذوب پر فوقیت (Edge) حاصل ہے کیونکہ سالک صاحب عقل اور صاحب ہوش و حواس ہوتا ہے

جبکہ مجذوب رب کے عشق میں جنون میں داخل ہو گیا ہوتا ہے جہاں ذہن اور عقل اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہوتے ہیں...... وہاں دل کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اِسی لیے سالک کو مجذوب پر فوقیت ہوتی ہے۔ وہ مقامِ عشق ہے...... مقامِ جنون نہیں...... نہ ہی مقامِ گمراہی...... لیکن ہمیں آنکھیں بند کر کے یہ یاد رکھنا ہو گا کہ رب، رب ہے اور آپ ﷺ اللہ کے بعد آتے ہیں۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ بعض صوفیا دورانِ گفتگو بھی ایسی بات کہہ دیتے ہیں۔

دراصل اولیائے کرام پر مختلف کیفیات وارد ہوتی رہتی ہیں۔ سالک بھی حالتِ جذب میں چلا جاتا ہے لیکن وہ لمحاتی کیفیت ہوتی ہے کہ کیفیت آئی اور چلی گئی۔ جس طرح صاحبِ جنوں پر ملکی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا...... اگر ہوش و حواس سے بے گانہ شخص کسی کو قتل کر دے تو دُنیا کی کوئی عدالت اُسے سزا نہیں دیتی بلکہ اُسے ذہنی امراض کے ہسپتال میں بھجوا دیا جاتا ہے...... اِسی طرح صاحبِ جنوں پر شریعت کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔

سالک اگر کبھی حالتِ جذب میں چلا جائے تو وہ مجنونانہ باتیں کرتا ہے۔ تب اُس کا اپنے ذہن اور زبان پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ تب وہ ایسی باتیں کہہ دیتا ہے......! وہ رب کے عشق میں ایسا ڈوبا کہ مقامِ یک جائی سے اُس نے ایسی بات کہہ دی کہ تو کون اور میں کون...... دونوں ایک ہی تو ہیں۔ یہ مقامِ جنوں ہے لیکن سالک ایسی بات صرف حالتِ جذب میں کہے گا۔ اِسی طرح صوفی پر کبھی کبھار حالتِ سکر طاری ہو جاتی ہے۔ سالک کوشش کرتے ہیں کہ وہ حالتِ سکر میں نہ جانے پائیں...... لیکن اگر کبھی وہ ایسی حالت میں چلے جائیں تو لوگوں کو چاہیے کہ اُن کے سامنے سے ہٹ جائیں کہ نہ معلوم وہ کیا بات کہہ دیں۔ اِسی طرح مجذوب کو نہیں چھیڑنا چاہیے تاکہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں۔

صاحبِ جنوں جب سالک سے ملتے ہیں تو باوجود صاحبِ جنوں ہونے کے سالک سے دُعا کا کہہ دیتے ہیں...... جہاں سالک نے دُعا کر دی، وہ خالی ہو گیا۔ اِس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن صاحبِ جنوں سے سالک کہہ دے کہ میں کیوں کروں دُعا...... تم کرو میرے لیے دُعا۔ صاحبِ جنوں بھاگ جائے گا کبھی دُعا نہیں کرے گا۔ حالتِ جذب میں کہی ہوئی بات پر قوانین لاگو نہیں ہوتے۔ خواہ وہ Law of the land ہو یا Shariah law۔

اگر کسی صوفی نے عشق کے جنون میں ایسی بات کہہ دی کہ تو کون اور میں کون...... دونوں ایک ہی تو ہیں، تو وہ صوفی قابلِ گرفت نہیں ہوتا کیونکہ اُس وقت وہ حالتِ جذب میں تھا...... ورنہ سالک کبھی ایسی جسارت نہیں کرتا...... وہ تو رب سے محبت کرتا ہے اور انسان جس سے محبت کرتا ہے اُس سے خوف زدہ نہیں ہوتا لیکن وہ اِس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں میرا محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ اِس ڈر کے تحت وہ محبوب کی ہر فرمائش اور خواہش پوری کرتا چلا جاتا ہے۔ اِس لیے تمام صاحبِ علم یہ کہتے ہیں کہ رب سے خوف نہیں بلکہ پیار پالو کیونکہ خوف پالیں گے تو اُس سے دُور بھاگیں گے...... جب پیار پالیں گے تو اُس کے قریب جانے کی خواہش بہت

شدید ہوگی اور آپ ہر وقت اِس ڈر میں مبتلا رہیں گے کہ میری کسی حرکت سے میرا رب ناراض نہ ہو جائے...... محبوب کی ناراضی سے انسان ڈرتا ہے۔

سوال: پل صراط کیا ہے؟

جواب: پل صراط ایک تصوراتی پل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا جو فیصلہ ہوگا، وہ یوں ہوگا کہ جیسے انسان تلوار کی دھار پر چل رہا ہے۔ وہ ایسا کڑا وقت ہوگا، کہ بڑے سے بڑا ولی اللہ اور نیک انسان بھی کانپ رہا ہوگا کہ میں اس پل صراط سے کیسے گزروں......!

میرے علم کی حد تک پل صراط کا کوئی Physical وجود نہیں ہے۔

سوال: جب رب اعمال کا فیصلہ کردے گا تو کیا پھر بھی پل صراط سے گزرنا پڑے گا؟

جواب: جب رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم جنت میں جاؤ گے یا دوسری طرف تو پھر اُسے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ رب کے فیصلہ سنانے کے بعد تو کہیں کوئی رُکاوٹ نہیں۔

سوال: کیا صرف قربانی کا جانور ہی پل صراط سے گزرے گا؟ باقی لوگوں کا کیا ہوگا؟

جواب: یہ تمثیلی بات ہے کہ قربانی کا جانور قربانی کرنے والے کو اپنی پشت پر بٹھا کر پل صراط پر سے بڑے آرام سے گزر جائے گا۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے سنتِ ابراہیمی علیہ السلام کی پیروی میں قربانی کرتا ہے اُس کا اجر اِتنا ہے کہ اُس قربانی کے صدقے اُس کے بہت سے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور اُس کے حساب کتاب میں آسانی ہوگی۔

سوال: کیا اولیائے کرام میں سے کوئی ایسے بھی ہیں جو روضہ مبارک پر ڈیوٹی دیتے ہیں؟

جواب: اولیائے کرام میں بہت سی Categories ہیں اُن کی Duties لگتی اور Remove ہوتی رہتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھی یہ حاضر رہتے ہیں اور ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں بہت سے اولیائے کرام موجود رہتے ہیں۔ اِس معاملہ میں اِس سے زیادہ میں بیان نہیں کرسکوں گا۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے طریقے

Love, Will اور Knowledge

Will سے مراد ہے Consciousness...... انسان اپنی فطری خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے رب تک Will اور Knowledge کے ذریعے ذرا مشکل سے پہنچتا ہے جبکہ Love رب تک پہنچنے کا سب سے Safe طریقہ یا راستہ ہے...... لیکن درحقیقت یہ تینوں چیزیں یعنی Knowledge, will اور Love (محبت) Integrated ہیں اور ایک جنکشن پر جا کر تینوں مل جاتی ہیں۔ ایک مقام پر "محبت" بغیر Knowledge کے اندھی ہوتی ہے اور Knowledge بغیر محبت کے بے رنگ اور Dry (خشک) ہوتا ہے۔ جیسے ہم سٹوڈنٹ

لائف میں کہا کرتے تھے کہ فلاں مضمون بہت خشک ہے۔ "بے رنگ" سے مراد وہی ہے۔

علم میں رنگ آمیزی اور تازگی وکشش پیدا کرنے کے لیے محبت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ علم میں رب تعالیٰ کی محبت شامل نہیں ہوئی تو لوگ عالم تو بن گئے لیکن ولی اللہ نہ بن پائے۔ اسی طرح وہ اولیاء اللہ جو محبت کے راستے سے رب تک پہنچے، وہ ایک مقام سے آگے نہیں جا پائے اور بہت Early مقام پر Blind ہو گئے...... اور اُن کا راستہ بلاک ہو گیا۔ یاد رکھیے! علم بغیر Consciousness کے نہیں آتا۔

اگر انسان کو علم حاصل نہیں ہوتا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انسان Consciousness کے سمندر کے اندر نہیں اُترا بلکہ اُس کے کنارے پر بیٹھا ہے...... جب تک کوئی شخص Consciousness کے سمندر میں غوطہ نہیں لگاتا، اُسے علم حاصل نہیں ہوگا۔

Consciousness کیا ہے؟

خود کو پہچاننا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا، اُس نے رب کو پہچان لیا۔ جب تک انسان خود کو نہیں پہچانے گا اُسے علم حاصل نہیں ہوگا۔ یوں یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ Knowledge, Conscious mind اور محبت (Conscious mind کو شروع میں میں نے Will کا نام دیا تھا...... Will اِن چیزوں پر محیط ہے) پہلے انسان کو یہ جاننا ہوگا کہ میں کیوں پیدا کیا گیا؟ میں کون ہوں؟ میری پیدائش کا مقصد کیا تھا؟ اِن سوالوں کے بعد اُسے ایک ڈائریکشن اور راستہ مل جائے گا لیکن ہمیں یہ Conscious level لانا پڑے گا۔

اِس کے بعد علم عطا ہوگا اور اُس کے ساتھ ہی محبت عطا ہوگی۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ جوں جوں انسان کو رب کی قدرت کا ادراک ہوتا جاتا ہے توں توں اُس میں خدا کی بزرگی و بڑائی کا احساس بڑھتا ہے...... اور جوں جوں رب کی بڑائی کا احساس بڑھتا ہے توں توں اُس میں رب کے بڑے ہونے کا خوف پیدا ہونے لگتا ہے اور اُس کے دل میں رب کی محبت پیدا ہونے لگتی ہے کہ میرا رب کتنا عظیم ہے، مجھے کس کس طرح سے پالتا ہے۔ وہ کتنا اعلیٰ ظرف ہے کہ میرے گناہوں، کوتاہیوں کو نہیں دیکھتا، نہ یہ دیکھتا ہے کہ میں اُس کو مانتا ہوں یا نہیں...... کہیں میں اُس کا منکر تو نہیں یا اُس کے ساتھ کسی کو شریک تو نہیں ٹھہراتا؟ مجھے عطا کرتے ہوئے وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ میں اُس کا کتنا فرماں بردار اور نیک بندہ ہوں۔ وہ سب کو دیتا ہے...... اُس کا ظرف بہت بڑا ہے...... وہ اُن چیزوں سے بہت بڑا ہے...... وہ یہ نہیں کرتا کہ فلاں شخص نے میرے وجود کا انکار کیا، میں اُس کا رزق بند کر دوں۔

جوں جوں انسان گہرائی سے اِس سارے معاملے پر غور کرتا ہے تو اُس پر عقدے کھلنے لگتے ہیں۔ رب کی عظمت و بڑائی کا احساس اُس کے دل میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس لیے اولیائے کرام رب سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔

جب ہمارا Consciousness level بڑھتا ہے تو ہمیں علم حاصل ہونے لگتا ہے اور اُسی علم کے ذریعے رب سے محبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جب یہ سب چیزیں Combine ہو جاتی ہیں تو ہمیں رب تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے ملنے لگتے ہیں۔

نشست نمبر 37

تصوف کی دُنیا

سوال: خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا کوئی خاص وقت ہے یا یہ کسی بھی وقت معلوم کی جاسکتی ہے؟

جواب: رُوحانیت میں خواب کی تعبیر کے سلسلے میں دو چیزیں مدنظر رکھی جاتی ہیں:

1۔ دوپہر دو بجے سے پہلے اپنا خواب سنائیے، اِس کے بعد سنانے سے خواب ضائع ہو جاتا ہے۔

2۔ یہ احتیاط کریں کہ کسی ایسے صاحب کو خواب سنائیں جنھیں علم الرویا یا علم تعبیر حاصل ہو۔

آپ ﷺ نے بھی تاکید فرمائی ہے کہ اپنا خواب اُن لوگوں کو سنائیں جو خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے ہوں۔

اگر عام لوگوں کو خواب سنایا جائے تو جو تعبیر وہ لوگ دیں گے معاملہ اُسی طرح ہو جائے گا خواہ خواب کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق ''جو خواب آپ کے ذہن کے مطابق اچھی تعبیر نہیں رکھتے، وہ کسی کو نہ سنائے جائیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا ''بُرا خواب دیکھیں تو بائیں جانب تین بار تھوک دیں، بُرے خواب کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔''

ذاتی طور پر ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم خوابوں کے قضیے میں نہ پڑیں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ ہمیں بے عملی کی طرف لے جاتے ہیں اور ہم غیر مسلموں کی طرح مختلف شگون لینے لگتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ خواب کی تعبیر ہمارے گمان کے مطابق ہو۔ خواب کی تعبیر میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً:

1۔ خواب رات کے کس حصے یا پہر میں دیکھا گیا۔

2۔ اِس کی (صاحبِ خواب) کی رُوحانی کیفیات کیا ہیں۔

3۔ صاحبِ خواب کی دُنیاوی سرگرمیاں (Activities) کیا ہیں؟

4۔ گناہ گار یا کم لطافت رکھنے والی رُوح کا حامل شخص جو خواب دیکھتا ہے اُس میں اُس کی ناآسودہ خواہشات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

5۔ رات کے درمیانی حصے میں دیکھے گئے خواب کا تعلق معدہ کی گرانی کے ساتھ ہوگا۔ اگر رات کا کھانا ہضم

نہیں ہوا تو خواب اوٹ پٹانگ ہوں گے۔

6۔ نیک لوگ نمازِ فجر کے وقت یا اُس کے بعد جو خواب دیکھتے ہیں وہ عموماً صحیح اور اطلاعی ہوتے ہیں۔

7۔ ''علم الرویا'' کے ذریعے جو اطلاعات ملتی ہیں وہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے ''نیک شخص کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس (46) حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' (صحیح بخاری، کتاب التعبیر)

بدقسمتی سے انگریزوں کے دور میں ایک ایسے صاحب گزرے ہیں جنھوں نے اِس حدیث کا ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے اپنے خواب بیان کیے اور کہا چونکہ خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں اور خوابوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے نبوت کا سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوا...... یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ ایک جزو کل کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی کے پاس لباس کا چھوٹا سا حصہ آجائے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ سارا لباس اُس کے پاس ہے۔ اسی طرح اُن صاحب کی دلیل بھی غلط تھی۔ کچھ لوگوں نے اُن کو Follow بھی کیا...... لیکن وہ صاحب اُن کا عقیدہ اور پیروکار سب کچھ باطل تھا۔

سوال: دُنیاوی اور رُوحانی تصرف میں کیا فرق ہے؟ کیا کوئی ولی اللہ اِس دُنیا سے رُخصت ہونے کے بعد بھی صاحب تصرف ہوسکتا ہے؟

جواب: ''تصرف'' مشتق ہے صرف، خرچ اور استعمال کرنے سے۔

دُنیا میں جب ہم کسی پوزیشن پر بیٹھے ہوتے ہیں، کوئی عہدہ Hold کرتے ہیں تو اُس عہدہ، کرسی یا پوزیشن سے متعلقہ اختیارات ہمیں Automatically مل جاتے ہیں۔ جب ہم اُن اختیارات کو استعمال کرتے ہیں تو یہ ''تصرف'' کہلاتا ہے۔

گورنمنٹ میں مختلف عہدوں کی مختلف Financial powers ہوتی ہیں جن کے مطابق ہر عہدہ کا حامل شخص ایک مخصوص حد تک اخراجات کی Approval (منظوری) دے سکتا ہے۔ یہ اُس کا تصرف کہلاتا ہے۔

اِسی طرح رُوحانیت میں جب کوئی ولایت کے درجے پر بیٹھتا ہے، جب اُس درجے پر اُس کی Approval ہوجاتی ہے اور اُس کے شانے (Shoulder) پر ولایت کی مہر لگ جاتی ہے تب اگر اُسے کوئی ڈیوٹی تفویض کردی جائے تو معاملات کو چلانے کے لیے اُسے کچھ اِختیارات دیے جاتے ہیں جو اُس ولی اللہ کے ''تصرفات'' کہلاتے ہیں۔

عموماً اولیائے کرام جب دُنیا سے چلے جاتے ہیں تو اُن کے دُنیاوی تصرفات ختم ہوجاتے ہیں۔ جس طرح اگر کوئی فیڈرل سیکرٹری خواہ کتنے ہی دبنگ اور رُعب و دبدبے کے مالک ہوں، ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی اُن کے اِختیارات و تصرفات سلب ہوجائیں گے۔ بعد میں اُنھوں نے کام کروانا ہو تب وہ اپنی جگہ آنے والے سیکرٹری سے درخواست تو کرسکتے ہیں لیکن اپنا کوئی اختیار استعمال نہیں کرسکتے۔

اسی طرح رُوحانیت میں بھی جب کوئی ولی اللہ کرسی پر ہوں، اُن کا حکم جاری ہوتا ہے لیکن دُنیا سے

رخصت ہو جانے کے بعد اُن کا تصرف ختم ہو جاتا ہے لیکن اس میں بھی کچھ Exceptions موجود ہیں۔ کچھ اولیائے کرام کے کام سے اللہ تعالیٰ اس طرح خوش ہوتا ہے کہ وصال کے بعد اُن کے تصرفات میں کمی نہیں آتی۔

حضرت بابا تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال ہیں۔

سوال: جب کوئی ولی اللہ اپنا سب کچھ اپنے خلیفہ کو سونپ دیتے ہیں تو کیا اس کے باوجود بھی اُن کا رُوحانی تصرف باقی رہتا ہے؟

جواب: کسی ولی اللہ کا یا کسی دُنیاوی عہدہ دار کا اپنے شاگرد کو سب کچھ سونپ دینے یا سکھا دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس عہدہ دار (خواہ وہ دُنیاوی ہو یا رُوحانی) نے اپنے علم کے مطابق سب کچھ اپنے شاگرد کو عطا کر دیا ہے۔

مثلاً کوئی صاحب روزہ رکھتے ہیں اور کوئی صاحب دل اُن کا روزہ کھلواتے ہیں۔ جتنا ثواب روزہ دار کو ملا اُسی قدر ثواب روزہ افطار کرانے والے صاحب کو بھی مل گیا۔ اب اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روزہ رکھنے والے کا ثواب روزہ افطار کرانے والے صاحب لے گئے۔

اسی طرح جب کوئی ولی اللہ اپنا تمام علم اپنے قائم مقام شاگرد کو عطا کر دیتے ہیں تو اُن کا علم ختم نہیں ہوتا۔ پرانے زمانے میں بہت سے حکما حضرات نے تحقیق کے بعد صحیح دوائیں (ادویات) دریافت کیں۔ تا عمر اُنھوں نے اُن ادویات کا نسخہ اپنے سینے میں محفوظ رکھا لیکن مرتے وقت وہی نسخہ اُنھوں نے اپنے شاگردوں کو عطا کر دیا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ فارمولا منتقل کرنے سے وہ حکما حضرات خود علم سے خالی ہو گئے تھے۔

یاد رکھیے! علم بانٹ دینے سے گھٹتا نہیں جب یہ کہا جائے کہ کوئی ولی اللہ اپنا سب کچھ اپنے خلیفہ کو سونپ دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنھوں نے علم کی کوئی پوٹلی رکھی تھی جو شاگرد کو دے دی اور خود خالی ہاتھ رہ گئے۔

اچھے اولیاء اللہ اپنا علم پیچھے دے جاتے ہیں کیونکہ تصرف کا تعلق عہدہ سے ہے۔ اِس لیے جب وہ عہدہ سے فارغ ہو جائیں گے تو اُن کا تصرف ختم ہو جائے گا۔ پس تصرف کا خلیفہ کو علم دے دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

سوال: کیا کوئی مجذوب غوث کے عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے؟

جواب: سالک اور مجذوب میں فرق یہ ہے کہ مجذوب عشقِ الٰہی میں ڈوب کر ہوش و حواس کھو دیتا ہے جبکہ سالک عشقِ الٰہی میں ڈوب کر بھی ہوش و حواس قائم رکھتا ہے۔ غوث ایک Senior position ہے جہاں اُنھیں بہت سے فیصلے کرنا ہوتے ہیں۔ اُن کی Assignment ایسی ہوتی ہے کہ اُن کے پاس ذیلی عہدہ داروں سے بہت سی تجاویز آتی ہیں جن کی بنیاد پر غوث کو حکم جاری کرنا ہوتا ہے۔ اُن میں اُن کی اپنی Recommendations بھی ہوتی ہیں جس کے لیے ہوش و حواس میں رہنا ضروری ہے۔

میرے علم کے مطابق کوئی مجذوب ابھی تک غوث کے عہدہ پر فائز نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ایک سالک حالت جذب میں چلا جاتا ہے جس کا نقصان ہی ہوتا ہے کیونکہ تب اُس کی زبان سے جو لفظ نکلتا ہے، وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اگر کوئی سالک کبھی آپ کو حالت جذب میں مل جائے تو اُس سے دُور ہو جایئے کیونکہ نہ جانے وہ کس کیفیت میں پلٹے گا اور کیا کہے گا......!

سوال: کیا فرشتے ارادے سے معصوم ہیں؟ کیا انبیا اور اولیا اپنا ذہن Apply(Mind) کرتے ہیں؟

جواب: فرشتوں کو Living robots کہنا غلط نہ ہوگا۔ وہ کسی چیز پر اپنا Mind (ذہن) Apply نہیں کرتے صرف حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ جو پروگرام رب تعالیٰ نے اُنھیں عطا کر دیا، وہ اُس کے مطابق چلتے رہیں گے۔ اِس میں کہیں بھی اُن کی اپنی خواہش، ارادے اور تمنا کو دخل نہیں ہوتا۔

اولیاء کرام بہت نچلے درجے میں آتے ہیں۔ انبیاء کرام کا درجہ بہت بلند اور معاملہ قدرے مختلف ہے۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیھم السلام دُنیا میں تشریف لائے۔ اُن میں سے چالیس کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ یہ تمام انبیاء غیر تعلیم یافتہ تھے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ (معاذ اللہ) رب تعالیٰ کو بے علمی پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ تو علم والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔ صاحب علم کا مقام اللہ کے حضور بہت بلند ہے۔ انبیا کے غیر تعلیم یافتہ یا اُمی ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ کوئی پیغمبر اگر دُنیاوی مدرسے سے تعلیم پائے، کسی ٹیوٹر سے پڑھے یا گھر پر پڑھایا جائے۔ پڑھانے والے بہر حال انسان ہوں گے۔ انسان کی عقل بھی ناقص ہے اور علم بھی...... وہ خطا کا پتلا بھی ہے۔ جب محدود عقل و علم والے انسان سے سیکھ کر انبیا اپنی اُمت کو تعلیم دیں گے تو اِس میں بھی غلطیاں ہوں گی۔ عام انسان کی ایسی تعلیمات تو نقصان نہیں دیتیں لیکن ایک نبی کی غلطی اُمت کے لیے دلیل بن جائے گی کہ ہمارے نبی نے ایسا کیا تھا اِس لیے ہم بھی یہ کام کرتے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ اللہ فرشتوں اور وحی کے ذریعے انبیا کو خود تعلیم دیتا رہا اور وہ انبیا اپنے زمانے کے سب سے بڑھ کر صاحب علم ہوا کرتے تھے۔ انبیاء کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اور اُن سے سرزد ہونے والا ہر فعل من جانب اللہ ہوتا ہے اِس لیے انبیا کے اسوہ کو آنکھیں بند کر کے Follow کرنے کا حکم دیا گیا۔

اولیائے کرام اور ابدال ایک عام آدمی کے مقام سے اُس خاص مقام تک گئے ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی اگر علم حاصل کرے اور اُس پر عمل بھی کرے تو اُس کا ولی اللہ بن جانا لازمی ہے۔ ولی اللہ ہم بطور Terminology استعمال کرتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''اللہ کا دوست''۔ اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اُس کی غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں۔

ولایت کی شرائط کیا ہیں؟

1۔ غیر مشروط Surrender

2۔ غیر مشروط (اطاعت) Submission

یہ دونوں کام کر لیں، Guaranteed ولی اللہ ہو جائیں گے۔ لیکن رب تعالیٰ نے چونکہ انسان کو اپنا

خلیفہ بنا کر زمین پر اُتارا اور قادرِ مطلق کا خلیفہ یا نمبر 2 کبھی بے اختیار نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بات خلاف انصاف ہوتی۔ لہٰذا ''قادرِ مطلق'' کا نائب ''قادر'' ضرور ہوگا۔

جس طرح دفاتر میں افسرِ اعلیٰ کا نمبر ٹو (2) بہت سے اختیارات کا مالک ہوتا ہے اسی طرح رب تعالیٰ نے انسان کو قادرِ مطلق تو نہیں بنایا لیکن اُسے بہت سے اختیارات سے ضرور نوازا ہے۔

انسان جو چاہے سوچے کبھی کوئی فرشتہ آ کر کندھے سے ہلا کر یہ نہیں کہے گا کہ یہ تم کیا سوچ رہے ہو......؟

انسان جھوٹ بولے، چوری کرے، خواہ کچھ بھی کرے...... ہر عمل کے حساب کتاب کا رب تعالیٰ نے ایک خاص وقت رکھ دیا۔ لیکن رب تعالیٰ نے انسان کو اختیارات دینے کے ساتھ مختلف Parameters بھی دے دیے اور واضح کر دیا کہ اِن حدود سے تجاوز نہ کرنا۔ جو کوئی اِن اختیارات کی حد کو Step over کرتا ہے، سزا پاتا ہے۔

اِس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ آپ اپنے گھریلو ملازم کو کچھ رقم دے کر کہتے ہیں کہ بازار سے فلاں کوالٹی کی فلاں چیز لے آؤ۔ آپ اُس چیز کی Specifications اور Standard اُسے بتا دیتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کے بعد وہ ملازم آزاد ہے، وہ چاہے تو بہترین چیز خریدے یا پھر Sub-standard چیز خرید کر لے آئے۔ یہ اور بات کہ گھر میں آنے کے بعد اُس کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ اُس کو انعام سے نوازا جاتا ہے یا پھر ناقص شے لانے پر اُسے ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔

بعینہٖ رب تعالیٰ نے انسان کو تینوں آزادیاں عطا کیں۔ انسان اپنے Mind (ذہن) کو Apply کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اِس وجہ سے اُس کا پاؤں کہیں بھی Slip ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں عرض کر دوں کہ ہم اپنے مرشد کے بارے میں ایک عجیب تصور باندھ لیتے ہیں جو بعض اوقات چکنا چور ہو جاتا ہے پھر ہم مرشد سے دُور بھاگتے ہیں۔ اگر ہم مرشد کے تصور کو چکنا چور ہونے سے بچانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اُنھیں انسان کے مقام پر رکھیں اور جان لیں کہ اُن سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی کسی Unguided moment میں نفس کے ماتحت جا سکتے ہیں۔ جب ہم اُنھیں ایک انسان سمجھ کر اُن سے غلطی کی توقع رکھیں گے تو اُن میں کوئی خامی یا کوتاہی دیکھ کر ہمارے ذہن میں اُن کا Image ریزہ ریزہ نہیں ہوگا اور ہمیں جھٹکا نہیں لگے گا۔ یوں ہم اُن سے منسلک رہیں گے اور اُن سے علم کے حصول کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اِس لیے بہت ضروری ہے کہ مرشد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ نہ پالیے بلکہ شاگرد کا رشتہ پالیے کہ ہمیں اُن سے وہ چیز لینی ہے۔ جس چیز نے اُنھیں ایک عام انسان سے ولی اللہ کے مقام پر پہنچا دیا۔ شاگرد کا یہ رشتہ جب آپ مرشد کے ساتھ قائم کرتے ہیں تب توقعات کم رہتی ہیں اور دل ٹوٹنے سے بچ جاتا ہے۔

ہماری نظر اپنے مقصد پر رہنی چاہیے۔ ہمارا Objective کیا ہے مرشد سے Attach ہونے میں؟ ہمارا

مقصد اُن سے علم کا حصول ہونا چاہیے۔ وہ علم جو رب سے قریب کرتا ہے۔

رُوحانیت کا علم کوئی کتابی علم نہیں کہ لیکچر دے دیا جائے تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ رُوحانی علوم سیکھنے کے ڈھنگ تو دُنیاوی علوم سیکھنے سے قطعی مختلف ہیں اس میں انسان کو Through observation سیکھنا پڑتا ہے۔ اپنے مرشد کو باریکی سے Observe کیجیے کہ وہ کرتا کیا ہے...... اُس کے نقشِ قدم پر اپنے پاؤں رکھ کر چلتے چلے جائیں۔ لامحالہ آپ وہیں جا پہنچیں گے جہاں آپ کا مرشد پہنچا ہے۔ یہی Objective ہونا چاہیے کہ میں اپنے مرشد سے آگے نہیں جا سکتا تو کم از کم وہاں تو پہنچ جاؤں جہاں مرشد گئے تھے۔

ویسے تو انسان کے دل میں یہ خواہش ہونی چاہیے کہ میں اپنے مرشد سے آگے چلا جاؤں...... لیکن احترام کا تقاضا یہی ہے کہ اُن سے آگے نہ جایا جائے۔ ایسے اولیاء اللہ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی رُوحانی ترقی کا اعلان یہ کہہ کر رکوا دیا کہ میرے مرشد میرے ساتھ ہیں اور یہ احترام کے خلاف ہوگا کہ میری ترقی کا اعلان اُن کے سامنے کر دیا جائے۔

احترام دل میں نہ ہو تو اُسے سیکھا نہیں جا سکتا۔ آپ کسی کو Follow کر ہی نہیں سکتے جب تک اُس کے ساتھ انتہائی احترام کا رشتہ نہ ہو......!

مرشد کے ساتھ احترام کا رشتہ قائم رکھیے...... لیکن اُنھیں super human نہ سمجھیں ورنہ خود آپ کو ٹھیس لگے گی۔

سوال: خلیفہ اور خلفائے راشدین میں کیا فرق ہے؟

جواب: خلفائے راشدین سے مراد چار شخصیات ہیں:

1۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ

2۔ حضرت عمر فاروقؓ

3۔ حضرت عثمان غنیؓ

4۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

یہ چاروں خلفائے راشدین آپ ﷺ کی دُنیاوی حکومت کے قائم مقام تھے اور صحابہ کرامؓ میں نمایاں مقام رکھتے تھے...... سیرت و کردار کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ اِن تمام خصوصیات کی وجہ سے اُنھیں خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔

"خلیفہ" ایسے آدمی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کو Replace کرے جیسے کوئی ولی اللہ اپنے شاگردوں کے Benefit کے لیے دُنیا سے جانے سے پہلے اعلان کر دیتے ہیں کہ میرے جانے کے بعد آپ کا Learning center فلاں صاحب ہوں گے کیونکہ مرشد محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کے طور طریقے،

کردار اور علم کا لیول دوسرے سے مختلف ہے اور یہ Deserve کرتا ہے کہ دوسروں کو Lead کرے۔ ایسے شخص کو عرف عام میں ''خلیفہ'' کہا جاتا ہے۔

خلیفہ اور خلفائے راشدین میں کوئی موازنہ ممکن نہیں۔ خلیفہ تو خلفائے راشدین کے قدموں کی دُھول اور خاک پا ہیں۔ خلفائے راشدین کے مقام تک کوئی ولی اللہ نہیں پہنچ سکتا۔

نماز اور حقیقت

سوال: ہم تو اللہ کے آگے درود بھیجتے ہیں، اللہ کس کے آگے درود بھیجتا ہے؟

جواب: درود پاک آپ ﷺ پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ کسی کے آگے یا سامنے نہیں بھیجا جاتا۔ یہ تو ایک طریقہ شکر گزاری ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کا سچا پیغام حرف بہ حرف ہم تک ویسے ہی پہنچا دیا جس طرح رب تعالیٰ نے نازل کیا تھا۔ درود پاک احسان مندی کا اظہار ہے ورنہ آپ ﷺ کو اس کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر اِس لیے درود بھیجتا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے محبوب ہیں۔ رب تعالیٰ بہت حیادار اور وضع دار ہے۔ جب انسان کسی سے پیار کرتا ہے تو اُس کی سلامتی کا خواہش مند رہتا ہے۔ انسان چونکہ محدود اختیارات کا مالک ہے اِس لیے وہ آپ ﷺ کے حضور گڑگڑا سکتا ہے......اور جو رشتے اُسے عزیز ہوتے ہیں اُن کے لیے دُعا کر سکتا ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر بھی درود و سلام بھیجتا ہے۔

سوال: نمازوں کی کل تعداد کیا ہے؟ کچھ لوگ ایک یا تین نمازوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا قرآنِ پاک میں پانچ نمازوں کا ذکر نہیں؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ قرآنِ پاک میں پانچ نمازوں کا ذکر نہیں ہے......لیکن ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ عملی قرآن ہے کیونکہ آپ ﷺ نے کبھی زبان سے ایسی بات نہیں نکالی جسے پہلے اپنی ذات پر Implement نہ کیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ صرف آپ ﷺ کو دیکھ کر مسلمان ہوتے رہے کیونکہ آپ ﷺ مجسم اسلام تھے اور اسلامی تعلیمات کی تفسیر تھے۔ Personal example کا سب سے زیادہ تیزی سے اثر ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے پانچ نمازیں ہی ادا کیں۔

قرآن پاک میں دو طرح کی آیات ہیں۔

1۔ بینات

2۔ متشابہات

قرآن پاک میں Symbols کے ذریعے بھی تعلیم دی گئی ہے۔ جہاں Symbols ہوں وہاں وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ وضاحت آپ ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ پانچ

فرض نمازیں ادا فرمائی ہیں اور جہاں کسی عبادت کو فرض کرنا مقصود نہ تھا، وہ عمل آپ ﷺ نے تسلسل سے نہیں کیا...... جیسے نمازِ تراویح۔ لیکن جو کام آپ ﷺ نے مسلسل کیا اور اُس کی تلقین کی...... وہ فرض تھا۔ اور فرض نماز کے بارے میں آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا ''مجھے اگر گھر میں موجود بچوں اور خواتین کا احساس نہ ہوتو میں ایسے گھروں کو آگ لگا دوں جن میں رہنے والے مرد باجماعت نماز ادا نہیں کرتے۔''

سوال: نماز قائم کرنے اور پڑھنے میں کیا فرق ہے؟

جواب: قرآنِ پاک میں نماز پڑھنے نہیں بلکہ قائم کرنے کی تلقین ہے۔ نماز بُرائیوں سے روکتی ہے...... آپ ﷺ سے صحابہ کرام نے دریافت فرمایا ''یارسول اللہ ﷺ! ہمیں کیسے پتا چلے کہ نماز قبول ہو رہی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر نماز تمھیں بُرائیوں سے روک رہی ہے تو جان لو کہ وہ قبول ہو رہی ہے۔''

اب آپ کو نماز پڑھنے اور قائم کرنے کے درمیان فرق معلوم ہو گیا ہوگا کہ جو شخص صدقِ دل سے نماز پڑھتا ہے، وہ بُرائیوں سے دُور ہونے لگتا ہے لیکن جب انسان محض ایک فرض کی تکمیل کے لیے عادتاً نماز پڑھتا ہے تو عموماً وہ گناہوں میں لتھڑا رہتا ہے...... اور بُرائیوں سے دُور نہیں ہو پاتا۔

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں نماز ایک رکعت ہے...... باقی Repetition ہے...... جیسے وتر ایک بھی ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح فرض نماز بھی ایک ہی رکعت پر مشتمل ہوتی ہے۔

جواب: کسی زمانے میں مجھے یورپ اور امریکہ بہت کثرت سے جانا پڑتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرا قیام وہاں دو تین مہینے تک پھیلنے لگا اور یوں وہاں دُعا کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہاں British-born یا American-born نوجوان آتے جن کا بنیادی طور پر تعلق تو کسی مسلمان ملک سے ہوتا لیکن اُن کے ذہنوں میں سوال بے پناہ ہوتے۔ میں اُن سے پوچھتا کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال کیسے آیا۔ تحقیق پر پتا چلا کہ UK میں ایک ادارہ ہے جو Free Mason کے ممبرز چلاتے ہیں۔ اُس ادارے کے صدر جو یہودی تھے، ایک روز دُعا کے لیے میرے پاس آ گئے۔ دُعا کے بعد کہنے لگے کہ اگر فرصت ہو تو میں علمی Discussion کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے میٹھے لہجے اور خوب صورت اندازِ گفتگو میں In between the lines بہت کچھ چھپا تھا...... تب مجھے Strike ہوا کہ یہ سوالات انہی Lines پر ہیں جو نوجوان آ کر مجھ سے کرتے ہیں۔ میں نے اُن صاحب کو ٹٹولنے کے لیے وہ سوالات اُن کے سامنے رکھے۔ مثلاً ایک سوال یہ تھا کہ میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ جب حساب کتاب لے رہا ہوگا تو وہ منصف زیادہ ہوگا یا رحیم و کریم زیادہ ہوگا؟ ایک اور سوال یہ تھا کہ اگر اللہ پتھر میں بند کیڑے کو رزق عطا فرماتا ہے تو ہم کیوں محنت کریں۔ ہمیں بھی من جانب اللہ رزق عطا ہوتا رہے گا۔ ایک اور سوال کسی سٹوڈنٹ نے پوچھا تھا کہ جب اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتا تک نہیں ہلتا اور میری تقدیر معین ہے تو اگر میں کسی کو قتل کر دوں تو (معاذ اللہ) میں نے اللہ کے حکم کے تحت قتل کیا...... جب میں مجبورِ محض ہوں تو پھر مجھے سزا کیوں۔ ایک اور صاحب نے سوال پوچھا کہ 12 ربیع الاول کو ہم جشنِ ولادت مناتے ہیں...... کیا یہ جائز ہے؟

یہ اور اِس سے ملتے جلتے دیگر سوالات مختلف کوارٹرز سے مسلمان نوجوانوں کے ذہن میں ڈالے جاتے ہیں۔ میں ایک روز لان میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ڈیوٹی فری شاپ کا چکر لگا آتا ہوں۔ تب ایک صاحب میرے پاس آ کر کہنے لگے "میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" "لیکن آپ ناراض نہ ہوئیے گا۔ میں نے کہا" اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔" کہنے لگے میں نے ایک عالم سے یہی سوال پوچھا تو اُنھوں نے مجھے مارنے کے لیے جوتا اُتار لیا تھا۔" وہ سوال نیدرلینڈ کے لوگوں سے متعلق تھا۔

ہم ایک غلطی کر جاتے ہیں کہ غلط سوال پر ہمارا ردِعمل شدید ہو جاتا ہے...... حالانکہ شدید ردِعمل کے بجائے اگر ہم پیار سے جواب دے کر صاحبِ سوال کو مطمئن کر دیں تو وہ بھٹکنے اور بہکنے سے محفوظ رہ جائے گا۔

جب میرا ایمان ہے کہ اسلام ایک آفاقی حقیقت ہے...... یہ اِتنا نازک نہیں کہ کسی کے نازیبا سوال پوچھنے سے اِس میں دراڑ آ جائے گی۔ ہم بجائے سوال سے خوف زدہ ہونے کے خوش مزاجی سے جواب دیں تاکہ سوال کرنے والا مطمئن ہو کر Convince ہو جائے۔

مغربی دُنیا میں مسلم نوجوانوں کو Confuse کرنے کے لیے ایسے سوالات پھیلائے جا رہے ہیں۔ مذکورہ سوال بھی ایسا ہی ہے جس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے لیے معتبر حوالہ قرآنِ پاک ہے اور جہاں کسی حکم پر قرآنِ پاک خاموش ہے تو وہاں آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہمارے لیے نمونہ ہے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی ایسا لفظ ادا نہیں کیا جو من جانب اللہ نہ ہو...... اور آپ ﷺ کوئی ایسا فعل نہیں ہے کا جو اللہ کے حکم کے تابع نہ ہو۔ لہٰذا آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں کسی وسوسے یا شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے...... کیونکہ آپ ﷺ کے توسط سے اسلام ہم تک پہنچا اور آپ ﷺ سے بہتر کوئی بھی شخص اسلام کو نہیں سمجھ سکتا۔

سوال: کیا بچوں کو نظر لگ جانا حقیقت ہے؟

جواب: بچوں کو نظر لگ جانا حقیقت ہے اور آپ ﷺ سے ثابت ہے لیکن ذرا ذرا سی بات پر جس رفتار سے ہم کہتے ہیں کہ نظر لگ گئی، یہ اِتنی کثرت سے لگتی نہیں کیونکہ ہمارے یہاں تو میری بے تدبیری سے کپڑے کانٹوں میں اُلجھ گئے اور پھٹ گئے تو میرا پہلا ردِعمل یہ ہو گا کہ صاحب! میرے کپڑوں کو نظر لگ گئی۔ اپنی بے پروائی اور کوتاہی کو تسلیم کرنے کی بجائے سارا الزام بدنظری کو دے دیا۔ اِسی طرح ادھورے علم پر Rely کر کے میں غلط فیصلہ کرتا ہوں اور نتائج غلط آنے پر الزام بدنظری کو دے دیتا ہوں...... رزق کم ہونے کی صورت میں ہم فوراً کہتے ہیں صاحب! میرا رزق کسی نے باندھ دیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ رازق صرف رب تعالیٰ ہے۔ اگر رب مجھے رزق دینا چاہے تو مخلوق میں سے کسی کی ہمت نہیں کہ اُسے روک دے اور خدانخواستہ اگر کسی مصلحت کے تحت رب تعالیٰ بندے پر رزق تنگ کر دے تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اُسے رزق دے دے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کا مالک ہے...... وہ اپنی مرضی کے بغیر کسی کی سفارش سنتا ہے نہ کسی کی مجال ہے

کہ کوئی اُسے مجبور کر سکے۔

اِس لیے اگر رزق کم ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری دُنیاوی کوشش یا تدبیر بار آور نہیں ہو پا رہی یا پھر ہم دنوں کے پھیر میں ہیں...... جیسا کہ رب تعالیٰ کا فرمان ہے "ہم لوگوں میں دنوں کو پھیرتے رہتے ہیں۔"

آپ کو یاد ہو گا کہ جب ہم نویں کلاس میں پڑھتے تھے تو جغرافیہ کے اُستاد ایک الیکٹرک گلوب ہمیں دکھایا کرتے تھے۔ اُس الیکٹرک گلوب کی ایک سائیڈ پر بلب جلتا تھا۔ جیسے ہی وہ بلب روشن ہوتا تو گلوب گھومنے لگتا۔ تب ہمارے ٹیچر بتاتے کہ یہ زمین اپنے Axis کے گرد چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتی ہے...... اِس بلب کو سورج سمجھ لو...... زمین کا جو حصہ اِس بلب (سورج) کے سامنے آتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو حصہ اُس بلب کے Opposite سائیڈ پر چلا جاتا ہے...... وہاں اندھیرا چھا جاتا ہے۔

اِس طرح دن مسلسل گھوم رہے ہیں...... اچھے دنوں کی زد میں کبھی آپ آ جائیں گے اور کبھی میں آ جاؤں گا۔ پھر کچھ ایسے دن بھی آئیں گے جو اِتنے اچھے نہیں...... اُن میں سے ہمیں گزرنا ہو گا۔

ایک صاحب بڑے شاہ صاحب کو Irritate کرنے (چڑانے) میں غالباً Specialized تھے۔ ایک روز اُن سے کہنے لگے "حضور! آج کل بڑے مشکل دن ہیں...... دُعا کر دیجیے۔" میں نے شاہ صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر اُن صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اُنھوں نے نظر انداز کر کے دوسری اور پھر تیسری بار بھی اپنا سوال دہرا دیا...... جس پر بڑے شاہ صاحب نے خاموشی ترک کر دی اور بہت برہم لہجے میں بولے "اچھے دن تم نے گزارے تھے، اب بُرے دن کیا تمھاری جگہ کوئی اور گزارے گا۔"

یہ بات سونے میں تولنے کی تھی۔ جب ہم پر اچھے دن تھے تب تو کبھی ہم نے صاحبِ دُعا کے پاس جا کر نہیں کہا تھا کہ کمال ہو گیا میں بہت مزے میں ہوں...... لیکن جب بُرے دن آئے تو میں دُعا کرنے والوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں۔ میں ایسا کیوں نہیں کرتا کہ یہ ناخوش گوار اور مشکل دن بھی قہقہے لگا کر گزار لوں۔ اِن بُرے دنوں میں بھی زبان پر یہ نہ آئے کہ صاحب! میں بہت تنگ ہوں۔

یاد رکھیے! فقیر تین جھوٹ ضرور بولتا ہے:

- جب وہ بھوکے پیٹ ہو تو پیٹ بھرا ہوا ظاہر کرتا ہے۔
- جب مشکل میں ہو تو خود کو خوش ظاہر کرتا ہے۔
- جب بیمار ہو تو اپنے آپ کو صحت مند ظاہر کرتا ہے۔

یہ دراصل اندازِ شکر گزاری ہے...... لیکن جب میں صحت مند ہوتا ہوں تو کبھی کسی کو روک کر نہیں کہتا کہ دیکھو، رب نے مجھے تندرستی کی نعمت سے نوازا ہے...... تو پھر میں بیماری میں واویلا کیوں کرتا ہوں؟ اِسی طرح مشکل دنوں میں جب ہم سے کوئی حال پوچھتا ہے تو ہم بہت مریل سی آواز میں کہتے ہیں "اللہ کا شکر ہے۔" اِس انداز اور آواز میں کہیں یہ شکوہ چھپا ہوتا ہے کہ کاہے کا شکر...... !دیا ہی کیا ہے رب نے......؟

ضروری ہے کہ ناسازگار حالات میں بھی جب ہم یہ کہیں ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے'' تو اُس آواز میں جذبۂ شکر گزاری اور جوش درحقیقت موجود ہو۔ یہ آواز ہمارے دل سے اُٹھنی چاہیے۔ اور جہاں بھی ہماری بداحتیاطی، بے پروائی یا بے تدبیری کی وجہ سے حالات خراب ہو جائیں تو ہم یہ نہ کہا کریں کہ نظر لگ گئی ہے......! کیونکہ ننانوے فی صد Cases میں حالات کی خرابی کے پیچھے ہماری بے تدبیری کا دخل ہوتا ہے۔

عبادت کے باطنی وظاہری اثرات

سوال: علم اور عقل سے کیا مراد ہے؟ ایک مسلم اور غیر مسلم کی Meditation اور مجاہدے میں کیا فرق ہے؟

جواب: علم ایک ایسی چیز ہے جو غلط اور صحیح میں تمیز کرنا سکھاتی ہے جب کہ عقل اچھے اور بہت اچھے میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ علم کی بنیاد پر ہم حق و باطل کو پرکھنا سیکھتے ہیں جب کہ عقل کی وجہ سے بہت اچھے عمل کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور شیطان کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں...... فرشتوں نے سجدہ کر دیا...... لیکن شیطان نے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھا کر فضیلت بخشی...... حروفِ مقطعات کا تعلق بھی علم الاسماء سے ہے۔

علم الاسماء کو علم رُوحانی یا علم باطنی کہہ لیجیے۔ یہ ایسا علم ہے جو کائنات کی بنیاد بنتا ہے...... اِس پر ساری کائنات کام کر رہی ہے۔ یہ علم گویا کائنات کی کنجی ہے۔

کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیروکار ہو، یہ علم Genetically اُس میں Transfer ہوا ہے فرق یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ مجاہدے، نیکیاں اور عبادات کر کے اس علم کو Further develop اور Polish کر لیتے ہیں...... جب کہ دوسری طرف ایک بڑی اکثریت اِس علم کو نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش نہیں کرتی۔ یوں اُن میں علم رُوحانیت پیدا نہیں ہوتا۔

ہر مذہب میں رُوحانیت کے کوئی نہ کوئی SOPs (Standard operating procedures) ہوتے ہیں۔ اسلام میں یہ SOPs شریعت کہلاتے ہیں۔ کوئی کام اُس وقت تک مناسب انداز میں نہیں ہو سکتا جب تک اُس سے متعلق SOPs کو Follow نہ کیا جائے۔

اگر ہم اپنے مذہب کا مطالعہ کریں تو اللہ تعالیٰ نے امر و نہی کا جو Standard ہمیں دیا وہ SOPs ہیں...... جو شخص جس قدر اِن کی پیروی کرے گا، اُس میں اُسی قدر رُوحانیت اُجاگر ہو جائے گی...... فرق ڈگری کا رہ جائے گا۔

جہاں تک دیگر مذاہب کا تعلق ہے، ہم عموماً اُنھیں کوئی Allowance دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہم اُن

کے حوالے سے بعض اوقات اس قدر سختی اختیار کر لیتے ہیں کہ گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

کچھ مذاہب اور کتب الہامی ہیں۔اُن میں موجود احکامات بھی اللہ تعالیٰ کے جاری کردہ ہیں...... فرق یہ ہے کہ وہ کتب اُس زمانے کے لوگوں کے لیے تھیں۔ ہر بعد میں آنے والی الہامی کتاب پہلے والی کتاب کا Revised edition تھی۔زبور، توریت، انجیل، سب رب تعالیٰ کے کلام پر مبنی الہامی کتابیں ہیں۔اُس زمانے کے لوگوں نے اپنے دور میں نازل ہونے والی کتاب کے احکامات کی پیروی کی وہ اہلِ ایمان کہلائے اور وہ بخشے جائیں گے...... لیکن جب نئی کتاب اور نیا رسول آ گیا تو پھر اُن پر ایمان لانا ضروری ٹھہرا۔ جن لوگوں نے اُس نئی کتاب اور نئے رسول کو مانا وہ حق پر تھے جب کہ اُن کا اِنکار کرنے والے سزا کے مستحق ٹھہرے۔ جب صرف زبور تھی تو اُسے اللہ کی کتاب اور حضرت داوٗد علیہ السلام کو نبی ماننے والے لوگ حق پر تھے اور اپنے اعمال کی بنیاد پر وہ جنت میں جائیں گے۔

جب توریت آ گئی تو یہ زبور کا Revised edition تھا۔تب اُس زمانے کے لوگوں کا فرض تھا کہ وہ توریت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے۔ جنھوں نے ایسا کیا وہ اہلِ حق کہلائے۔اِسی طرح بعد میں جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل پر ایمان لائے تو آپ ﷺ کی بعثت تک ایسا کرنے والے لوگ اہلِ ایمان قرار دیے گئے...... لیکن جب آپ ﷺ نے اعلان نبوت کر دیا تو سب کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ آپ ﷺ کو آخری نبی اور قرآنِ پاک کو آخری کتاب مان لیں...... اُس وقت سے لے کر قیامت تک کے سب لوگوں کے لیے ضروری ٹھہرا کہ وہ قرآنِ پاک کو اللہ کی آخری کتاب اور آپ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی اور رسول مانیں۔

رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اہلِ علم بھی ہیں۔(اہل علم عرف عام میں اولیاء اللہ کو کہا جاتا ہے) قرآنِ پاک میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اہل کتاب کی نیکیاں اور اچھے کام رائگاں نہیں جائیں گے۔اُن کو اُن کے نیک اعمال کا اجر دُنیا ہی میں مل جائے گا...... البتہ آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں...... آخرت میں اُن کے لیے سزا کے سوا کچھ نہیں کیونکہ اُنھوں نے آپ ﷺ کو خاتم النبیین اور قرآن پاک کو آخری الہامی کتاب نہیں مانا۔ چونکہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرکشی کی اس لیے اُنھیں سزا ضرور ملے گی۔

جب اللہ تعالیٰ غیر مسلموں کے نیک اعمال کا صلہ دیتا ہے تو ایسے غیر مسلم جن کے Genes میں رُوحانیت موجود ہے اور وہ اُس کو اللہ کے احکامات کی پیروی اور نیک کاموں کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں باوجود اس کے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے، اللہ تعالیٰ اُن کے نیک اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔اُن کے عوض اُنھیں رُوحانیت اور کشف و کرامات جیسی قوتیں عطا فرما دیتا ہے۔یاد رہے کہ جب کسی مسلمان سے خلاف عادت کوئی کام سرزد ہو تو اُسے کرامت کہا جاتا ہے جب کہ غیر مسلم کا ایسا کام ''اِستدراج'' کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کو اُن کے اچھے اعمال کا صلہ آخرت میں Multiply کر کے دیا جائے گا جب کہ غیر مسلموں

کو مختلف انعامات معہ رُوحانیت اِسی دُنیا میں دے دیے جاتے ہیں۔ مسلم ہوں یا غیر مسلم، دونوں رب ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں...... فرق یہ ہے کہ غیر مسلموں نے چونکہ اللہ کی حکم عدولی کی اِس لیے آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں جب کہ نیک مسلمان جو اِس دُنیا میں مجاہدہ کرتے ہیں اور رُوحانیت کی راہ پر چلتے ہیں، قیامت کے روز اُن کے چہرے نور سے چمک رہے ہوں گے۔ غیر مسلم اِس اعزاز سے محروم رہیں گے۔

سوال: مختلف Glands کا رُوحانی عبادات میں کیا کردار ہے؟

جواب: جب ہم بدی اور گناہ کے کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ہمارے اندر ایک عجیب سا خوف پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ہم لوگوں کی نظروں سے چھپ کر وہ گناہ کر رہے ہوتے ہیں...... چوری کا یہ انداز ہمارے اندر خوف پیدا کرتا ہے۔ جب ہم مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں تو ڈر اور خوف کی ایک مسلسل کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری Psychological health (نفسیاتی صحت) تبدیل ہونے لگتی ہے۔ اِس ڈر اور خوف کی وجہ سے ہمارے چہرے کی چمک اور رونق چھن جاتی ہے...... اخلاقی جرأت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم کسی کے سامنے سر اُٹھا کر حوصلے سے سچی بات نہیں کر سکتے کیونکہ ہم ایک مسلسل ڈر اور خوف کی حالت میں زندہ ہوتے ہیں۔

اِس کے برعکس جب ہم نیکی کی طرف جاتے ہیں تو ہمارے مختلف Glands relax کر جاتے ہیں...... جس سے ہمارے دماغ میں ایک کیمیکل پیدا ہوتا ہے۔ (ہمارا مغز ایک Fluid کے Envelope میں Protected ہے) یہ کیمیکل ہمیں خوشی کا احساس عطا کرتا ہے...... خوشی ہو یا غم۔ دونوں صورتوں میں مغز کے Fluid میں مختلف Chemicals پیدا ہوتے ہیں...... جن سے ہماری Body chemistry میں تبدیلی آتی ہے اور ہمارے چہرے پر مختلف تاثرات اُبھرتے ہیں۔ جب ہم نیک اعمال کرتے ہیں تو اُس مخصوص کیمیکل سے چہرے پر چمک آتی ہے جسے ہم "چہرے پر نور" کہتے ہیں۔

نیک اعمال کے نتیجے میں جب ہمارا تعلق رب تعالیٰ سے جڑتا ہے تو وقتی طور پر ہمارا تعلق دُنیاوی جھمیلوں سے کٹ جاتا ہے۔ اِس وجہ سے دُنیاوی خدشات و تفکرات انسان عارضی طور پر بھول جاتا ہے۔ تب انسان سوچتا ہے کہ میرا رب موجود ہے...... وہ میرا پالن ہار ہے...... بہت مہربان ہے۔ انسان کو عجیب اطمینان کا احساس ہوتا ہے جس سے اُس کے Muscles (اعصاب) Relax کر جاتے ہیں اور ساتھ ہی چار غدود (glands) Active ہو جاتے ہیں جن کے مختلف اثرات اُس پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سینہ کے پاس جو Gland ہے اُس سے جو کیمیکل پیدا (Generate) ہوگا اُس سے ہماری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار اور گہرائی آئے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عبادت گزار لوگوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور خمار ہوتا ہے۔ شاعر کی زبان میں اُنھیں نشیلی آنکھیں کہا جاتا ہے۔ اسی Gland کے Generate کیے ہوئے کیمیکل کا اثر دماغ کے پچھلے حصے میں آتا ہے جس سے وہاں موجود Cells (خلیوں) کی Soothing ہو جاتی ہے۔ دماغ کا یہ حصہ جو Long-term memory (طویل المیعاد یادداشت) پر

مشتمل ہے، جونہی اُس کی Soothing ہوتی ہے، ہمارے اندر سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عبادت گزار لوگ عام طور پر بہت پُرسکون اور مطمئن ہوتے ہیں۔ ایک Gland ہماری Back (کمر) پر Spine (ریڑھ کی ہڈی) کے Half سے ذرا اُوپر بائیں طرف ہے...... جب ہم رُکوع کی حالت میں ہوتے ہیں تو وہ Gland مسلسل generate کرتا ہے اور اُس سے نکلنے والا کیمیکل ہماری کمر کے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے۔ اِسی لیے جو لوگ صحیح طریقے سے رکوع کرتے ہیں اُن کی کمر میں درد نہیں ہوتا۔ اِسی طرح نچلے دھڑ کی Left side (بائیں جانب) پر بھی ایک Gland موجود ہوتا ہے جو کیمیکل Generate کرتا ہے۔ یوں ہمارے جسم میں چار گلینڈز کیمیکل Generate کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عبادات انسان کی بیٹری چارج کرتی ہیں۔

نماز کی رکعات کی تعداد اور اوقات کو جب ہم سائنسی نظر سے دیکھتے ہیں تو میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ انسان صبح اُٹھ کر Exercise (ورزش) کرلے تو سارا دن چاق و چوبند رہتا ہے۔ عجب بات ہے کہ مختصر ترین نماز فجر کی ہے...... صرف دو سنت اور دو فرض۔ حالانکہ صبح کے وقت انسان Fresh ہوتا ہے۔ اِسی طرح طویل ترین نماز عشاء کی ہے جب انسان بے حد تھکا ہوا ہوتا ہے۔ دراصل اِس کی بھی سائنسی وجوہات ہیں۔ اللہ نے رات آرام اور دن کام کاج کے لیے بنایا ہے۔ جب ہم رات بھر کے آرام کے بعد صبح سو کر اُٹھتے ہیں تو اُس وقت خود کو صرف Remind کراتے ہیں کہ رب تعالیٰ ہمارا آقا و مالک ہے اور ہم اُس کے غلام ہیں۔ نماز فجر میں جب ہم اپنے رب کے سامنے جھکتے ہیں تو ہماری Blood circulation (دورانِ خون) جو سونے کی وجہ سے Slow down ہو چکی ہوتی ہے وہ اپنے Natural pace (قدرتی رفتار) پر چلی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بلیاں، کتے، Leopards (چیتا) وغیرہ جب سو کر اُٹھتے ہیں تو انگڑائی لیتے ہیں...... اس انگڑائی سے وہ اپنی Blood circulation کو Normalise کر رہے ہوتے ہیں۔

North pole (قطب شمالی) پر جو علاقے واقع ہیں وہاں سال میں چھ سے آٹھ مہینے تک برف باری رہتی ہے...... وہاں کے جانور ایسے موسم میں Hibernation میں چلے جاتے ہیں۔ (آپ نے دیکھا ہو گا کہ کمپیوٹر کو کچھ دیر کے لیے بغیر کام کیے On چھوڑ دیا جائے تو یہ Sleeping mode میں چلا جاتا ہے...... اِسے بھی Hibernation میں جانا کہا جاتا ہے۔) Hibernation سے سانس اور Blood Circulation کی رفتار Slow down ہو جاتی ہے۔ انگڑائی لینے سے Stretched Muscles متحرک (Active) اور Blood circulation (دوران خون) Normalise ہو جاتے ہیں...... فجر کی نماز سے ہمارے اعصاب اور دورانِ خون معتدل ہو جاتا ہے۔

فجر اور ظہر کی نماز کے دوران سب سے طویل وقفہ ہے۔ اِس وقفے میں ہم دُنیاوی اُمور سرانجام دیتے ہوئے مختلف شدائد سے مقابلہ کرتے ہیں...... مختلف Pressures کو Face کرتے ہیں۔ ظہر کے وقت تک ہمارے اعصاب مختلف پریشرز کی وجہ سے بہت تھک چکے ہوتے ہیں...... ایسے میں ہم نماز ظہر ادا کرتے

ہیں۔ اِس دوران دُنیاوی تفکرات ہمارے ذہن سے مِٹ جاتے ہیں اور ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ایک Superme power ہے جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ وہ ہمارا آقا اور ہم اُس کے بندے ہیں۔ یہ سوچ ہمیں توانائی عطا کر کے نئے سرے سے دُنیاوی اُمور اور پریشرز کو Face کرنے کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ ہم نماز کے بعد دوبارہ دُنیاوی اُمور کی انجام دہی میں جت جاتے ہیں۔ عصر کے وقت تک دوبارہ تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ہم ایک بار پھر اللہ کے حضور جھک جاتے ہیں...... نئی Energy اور حوصلہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اِس کے بعد مغرب کی نماز تک کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی کے ذریعے ایک بار پھر تفکرات سے نجات حاصل کرتے ہیں اور تازہ دم ہو کر مختلف سماجی اور گھریلو مصروفیات سر انجام دیتے ہیں یہاں تک کہ عشاء کی نماز کا وقت آ جاتا ہے۔ سونے سے پہلے بہت سی پریشانیاں اور Tensions ہمارے پاس جمع ہو چکی ہوتی ہیں جن کے ساتھ ہم اچھی نیند نہیں لے سکتے۔ اِن سے چھٹکارا پانے کے لیے ہم ایک بار پھر اللہ سے رابطہ جوڑتے ہیں اور طویل ترین عشاء کی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ نماز ہمیں Relax کر دیتی ہے۔

جدید سائنسی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ نماز یوگا کی Most advanced form ہے۔ نماز میں التحیات کا جو Posture ہے یوگا کی زبان میں وہ سب سے زیادہ Relaxing آسن ہے۔ یہ جسم کے تمام اعصاب بشمول Neck muscles کو Relax کر دیتا ہے۔ اِس لیے مرد کو دورانِ نماز ایک مخصوص انداز میں بیٹھنے کا حکم ہے۔ جب اس Posture میں اُس کی ٹانگ میں Bend آتا ہے تو Thigh area بالکل Straight رہتا ہے، Calfs ایک خاص Angle سے مڑتی ہیں اور Ankle joint ایک مختلف زاویہ سے مڑتا ہے اور اُس پر ہمارا Body weight آتا ہے۔ وہ خون جو کرسی پر بیٹھے یا مسلسل کھڑے رہنے سے Calf area (پنڈلی) میں آ گیا ہوتا ہے پریشر دیتے ہیں کہ وہ واپس چلا جائے۔ (کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی بلڈ سرکولیشن بہت آئیڈیل ہو...... اکثر وہ Slow ہو جاتی ہے۔)

اِس مخصوص اندازِ نشست سے جمع شدہ خون واپس چلا جاتا ہے۔ اِسی طرح جب ہم اپنی دائیں ٹانگ کو Bend کرتے ہیں تو اُس کا Half area of the calf انڈر پریشر آتا ہے۔ پاؤں کو کھڑا کر کے جب ہم ٹخنے کو Bend کرتے ہیں تو خون کا پریشر اوپر جانے کی بجائے نیچے آتا ہے جس سے دونوں ٹانگوں میں پریشر کا Differential پیدا ہوتا ہے جس سے ہماری Blood circulation بہت تیز ہو جاتی ہے۔

ہمارے التحیات کے Posture میں ہماری کمر بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ ہمارے بازو سیدھے اور مکمل Stretched ہوتے ہیں جس سے ہمارے کندھے اور گردن کے اعصاب Relax ہو جاتے ہیں۔ ہم جس قدر اعصابی لحاظ سے پُرسکون ہوں گے نماز میں یکسوئی اُسی قدر بڑھ جائے گی۔ حدیث مبارکہ ہے کہ "تم اِس طرح نماز پڑھو گویا رب تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو...... اگر تم اُس کو نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھتا ہی ہے۔"

جب انسان مکمل یک سوئی اور توجہ سے نماز ادا کرتا ہے تو وہ دُنیاوی تفکرات و پریشانیوں سے مکمل طور پر کٹ جاتا ہے وہ مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اُس کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ اور یوں اُس کے اندر کا سارا غبار دُھل جاتا ہے۔ رب تعالیٰ پر اُس کا یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے اور اُس کی زندگی میں سکون در آتا ہے۔

نورِ بصیرت

سوال: نظامِ شمسی کس طرح تباہ ہوگا؟ قیامت کیسے برپا ہوگی؟ اگر قیامت اس شدت سے برپا ہوگی کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں گے تو پھر انسان کیسے دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟

جواب: ہم عموماً اِس قسم کے سوالات پر استغفراللہ یا لاحول پڑھتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سوال خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو...... ممکن ہو تو اُس کا جواب دے دینا چاہیے تاکہ سوال کرنے والے کا ذہن Clear اور مطمئن ہو جائے۔

کل ستر ہزار (70,000) جہان اور بیس ہزار (20,000) عالم ہیں...... زمین کے اردگرد موجود سیاروں کو ملا کر ایک عالم بنتا ہے۔ اِس نظامِ شمسی میں سب سے بڑا ستارہ سورج ہے، جس پر کئی ہزار سینٹی گریڈ کے حساب سے ٹمپریچر موجود ہے...... لیکن وہ درجۂ حرارت رفتہ رفتہ، بتدریج کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ زمین کی گردش دو طرح سے ہے:

- زمین اپنے Axis پر گھوم رہی ہے۔
- زمین مدار (Orbit) میں گھوم رہی ہے۔

زمین پر موجود چیزوں کو کششِ ثقل نے Hold کر رکھا ہے۔ اگر زمین کے اپنے Orbit (مدار) میں گردش کرتے ہوئے Fraction of a degree کا بھی فرق آ جائے تو زمین کسی دوسرے سیارے کے ساتھ ٹکرا جائے گی۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ بروزِ قیامت، سورج سوا نیزے پر آ جائے گا...... اگر ہم سائنس کی نظر سے دیکھیں تو زمین جو اپنے مدار میں گھوم رہی ہے، اِس میں خلل واقع ہو جائے گا اور زمین کشش کے اُس توازن (Balance) سے Out ہو جائے گی جس توازن نے اِسے ایک مقررہ جگہ پر قائم رکھا ہوا ہے۔ چونکہ سورج کی Gravitational force سب سے زیادہ ہے اس لیے زمین تیزی سے سورج کی طرف لپکے گی۔

سورج کی حدت کی وجہ سے سمندر اُبل پڑیں گے اور پہاڑ Melt ہو جائیں گے۔ چونکہ زمین اپنے محور کے گرد Spin ہو رہی ہوگی۔ اس لیے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ یوں قیامت کا منظر سوفی صد سائنس سے ثابت ہو جاتا ہے۔

اب یہ سوال کہ پتھر کے پہاڑ جو کئی ہزار ٹن Compression سے وجود میں آتے ہیں، اُن کے Melt ہونے کے بعد باقی کیا بچے گا کہ انسان دوبارہ زندہ ہو جائیں گے......؟

موجودہ سائنسی ترقی پر غور کریں تو معاملہ سب کی سمجھ میں آ جائے گا۔ چند سال قبل انسان نے کلوننگ کا کامیاب تجربہ کیا اور دُنیا کی پہلی کلوننگ ڈولی کے نام سے وجود میں آئی۔ یہ کلوننگ DNA سے ہوئی اور DNA خواہ کسی بھی ٹمپریچر پر ڈال دیا جائے، وہ تباہ نہیں ہوتا۔

رب تعالیٰ کا یہ فرمان کہ میں انسان کو دوبارہ اصلی حالت میں زندہ کروں گا...... یہ دراصل DNA کے دوبارہ سے بال و پر نکالنے کا ذکر ہے۔

چونکہ زمین پر آکسیجن بند ہو جائے گی...... یہاں صرف Hot gases ہوں گی اور ٹمپریچر بہت شدید ہو گا...... تمام چیزیں اُلٹ پلٹ ہو چکی ہوں گی...... گمانِ غالب یہ ہے کہ اس Atmospheric change سے کلوننگ کا Process بہت تیزی سے جاری ہو جائے گا...... اور وہ مرحلہ جو سائنس دان تین چار دنوں میں طے کرتے ہیں وہ تین چار سیکنڈز میں مکمل ہو جائے گا۔

اِس کا جواب یہی ہے کہ جہاں اُس انسان کا DNA موجود ہو گا، وہیں سے وہ زندہ کر دیا جائے گا۔ اگر اِس نکتے پر غور کر لیا جائے تو انسان کے دوبارہ احیا کی بات سمجھ میں آ جائے گی۔

سوال: تصوف کی روشنی میں کلمہ کی شرح سے کیا مراد ہے؟

جواب: Interpretation اور Explanation of law دو مختلف چیزیں ہیں۔ شرح Interpretation of law کہلاتی ہے۔ اسلام کی ابتدا نفی سے ہوتی ہے۔ ''لا'' کہہ کر انسان اپنے سابقہ عقائد، خیالات اور عادات کی نفی کرتا ہے۔ قرآن پاک میں رب تعالیٰ نے جن چیزوں پر بہت زور دیا اُن آیات کی ابتدا نفی سے کی ہے۔

- نہیں ہے اللہ کے سوا کوئی معبود......
- نہیں پہنچ سکتا تم میں سے کوئی نیکی کو......

کیوں کہ جب تک پہلے سے موجود چیز کو رد نہ کر دیا جائے، نئی چیز اُس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ پہلا Concept (تصور) رد ہو گا تو نیا Concept اُس کی جگہ آئے گا۔ اگر مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے تو اُس

وقت تک سچ بولنے کی عادت نہیں ہو سکتی جب تک میں جھوٹ کو رد نہ کر دوں۔ جب تک میں شرک کو رد نہیں کروں گا واحدانیت اُس کی جگہ نہیں لے گی۔ اسی طرح جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو ''لا'' سے ابتدا کرتے ہیں اور اپنے گزشتہ اعتقادات، پرانے عقیدے، خیالات اور سابقہ زندگی کی نفی کرتے ہیں...... اُن سب کی جگہ یہ تصور جنم لیتا ہے کہ صرف اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب ہم نے اللہ کو لائق عبادت مان لیا تو گویا ہم نے رب کی بندگی اور اطاعت کا اقرار کر لیا کیونکہ عبادت لفظ ''عبد'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ''بندہ'' اور ''بندہ'' لفظ ''بندگی'' سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے اطاعت۔ گویا ہم نے کلمہ پڑھ کر اقرار کر لیا کہ ہم سوائے رب تعالیٰ کے کسی کے احکامات کی پابندی نہیں کریں گے ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پوری طرح پابندی کریں گے۔ کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کی بندگی اختیار کی جاسکے۔

جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو رب تعالیٰ کے ساتھ ایک Commitment کرتے ہیں کہ ہم نے سمجھ اور جان لیا کہ تیرے سوا کوئی ایسا معبود نہیں جس کی بندگی کی جائے...... تو ہی معبود ہے۔

بندگی صرف نماز، روزہ اور زکوٰۃ تک محدود نہیں بلکہ رب تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت ضروری ہے۔ جب ہم مزید گہرائی میں اُترتے ہیں تو اپنے تمام عقائد، اعتقادات اور خیالات ختم کر کے خود کو اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے ماتحت کر لیتے ہیں کہ ہم صرف وہ خواہش کریں گے اور وہ عمل کریں گے جو رب تعالیٰ چاہے گا۔ یہی بندگی ہے...... اور یہی عبادت ہے۔ اِس کے بعد جب ہم نے یہ کہا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ﷺ ہیں...... (کلمہ میں تو محض رسول ﷺ کہا گیا ہے لیکن میں اپنے جذبے کے تحت ''سچے'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں) یوں ہم نے اقرار کیا کہ صحیح پیغمبر آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ جو بھی پیغام لے کر آئے اُس کی اطاعت ہم پر فرض ہو گئی۔

کلمہ طیبہ پڑھ کر ہم یہ تمام Commitments کر رہے ہیں کہ ہماری سوچیں، فیصلے اور اعمال سب اللہ کے احکامات کے تابع ہو جائیں گے اِس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا آخری اور سچا نبی ماننے کے بعد ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ہم آپ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کو سچ مانیں اور اُس کی پیروی کریں۔ تصوف کی روشنی میں کلمہ طیبہ کی یہی شرح ہے۔

سوال: کیا عیسائی ملازمہ کے ہاتھوں دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز ہو جائے گی؟

جواب: آپ ﷺ کے ذاتی خادموں میں ایک نوعمر لڑکا تھا جو یہودی تھا...... وہ آپ ﷺ کے سارے ذاتی کام سرانجام دیتا...... آپ ﷺ اُس کے ساتھ بہت شفقت فرماتے۔ ایک بار جب وہ بیمار ہوا تو آپ ﷺ چل کر اُس کے گھر تشریف لے گئے۔ اُس کے ماتھے پر اپنا دست مبارک رکھا اور کئی منٹ تک اُس کی عیادت فرماتے رہے۔

حبشہ میں جب مسلمان ہجرت کے بعد پناہ گزین ہوئے اور اہلِ مکہ نے اُن کی واپسی کا مطالبہ کیا تو یہ ایک کیتھولک عیسائی بادشاہ ہی تھا جس نے مسلمانوں کو ظالم کفار کے ہاتھوں لوٹانے سے انکار کر دیا۔

بہتر یہی ہے کہ ہم کسی کو حقیر نہ سمجھیں۔ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے ہو، اس کی توقیر کریں۔ یاد رکھیے! اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ تمام لوگوں کے لیے رحمت تھے۔ آپ ﷺ وہ برستی بارش تھے جس نے کبھی یہ تمیز نہیں کہ دوست پر برس رہی ہے یا دشمن پر۔ آپ ﷺ تو رحمت کی ایسی بارش ہیں جس سے پوری کائنات کو فائدہ ملتا ہے۔

ہم آپ ﷺ کے اُمتی ہیں، جس طرح صحابہ کرامؓ لوگوں کے لیے بہت شفیق اور مہربان تھے اور اُن کے اخلاق سے متاثر ہو کر غیر مسلم جتھوں کی شکل میں مسلمان ہوئے...... یہ اُن کی بلاتفریق محبت اور شفقت کا اثر تھا۔

جب ہم کسی کو حقیر سمجھتے ہیں تو ہم اُنھیں خود سے دور کر دیتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لیے مسلمان کو زیادہ مہربان اور شفیق ہونا چاہیے...... تاکہ وہ ہم سے قریب ہو جائیں...... اور اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو جائیں۔

سوال: یہ زمین بانوے Elements (عناصر) سے بنی ہے۔ کیا دیگر Planets پر بھی اِتنے ہی عناصر موجود ہیں؟

جواب: تمام بنیادی عناصر کی Formation ایک جیسی ہے۔ فرق صرف اِن کی Chemical اور Physical properties میں آئے گا۔ کسی بھی چیز کو جب ہم حدت پہنچاتے ہیں تو تمام Elements (عناصر) کی کیمیکل اور فزیکل Properties تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح جب بھی کسی چیز کو High speed پر Spin کیا جائے تو اُس کی Properties بھی تبدیل ہو جائیں گی۔

یورینیم یا پلوٹونیم کیسے Enrich کیا جاتا ہے؟

اِس کا سادہ Explanation دے دیتا ہوں۔ یورینیم کو صاف کرنے کے بعد اس قدر گرم کیا جاتا ہے کہ وہ گیس میں تبدیل ہو جائے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مادے کی تین حالتیں ہیں...... ٹھوس، مائع اور گیس۔ یورینیم پہلے مائع بنتا ہے...... پھر گیس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یورینیم کی اِن Hot gases کو Centrifuge میں پائپوں کے ذریعے ٹرانسپورٹ کیا جاتا ہے۔ یہ سنٹری فیوج ایک ملین سے زیادہ Revolution پر Spin کر رہی ہوتی ہے۔ اس کے اندر مارجن سٹیل سے بنا ہوا روٹر Spin کر رہا ہوتا ہے جس میں جوں جوں گیس Spin ہوتی ہے توں توں اُس کی Enrichment ہوتی ہے۔ پھر Measurement کے ذریعے اِس Enrichment کا اندازہ ہوتا رہتا ہے...... حتیٰ کہ اُس کی

Weapon-grade enrichment ہو جاتی ہے۔ اس طرح Spin کرنے سے Properties تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اِس ضمن میں ایک چیز اور Clear کرتا چلوں...... ہم خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں...... باقی جگہوں پر Clockwise حرکت (Movement) ہوتی ہے لیکن خانہ کعبہ کے گرد طواف Anti-clockwise ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟

زمین کی اپنے Axis کے گرد Movement (حرکت) Clockwise ہے۔

آپ نے بچپن میں نویں کلاس میں پڑھا ہوگا کہ بجلی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ Static charge پیدا کرنے کا ایک آسان طریقہ Friction (رگڑ) ہے۔ آپ نائیلون پر پلاسٹک کے کسی راڈ کو رگڑیئے...... پھر اُس راڈ کو کسی کاغذ یا بالوں کے قریب لے جائیں، وہ کاغذ اُس راڈ کی طرف کھنچنے لگے گا لیکن اگر آپ اُسی راڈ کو پہلے اپنے ہاتھ سے چھولیں اور پھر اُس سے کاغذ کے پرزے اُٹھانے کی کوشش کریں تو وہ نہیں اُٹھائے جائیں گے۔ دراصل رگڑ (Friction) سے Static charge پیدا ہو رہا ہوتا ہے جو کاغذ کو اپنی جانب کھینچتا ہے...... لیکن اگر ہم راڈ کو ہاتھ سے Touch کرلیں تو وہ Static charge ground ہو جائے گا۔

اگر دو پتلے پتلے Metal wheels لے کر اُنھیں ایک دوسرے کے قریب کر کے ایک دوسرے کے Opposite (مخالف سمت میں) گھمائیں۔ جس تیزی سے وہ ہوا کو کاٹتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے تیزی سے گزرتے ہیں اُسی قدر اُن میں چارج اور انرجی پیدا ہوتی ہے۔ یہ انرجی اصل میں کرنٹ ہے۔

اِسی طرح زمین Clockwise گھوم رہی ہے اور آپ طواف کرتے ہوئے Anti clockwise گھومتے ہیں جس سے Energy (طاقت) Generate (پیدا) ہوتی ہے اور رُوحانی طاقت (Power) بڑھ جاتی ہے نتیجتاً دُعائیں جلدی قبول ہونے لگتی ہیں۔

بعینہٖ جب کوئی چیز Spin کی جائے گی اور وہ دو Objects کے درمیان پھنسی ہوگی تو اُس سے Generate ہونے والی انرجی سے اُس چیز کی Chemical اور Pysical properties تبدیل ہو جائیں گی۔ دوسرے Planets پر چونکہ ٹھنڈک یا Heat بہت ہے اِس لیے ٹمپریچر کی Variation اور اُن Planets کے گھومنے کی رفتار سے اُن Elements کی Chemical اور Physical properties تبدیل ہو جاتی ہیں۔

جب کسی مادہ کو آکسیجن کی موجودگی میں Burn کریں تو اُس کے By-products کچھ اور ہوں گے لیکن اگر اُسی مادہ کو آکسیجن کی غیر موجودگی میں Burn کریں تو By-products کچھ اور ہوں گے۔ جن Planets پر آکسیجن سرے سے موجود ہی نہیں وہاں Elements کی Characteristics اور بھی تبدیل

ہو جائیں گی۔ زمین اور دیگر Planets میں یہی فرق ہے۔ Chemical and physical properties کو تبدیل کرنے کے لیے پریشر بہت Count کرتا ہے۔ اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ زمینی خدوخال (Topography) کیا ہے۔ یہ Pressure زمینی یا جغرافیائی خدوخال پر Depend کرتا ہے (پاکستان میں Scientific calculation کے لیے جو Average atmospheric pressure لیا جاتا ہے وہ 14.65 lbs/PS1 ہے) حتیٰ کہ چولہوں میں جلائی جانے والی گیس کے Flow اور پائپ کے اندر کے Volume میں Atmospheric pressure بہت Count کرتا ہے۔

Atmospheric pressure، آکسیجن کی موجودگی یا غیر موجودگی اور حرکت یہ سب Factors کسی بھی چیز کی کیمیکل اور فزیکل Properties پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ قصہ مختصر، دوسرے Planets (سیاروں) پر Elements بھی ہیں لیکن اُن کی Properties مختلف ہیں۔

سوال: سورۃ الکھف میں ذوالقرنین کا ذکر ہے...... وہ رسول تھے یا صرف شہنشاہ؟

جواب: روایات کے مطابق کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں آئے جن میں سے صرف چالیس (40) پیغمبروں کے نام قرآنِ پاک میں ملتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک لاکھ تیئس ہزار نو سو ساٹھ پیغمبر کون کون سے تھے؟ اُن کا کوئی Trace نہیں ملتا۔

گوتم بدھ اور بدھ مت کی بات ہو تو اسلام سے کئی ہزار سال قبل یہ مذہب متعارف ہوا۔ اس کے بنیادی اُصول تقریباً وہی ہیں جو اسلام بیان کرتا ہے...... دیگر مذاہب جو Divine (اِلہامی) ہیں، اُن میں بھی وہی Principles (اُصول) ملیں گے۔ چونکہ دُنیا کے تمام الہامی مذاہب کے اُصول تقریباً یکساں ہیں۔ اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ ذوالقرنین ایک پیغمبر تھے یا محض ایک نیک آدمی...... البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی نیکی اس معیار کی تھی کہ اُن کا ذکر قرآنِ مجید میں اچھے لفظوں میں کیا گیا ہے...... جس کی وجہ سے وہ ہمارے لیے باعث تعظیم ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم عطا کیا۔ کیا اماں حوا کو بھی کوئی ایسا علم عطا ہوا؟

جواب: اماں حوا علیہ السلام کو بابا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جس طرح ایک بچہ جب ماں کے بطن سے جنم لیتا ہے تو اُس کی رگوں میں ماں اور باپ دونوں کا خون ہوتا ہے۔ ماں باپ کے جینز (Genes) میں جو فطرت ہے وہ بھی بچے میں Genes کے ذریعے Transfer ہوتی ہے۔ ماں یا باپ کی فطرت کا کچھ عکس بچے میں جھلکنے لگتا ہے۔

اسی طرح بابا آدم علیہ السلام کی بہت سی چیزیں اماں حوا علیہ السلام میں جینیاتی طور پر منتقل ہوئیں...... وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے بابا آدم علیہ السلام کو دیا تھا وہ تمام انسانوں میں Genetically ٹرانسفر ہو رہا ہے۔ اسی

وجہ سے تمام انسانوں میں رُوحانیت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ محنت کر کے اُسے Develop اور Polish کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ اِس طرف توجہ نہیں دیتے۔

اماں حوا علیہ السلام میں وہ علم بابا آدم علیہ السلام کی طرح تو موجود نہیں تھا لیکن کچھ نہ کچھ علم جینیاتی طور پر ضرور اُن میں Transfer ہوا تھا۔

ہے کوئی کہ غور کرے!

سوال: فضل شاہ صاحب فرماتے ہیں "طریقت کے قول کی اِبتدا "نون" سے ہے، حقیقت کے قول کی اِبتدا "الف" سے ہے اور معرفت کے قول کی اِبتدا "ب" سے ہے۔" اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: فضل شاہ نور والے صاحب نے اگر یہ بات کہی ہے تو آنکھیں بند کر کے اِس پر یقین کر لیجیے...... کیونکہ آپ علم میں بہت آگے ہیں۔ اُن صاحب سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی جس میں اُنھوں نے مجھے میری اِس راہ کی خبر دی تھی۔ مجھے میری اِس راہ کی خبر دینے والے وہ تیسرے آدمی تھے۔

حروف مقطعات کائنات کی کنجی ہیں۔ پوری کائنات کا System اِنہی حروف سے Operate ہوتا ہے۔

فضل شاہ صاحب نے جو بات کہی ہے، وہ بہت آگے کی بات ہے۔ اِس بارے میں صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ حروف مقطعات میں "ن" بہت Powerful کہلاتا ہے۔ اِس کا تعلق جبر اور شدت سے ہے جب کہ اِس کے مقابلے پر "ص" کا تعلق خالصتاً رُوحانیت سے ہے۔ اِس میں بہت شدت کی رُوحانیت ہے۔ "الف" جلالی ہے کیونکہ اِس کا تعلق براہِ راست رب تعالیٰ سے ہے۔ اِس سے زیادہ گہرائی سے اِن حروف کو بیان کرنے کی اجازت نہیں۔

سوال: کیا حضرت امام رضا رحمتہ اللہ علیہ کا مزار عراق میں ہے؟

جواب: حضرت امام رضا رحمتہ اللہ علیہ کا مزار مشہد میں ہے۔ آپ رُوحانی لحاظ سے بہت Powerful آدمی ہیں، بہت وسیع تصرفات رکھتے ہیں۔ مجھے اُن کے مزار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا اور اُن کے تصرفات انجوائے کرنے کا بھی موقع ملا۔

بدقسمتی سے ہم کچھ بزرگ ہستیوں کو کسی مخصوص فرقے یا School of thought کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ہستیاں اہلِ بیت میں سے ہیں اور ہمارے لیے بے حد قابلِ احترام ہیں۔

ایک بار جب میں عمرہ کے لیے گیا تو تب میں عقیدتاً غزوۂ خندق کے تمام مقامات دیکھنا چاہتا تھا جہاں صحابہؓ نے کمانڈ کی تھی۔ معلوم ہوا کہ اُن تمام جگہوں پر سعودی حکومت نے مسجدیں بنادی ہیں۔ اُن میں سے ایک مقام غزوۂ خندق کا بھی تھا۔ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر ایسی بہترین حکمت عملی کا ثبوت دیا تھا کہ دشمن سرپٹخ کر رہ گیا اور مٹھی بھر مسلمانوں نے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوادیے تھے۔

میرا ڈرائیور سعودی تھا...... جب میں حضرت علیؓ کی کمانڈ پوسٹ پر قائم مسجد میں نماز پڑھ کر باہر نکلا تو ڈرائیور نے کہا کہ بی بی صاحبہؓ (حضرت فاطمہؓ) اِتنی پاورفل تھیں کہ جس جنگ میں بھی آپؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تشریف لے گئیں، اُس میں دشمن برباد ہوگیا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" تب اُس نے ایک مثال دی کہ جیسے جنگ خندق میں بی بی صاحبہؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تھیں اور اُس میں دشمن تباہ ہوا۔

بی بی صاحبہؓ کا ایک مقام تو یہ ہے کہ آپؓ، آپ ﷺ کی سب سے عزیز صاحب زادی ہیں، پھر حضرت علیؓ کی زوجہ محترمہ، پھر حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی والدہ محترمہ اور آپؓ کا چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ آپؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ لیکن افسوس ہم اُن کے سلسلے میں ادب کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ہم اُنھیں ان کے ذاتی نام سے، بغیر کوئی اِلقابات لگائے پکارتے ہیں...... یہ خلاف ادب ہے۔ میں خود بھی اِسی لیے اُنھیں "بی بی صاحبہؓ" کہتا ہوں کیونکہ یہ Safe ہے اور اِس میں گستاخی کا پہلو نہیں نکلتا۔

تمام اہلِ بیت کی عزت بہت ضروری ہے...... حضرت امام رضاؒ بھی اِسی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔

ایک بار کہیں گفتگو کے دوران ایک صاحب نے سوال اُٹھایا کہ کچھ لوگ حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو تو امام مانتے ہیں لیکن وہ اہلِ بیت کے ائمہ کا انکار کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بدقسمتی سے ہم لوگ بعض اوقات اپنے School of thought کی وجہ سے مخالفت میں اِس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ گستاخی کے زمرے میں داخل ہو جاتے ہیں...... علم فقہ کے ائمہ کرام ہوں یا اہلِ بیت کے ائمہ کرام...... سب کا احترام ضروری ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ جو ائمہ آپ ﷺ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کو یہ Advantage (فائدہ) ملا کہ اُن کے پاس علم لدنی جینیاتی طور پر بھی آیا...... جب کہ علم فقہ، علم حدیث، علم تفسیر اور علم شریعت رکھنے والے ائمہ کرام نے علم لدنی محنت کر کے کمایا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت نے ایک مجذوب حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اختیار کی۔ اللہ کو پہچاننے کا جو علم ہے۔ اِس کے حصول کے لیے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جانا پڑا۔ جب کہ اہل بیت کے ائمہ کرام کو یہ علم لدنی Genetically حاصل ہوگیا جسے اُنھوں نے تھوڑی سی محنت سے Polish کرلیا۔

سوال: Virtual sciences میں پیغام کی ترسیل کے وقت ایک Sender اور دوسرا Receiver ہوتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نزولِ قرآن اور شریعت کے لیے Virtual sciences کا Method استعمال کرتا ہے؟

جواب: نزولِ وحی میں تین چیزیں ہیں:

1۔ رب تعالیٰ، جس کا "پیغام" ہے۔ وہ مالکِ کل ہے اور پیغام بھیجنے والا یعنی Sender ہے۔

2۔ اللہ کے ایک پیامبر ہیں، حضرت جبرائیل علیہ السلام جو اس پیغام کو لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام Messenger اور Carrier ہیں۔

3۔ آپ ﷺ جو اس پیغام کو وصول کر رہے ہیں Addressee یا Receiver ہیں۔

وحی میں جو Medium استعمال ہوتا ہے، وہ فرشتہ ہے...... اُس کی رفتار روشنی کی رفتار سے کئی سو گنا زیادہ ہے۔ جب کوئی بھی Message بھیجا جاتا ہے تو اُس کی ترسیل دو طریقے سے ہوتی ہے۔ اگر پیغام وائرلیس کے ذریعے بھیجا جا رہا ہے تو وہ ایتھر کی لہروں پر سفر کرے گا (فضا میں ایک کیمیکل Substance ہوتا ہے جو ایتھر (Ether) کہلاتا ہے۔) ریڈیائی لہریں اس ایتھر پر سفر کرتی ہیں...... یہ جو ریڈیو ٹرانسمشن ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے، وہ بھی ایتھر پر سفر کرتی ہے۔ وائرلیس پر بات کرتے ہوئے آواز کی لہریں اِسی ایتھر پر سفر کرتے ہوئے دوسرے شخص کی سماعتوں تک پہنچتی ہیں۔ ٹیلی فون کے مائیکرو سسٹم میں بھی لہریں ایتھر پر سفر کرتی ہیں...... لیکن اِن کی رفتار فرشتے کی رفتار سے بہت کم ہوتی ہے۔

ترسیل کی ہر دو صورتوں میں Message (پیغام) ایک Sender کی طرف سے بھیجا جاتا ہے اور جو شخص اُس پیغام کو Receive کرتا ہے وہ Receiver کہلاتا ہے۔ اِختلاف یا فرق صرف میڈیم میں ہے کہ Message نے سفر کس چیز پر کیا، ورنہ سسٹم دونوں کا ایک ہی ہے۔

انسان کہتا تو ہے کہ میں نے فلاں فلاں چیز ایجاد کی۔ دراصل وہ ایجاد نہیں بلکہ Copy کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے رب تعالیٰ نے غور و فکر پر زور دیا۔ جب انسان غور و فکر کرتا ہے تو عقدہ کھلنے لگتا ہے...... تب انسان نت نئی چیزیں دریافت کرنے لگتا ہے اور Inventor (موجد) کہلاتا ہے۔ آج انسان ہوائی جہاز کی ایجاد پر فخر کرتا ہے حالاں کہ اِس کا بنیادی تصور پرندوں کی پرواز سے لیا گیا۔ ہوائی جہاز کا تمام سسٹم پرندوں کے Wings کے ڈیزائن پر ہے...... البتہ یہ Depend کرتا ہے کہ اگر جہاز کو Cargo plane، Passenger plane کے طور پر یا جنگی حالات کے لیے استعمال کرنا ہے تو پھر اُس کے Wings کو اُسی حساب سے Design کر لیا جاتا ہے۔ انسان غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فلاں کام اس انداز میں ہو رہا ہے۔ یوں وہ اُس انداز کو Copy کرتا ہے اور Inventor (موجد) کہلاتا ہے۔

Email کا نظام بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک کو ہم سائنسی جب کہ دوسرے (وحی) کو مذہبی

لحاظ سے بیان کرتے ہیں......دونوں کا فنکشن ایک ہی ہے لیکن Carrier مختلف ہیں۔ایک پیغام کو ایتھر جب کہ دوسرے کو فرشتہ Receiver تک پہنچاتا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ اِنسان کو کائنات پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔اس کی وضاحت فرمادیجیے۔

جواب: رب تعالیٰ کی اپنی ذات تو اِس قدر عظیم اور بڑی ہے اور اُس کا کارخانہ قدرت اتنا وسیع ہے کہ انسانی عقل کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں......لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم غور وفکر ترک کردیں۔

اِبتدا میں جب انسان غور وفکر کرتا ہے تو چونکہ اُس کی عقل پالش نہیں ہوئی ہوتی اور علم بھی زیادہ نہیں ہوتا اس لیے وہ قدرت کی بہت تھوڑی چیزوں کا مشاہدہ کرپاتا ہے......اور بہت سی چیزیں اُس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔اِس کی ایک مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ فرض کریں ایک ہال کے چھ سات دروازے ہیں۔ اگر ہم دروازہ نمبرایک کھولیں اور اُس کے ساتھ لگے سوئچ بورڈ سے ایک بلب آن کریں تو اُس بلب کے دائرۂ روشنی میں آجانے والی چیزیں تو ہماری نظر میں آجائیں گی لیکن اندھیرے میں پڑی چیزوں سے ہم انجان ہی رہیں گے۔اگر ہم دروازہ نمبر 2 کھول کر اُس کے ساتھ لگا بلب بھی آن کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو مزید کچھ اشیا کی تفصیلات سے آگاہ ہوجائیں گے لیکن پورے ہال کے بارے میں تفصیلاً کچھ بھی نہ جان سکیں گے۔ لیکن جب ہم ایک ایک کرکے ساتوں دروازے کھول لیں گے اور تمام بلب آن کرکے ہال کمرے کا مشاہدہ کرلیں گے تو وہاں موجود تمام چیزوں سے واقف ہوجائیں گے۔

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں وہ تھوڑے سے حصے کو دیکھ کر اُسے کافی نہیں سمجھ لیتے بلکہ وہ تھوڑا سا دیکھنا مہمیز کا کام کرتا ہے اور اُن کے شوق کو جلا بخشتا ہے۔جس طرح ایڑ گھوڑے کو تیز دوڑاتی ہے اُسی طرح عجائباتِ عالم کا ہلکا سا مشاہدہ انسان کے لیے گھوڑے کو ایڑ لگانے کے مترادف ثابت ہوتا ہے۔یہ نقطۂ آغاز رفتہ رفتہ اُس کے شوق کو تیز تر کرتا چلا جاتا ہے۔وہ گزرتی عمر کے ساتھ قدرت کی صناعی کا مزید مشاہدہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن یہ مشاہدہ کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتا حتیٰ کہ انسان کی عمر ختم ہوجاتی ہے اور وہ دُنیا سے چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مکمل مشاہدہ نہیں کرپایا کیونکہ انسان کی عمر تھوڑی ہے۔

اگر انسان رب تعالیٰ کی نشانیاں پہچاننے لگے تو اُسے اِدراک ہونے لگتا ہے کہ رب تعالیٰ کتنا بڑا ہے۔

زیادہ دُور نہ جایئے ،انسان کی تخلیق کو دیکھ لیجیے۔نجس پانی کے ایک قطرہ سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔پانی کے اِس ایک قطرے کا لہو میں اور لہو کا لوتھڑے میں تبدیل ہونا اور پھر اُس لوتھڑے میں خدوخال کی تشکیل۔اس سارے Process (مرحلہ) کی کوئی انسان توجیہہ بیان نہیں کرسکتا......حالانکہ یہ واقعہ ہم سب کے ساتھ پیش آیا ہے لیکن ہم اس کو Explain نہیں کرپائیں گے......جب کہ رب تعالیٰ اس کو بیان کرتا ہے۔

اگر کوئی سائنس دان انسان کی ایک آنکھ بنانا چاہے تو وہ کبھی ایسی آنکھ نہیں بناسکے گا جس طرح نیچرل آنکھ کام کرتی ہے۔یہ سب رب تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جن کا ہم کچھ زیادہ اِدراک تو نہیں کرسکیں

گے لیکن اُس کی قدرت اور اختیارات کی وسعت کا ایک ہلکا سا آئیڈیا لے سکتے ہیں کہ رب تعالیٰ کتنا عظیم ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ "چونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم، ہر وقت فعال ہے اس لیے اُس کے اِسم "یا حیّ" اور "یا ممیت" کی وجہ سے یہ کائنات ہر لمحہ فنا ہو کر از سرِ نو وجود میں آ رہی ہے...... لیکن عدم اور وجود کا یہ درمیانی وقفہ اس قدر قلیل ہے کہ اہلِ بصیرت کے سوا کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔" کیا اِس روایت میں کوئی حقیقت ہے؟

جواب: یہ روایت درست ہے اور اِس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ ہر چیز کا ایک molecular Structure ہے، ہر چیز مختلف Cells یا ذرات پر مبنی ہے۔ یہ Cells (خلیے) پیدا ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد اپنا اپنا فنکشن پورا کر کے مر جاتے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ کے بجائے اِس بات کو قرآن کی نظر سے زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے" ہر چیز کو لوٹ کر اپنے رب کی طرف جانا ہے۔" "ہر زندہ شے کو موت ضرور آئے گی۔

ہر جان دار شے اپنے وقت پر اپنا کام پورا کر کے ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ نئی چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جب سے یہ دُنیا وجود میں آئی ہے...... یہ Cycle چل رہا ہے۔ Cells بنتے اور تباہ ہوتے رہتے ہیں اور اُس کی جگہ نئے Cells آتے رہتے ہیں اور ہمیں اِس کا اِدراک تک نہیں ہو پاتا۔ یہ بڑی سادہ سی مثال ہے۔ چونکہ وہ Cells بہت چھوٹی سی چیز ہیں اس لیے ان کی زندگی بھی کم ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی بڑی جلدی مکمل کر کے فنا ہو جاتے ہیں...... اور ان کی جگہ نئے Cells آ جاتے ہیں۔

اِسی طرح انسان دُنیا میں آتا ہے اور اپنے فنکشن، جن کے لیے اُسے پیدا کیا گیا، پورے کر کے رب تعالیٰ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ درخت اور پتے بھی اِس Process سے گزرتے ہیں...... یوں زندگی اور موت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر لمحہ فنا و بقا کی یہ روایت بالکل درست ہے۔

CD کیسے سنیں

نشست نمبر		لیکچر نمبر
1	تلاشِ حق	1 (12.06.05)
2	اسرارِ روحانیت	2 (19.06.05)
3	تصورِ توحید	3 (10.07.05)
4	آپ ﷺ کے ساتھ معاملات میں رازداری اور ادب کی اہمیت	4 (31.07.05)
5	پُراسرار بندے	5 (12.08.05)
6	جذبے کی روشنی	6 (11.09.05)
7	(i) رب پر بھروسہ بڑھانے کا فارمولا	7 (18.09.05)
	(ii) رب کی دوستی پانے کا اُصول	7 (18.09.05)
8	دین و دنیا	8 (25.09.05)
9	تصوّف کا مقصد	9 (02.10.05)
10	توھمات اور ناتمام خواھشات کے جنات	10 (26.03.06)
11	اصل شُکر	11 (02.04.06)
12	کامیاب کون......!	12 (09.04.06)
13	حصولِ معرفتِ الٰہی میں قلب کا کردار	13 (16.04.06)
14	شیطان سے کیسے بچا جائے!	14 (14.05.06)
15	تعلیم سے تربیت اور مرید سے مراد تک	17 (11.06.06)
16	طرزِ فقیر	18 (18.06.06)